چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ کراچی

دسمبر 2013

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوار دو بازار کراچی: 32744391

☆ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں اور یہ کہ اللہ سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں، جلا اٹھائے گا۔ (سورۃ حج 22 آیت 7)

☆ انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے اسے اللہ نے کس چیز سے بنایا نطفے سے بنایا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا پھر اس کے لئے راستہ آسان کر دیا پھر اس کو موت دی۔ پھر قبر میں دفن کرایا پھر جب چاہے گا، اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ (سورۃ عبس 80 آیت 17 سے 22)

☆ جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے جھڑ پڑیں گے اور جب دریا بہہ کر ایک دوسرے سے مل جائیں گے اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی تب ہر شخص معلوم کر لے گا۔ کہ اس نے آگے کیا بھیجا تھا اور پیچھے کیا چھوڑا تھا۔ (سورۃ انفطار 82 آیت 1 سے 5)

☆ تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے، یہاں تک کہ اسی فکر میں تم قبر تک پہنچ جاتے ہو۔ (سورۃ تکاثر 102 آیت 1 سے 2)

☆ ہم نے شیطانوں کو انہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے، جو ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اور اللہ نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے کہہ دو کہ اللہ بے حیائی کا کام کرنے کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ بھلا تم اللہ کی نسبت ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 27 سے 28)

☆ اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو خرچ سے مدد دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے سرکشی سے منع کرتا ہے اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (سورۃ نحل 16 آیت 90)

☆ جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنو! میں بے حیائی یعنی تہمت بدکاری کی خبر پھیلے، ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (سورۃ نور 24 آیت 19)

☆ اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور اللہ سے جو تمہارا رب ہے ڈرو۔ نہ تم ہی ان کو ایام عدت میں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں تو نکال دینا چاہئے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ (سورۃ طلاق 65 آیت 1)

☆ جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہو گئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔ (سورۃ نصر 110 آیت 1 سے 3)

☆ اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے تو غیبت نہ کرو اور اللہ کا ڈر رکھو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ حجرات 49 آیت 12)

☆ اور اپنے رب کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لے تیار کی گئی ہے جو آسودگی اور تنگی میں اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 133 سے 134)

☆ اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 37)

☆ اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور رحمت پیدا کر دی ہے۔ جو لوگ غور کرتے ہیں، ان کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ روم 30 آیت 21)

☆ اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی اور بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح خوب چیز ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 58)

☆ اور بے شک (اے محمد) تم سیدھا رستہ دکھاتے ہو۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 52)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی"، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

شگفتہ حسین کراچی سے، امید کرتی ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف بخیر و عافیت ہوگا، پچھلے ماہ خط نہ بھیج پائی، کچھ مصروفیت کی بنا پر حالانکہ خط لکھ کر بھی رکھا پر Time کی کمی کی وجہ سے پوسٹ نہ کر پائی، اس ماہ کا ڈائجسٹ بہت لیٹ ملا، اس لئے بس ایک ہی کہانی پڑھی۔ جو کہ Best رہی، اور دیگر کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ سوچا کہ خط لکھ کر پوسٹ کردوں کیونکہ کہانیاں پڑھتے پڑھتے دوبارہ سے کہیں لیٹ نہ ہو جائیں۔ پچھلے ماہ کا ڈائجسٹ جیسے ہی کھولا خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اپنی غزل دیکھ کر...... غزل شائع کرنے کے لئے دل سے Thanks۔ اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں اس ماہ ضرور شائع کریں گے، مجھے بے چینی سے انتظار رہے گا نظم کا، آخر میں میری طرف سے بہت سی دعائیں ڈر ڈائجسٹ کے لئے اور تمام پڑھنے والوں کے لئے اور رائٹرز کے لئے بہت سی نیک دعائیں اللہ تعالیٰ سب پر اپنا کرم فرمائے۔ آمین۔ اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے گا۔

☆☆ شگفتہ صاحبہ: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دن دگنی رات چوگنی خوشیوں سے نوازے، یہ آپ اور تمام ڈر سے محبت کرنے والوں کا خلوص اور چاہت ہے کہ سب بخوشی ہر ماہ ڈر کی محفل میں شامل ہوتے ہیں اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔

عمرانہ زکریا گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ڈر ڈائجسٹ کے رائٹر آصفہ سراج، صبا اسلم، بلقیس خان، اسارہ نوشین، ایم اے راحت اور ایم الیاس کی فین ہوں۔ ڈر میں خط اور کہانی لکھنے کی ہمت صبا محمد اسلم اور آصفہ باجی کے خط سے کی کیونکہ ہمارے گوجرانوالہ سے یہ دونوں ہی ہیں۔ میری حوصلہ افزائی میں ان کا بھرپور ساتھ ہے۔ میں آصفہ باجی اور صباء جی کی بہت ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں صحت و ترقی عطا کرے۔ (آمین) میں اپنی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ برائے مہربانی اسے ردی میں نہ ڈالئے گا۔ میں امید کرتی ہوں کہ ضرور حوصلہ افزائی ہوگی۔

☆☆ عمرانہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی کہانی پڑھ لی ہے جو کہ اصلاح طلب زیادہ ہے، وقت ملتے ہی اصلاح کر کے شائع کردی جائے گی اور ویسے بھی ایک کہانی بھیج کر خاموش بیٹھے رہنا کیا ٹھیک ہے۔ کوشش اور کوشش سے ہی انسان کامیابی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنا خط ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔ شکریہ۔

شائستہ سحر راولپنڈی سے، السلام علیکم! امید ہے اسٹاف کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد تحریر ارسال کروں گی، مگر کچھ زیادہ مصروفیت کی وجہ سے کوئی تحریر ارسال نہ کرپائی۔ عید سے پہلے میرے ماموں کی ڈیتھ ہوگئی تھی تو بس پھر اس وجہ سے کہانی لکھنے کا وقت نہ مل سکا، بہرحال اب نئی تحریر کے ساتھ حاضر ہوں۔ مصروفیات چاہے جتنی بھی ہوں ڈر ڈائجسٹ سے جو تعلق ہے وہ انشاء اللہ قائم رہے گا جب تک زندگی ہے۔ آخر میں ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو میری تحریروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

☆☆ شائستہ صاحبہ: سب سے پہلے معذرت کہ کہانی لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہوسکی، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ماموں کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین کو صبر و جمیل، امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھولیں گی نہیں۔

ملیحہ احمد کراچی سے، ڈر کے تمام اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کو السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، میں پچھلے چھ سال سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں، اور پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں، میں ڈر ڈائجسٹ کی بہت بڑی فین ہوں، اور ڈر ڈائجسٹ کے لئے ایک کہانی بھی لکھ رہی ہوں، کہانی مکمل ہوتے ہی ارسال کردوں گی۔ اگر پسند آئے تو شائع کر کے آگے لکھنے کا موقع دیجئے گا۔ ڈر کے تمام رائٹرز ہی بہت اچھے ہیں پر پچھلے کچھ عرصے سے انور فرہاد، راحیلہ مشتاق اور ملک فہیم ارشاد غیر حاضر ہیں۔ ان کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اور کہانی ''زہریلا انسان'' بہت اچھی تھی۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ اور اس کے تمام رائٹرز، جو اس کے لئے دن رات محنت کر رہے ہیں کو دن بدن ترقی عطا فرمائے (آمین) اگر حوصلہ افزائی کی گئی تو (انشاء اللہ) ہر ماہ باقاعدگی سے ڈر ڈائجسٹ میں حاضری دیتی رہوں گی۔

☆☆ ملیحہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، خط لکھنے اور رسالے کی تعریف کے لئے شکریہ، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

عائشہ محمد عادل گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف بخیر و عافیت ہوگا ڈر ڈائجسٹ کا شدت سے انتظار تھا اور یہ انتظار کی گھڑیاں 21 اکتوبر کو اختتام پذیر ہوئیں۔ جیسے ہی ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا دل انجانی خوشی سے لبریز ہوگیا سب سے پہلے سرورق پر نظر ڈالی زیادہ ڈراؤنا نہیں لگا اس کے بعد قرآن کی باتیں پڑھیں بہت اچھی لگیں، سچی بات ہے کہ جہاں اللہ اور قرآن کا ذکر آتا ہے تو دل کو بہت سکون حاصل ہوتا ہے غزلیات میں اپنی غزل دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی، غزل شائع کرنے کے لئے میں تہہ دل سے آپ کی مشکور ہوں، تھینکس، پچھلے ڈائجسٹ میں اپنی غزل نہ پا کر جو مایوسی ہوئی وہ اس مہینے کے ڈائجسٹ میں اپنی غزل دیکھ کر دور ہوگئی۔ میری دلی دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کی راہوں پر گامزن ہو اور اس کے پرستاروں میں مسلسل اضافہ ہو۔ آمین۔

☆☆ عائشہ صاحبہ: آپ کا بہت شکریہ کہ ڈر ڈائجسٹ آپ کو اچھا لگتا ہے اور اس کی تحریریں پسند آتی ہیں، آپ کی کہانی بہت جلد اصلاح کر کے شائع کردی جائے گی۔ اگر آپ کوئی دوسری کہانی ارسال کردیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

کائنات بلوچ کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں ڈر کا پورا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا سب سے پہلے تو تمام ''دو یوز'' رائٹرز اور ڈر کے تمام اسٹاف کے لئے نیک تمنائیں، دعا گو ہوں کہ اللہ تمام مسلمانوں کو ہزاروں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے (آمین) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، کہانیوں میں فرسٹ نمبر پر سنہری تابوت تھی، سیکنڈ نمبر پر اندھیرا اجالا اور تھرڈ پر آئینے کا راز تھی اور باقی رائٹرز ساحل دعا بخاری، آصفہ سراج، صبا محمد اسلم، راشد نذیر طاہر، اے وحید، ناصر محمود فرہاد، ایس امتیاز احمد، شائستہ سحر، ایم الیاس، شعیب شیرازی، محمد عثمان علی، ساجدہ راجا، عامر ملک، شہزادہ چاند زیب، آپ کی کہانیاں بھی اپنی مثال آپ ہیں آخر میں ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ کائنات صاحبہ: خط پڑھ کر خوشی ہوئی، ڈر کا اسٹاف اور تمام قارئین کی جانب سے آپ کو بھی بہت بہت سلام اور دعائیں، امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھولیں گی نہیں۔

امین مراد نصاری کراچی سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! نومبر کا ڈر ڈائجسٹ مقامی بک اسٹال سے خریدا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ڈرتے ڈرتے خطوط کے کالم میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا خط شامل نہیں ہے۔ یہ محکمہ ڈاک والوں کی مہربانی ہے یا پھر جگہ کی کمی کی وجہ ہے۔ میں گزشتہ چند ماہ سے ڈر کا مطالعہ کر رہا ہوں اور ہر ماہ خط بھی لکھ رہا ہوں دیکھتے ہیں آپ بزم دوستاں میں کب شامل کرتے ہیں؟

☆☆ امین صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، محترم پچھلے ماہ آپ کا خط موصول نہیں ہوا اور اب آپ بزم دوستاں میں شامل ہوگئے، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار بلکہ بہت ہی انتظار رہے گا۔

قیصر جمیل پروانہ ماموں کانجن سے، ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! میرا ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ میں یہ پہلا خط ہے تقریباً 6 ماہ سے ڈر ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھ رہا ہوں اور میں دوسرے ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتا ہوں میں پہلی کہانی قاتل کی تلاش بھیج رہا ہوں، پلیز اسے شائع کر دینا اور میں ہر ماہ کہانی بھیجتا رہوں گا۔ ماہ نومبر کا ڈائجسٹ پڑھا تقریباً ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ غزلیں اور اشعار بھی اچھے تھے۔

☆☆ قیصر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی امید رکھیں اچھی ہوئی تو یقیناً شائع ہوگی، آپ برائے مہربانی اور کہانیاں بھی ارسال کردیں تاکہ ان میں سے جو اچھی ہو وہ شائع ہو جائے۔

غلام نبی نوری کھڈیاں خاص سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام قارئین، رائٹرز اسٹاف کو میری طرف سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پیار و محبت بھرا اسلام کے تحفے قبول ہوں، ڈر کا شمارہ نومبر 2013ء بہت ہی لیٹ ملا، ٹائٹل پر اداس دوشیزہ دیکھ کر دل بھر آیا۔ خیر قرآن کی باتیں انتہائی ایمان افروز تھیں۔ خطوط کی محفل میں انٹری ماری تو اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خطوط میں ثوبیہ صدف، آصفہ سراج، سنبل ماہین طہٰ، عروج ماہین، سید اسد علی بخاری، عثمان غنی، شرف الدین جیلانی کا خط اچھا لگا۔ اللہ آپ

سب کو اپنی خاص حفظ و امان میں رکھے۔ کہانیوں میں رولو کا انجانی بیسٹ رہی، سنہری تابوت اس مرتبہ کی اچھی تھی، عشق ناگن ایک منفرد کہانی ثابت ہوگی، مظلوم روحیں ایک سبق آموز کہانی تھی، خونی ناگ منی گڈ، خطرناک عفریت سحر انگیز تھی گڈ، شراب اجل کم لیول تھی پر گڈ کوشش اچھی تھی۔ مردوں کا جنگل دل میں اترنے والی تھی۔ قوس قزح میں میرا شعر لگانے کا شکریہ، اسد بخاری صاحب میری غزل کے انتخاب کا شکریہ۔ آخر میں سب کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ غلام نبی صاحب: دل کی گہرائی سے خلوص نامہ بھیجنے کا شکریہ، آپ کا خلوص ڈر ڈائجسٹ کے لئے واقعی قابل دید ہے۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی سے نوازے، تاکہ ہر ماہ آپ کا خلوص نامہ ہم پڑھتے رہیں۔

ساجد جاوید نارووال سے، السلام علیکم! امید کرتے ہیں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خدا کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوگا۔ میں سات سال بعد ڈر ڈائجسٹ میں خط لکھ رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے۔ نومبر کے شمارے کی کہانیاں اچھی تھیں۔ رائٹر حضرات پوری محنت کر رہے ہیں۔ اور ساری کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

☆☆ ساجد صاحب: ایک مرتبہ پھر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، یہ آپ کی محبت اور حسن نظر ہے کہ آپ نے ڈر ڈائجسٹ کو اچھا سمجھتے ہوئے اتنے عرصے بعد دوبارہ شکریہ کا موقع دیا۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، آداب عرض! آپ کی خیریت کا طالب ہوں، نومبر کے شمارے میں غزل کی اشاعت پر مشکور ہوں۔ اس کے علاوہ آپ نے میرے دوست کی غزل کو قابل اشاعت جان کر کرم نوازی کی ہے، امید ہے کہ تعاون کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ میں ان تمام دستوں کا شکر گزار ہوں جو میرے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان تمام دوستوں کو سلام کہہ دیں۔ دعا گو ہوں کہ آپ کا یہ جریدہ ترقی کی منزلیں اسی طرح طے کرتا رہے۔

☆☆ قدیر صاحب: اللہ تعالیٰ آپ کی صحت و تندرستی اور زور قلم اور عطا کرے تاکہ آپ ڈر ڈائجسٹ میں اپنی تحریریں ارسال کرتے رہیں۔ Thanks۔

راجہ باسط مظہر حامد جھنگی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ نومبر کا اعزازی شمارہ اچانک موصول ہوا تو دل باغ باغ ہوگیا کیونکہ ہم نے جو کہانی بنام ''پراسرار محبت'' کوئی سات، آٹھ ماہ پہلے بھیجی تھی اور ہمارے خیال کے مطابق وہ کب کی ردی کی ٹوکری کی نظر ہو چکی تھی مگر یوں اچانک آٹھ ماہ بعد ''پراسرار محبت'' کا شامل اشاعت اور پھر اچانک اعزازی شمارہ کا موصول ہونا ہمارے لئے کسی بڑی خوشی سے کم نہ تھا۔ واقعی ڈر ڈائجسٹ اپنے چاہنے والوں کا خیال رکھتا ہے ویسے ہم نے اس کہانی کے ساتھ ایک اور کہانی بنام ''پریت آتما'' بھیجی تھی کیا وہ بھی محفوظ ہے......؟ اب بات کرتے ہیں ٹائٹل کی، نومبر کے شمارے کا ٹائٹل ایک بار دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ''قرآن کی باتیں'' پڑھیں تو دل کو سکون ملا۔ خطوط سب کے اچھے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نئے لوگ بھی ڈر کی محفل میں شامل ہوئے ہیں۔ خوشی کی بات ہے۔ ایس امتیاز احمد کا خط بھی اچھا تھا اور انداز بھی۔ کہانیوں میں مردوں کا جنگل، سنہری تابوت اور عشق ناگن وغیرہ اچھی تھیں بلکہ ڈر کے عین معیار کے مطابق تھیں باقی تمام کہانیاں بھی اچھی ہی ہوں گی کیونکہ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔

☆☆ باسط صاحب: ڈر ڈائجسٹ کا یہ وطیرہ ہے کہ کسی کی کہانی بھی ردی میں نہیں ڈالی جاتی اور اگر کہانی واقعی ٹھیک نہ ہو تو پھر وہ ناقابل اشاعت ہو جاتی ہے۔ اکثر نئے رائٹر ایک کہانی بھیج کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ جو کہ دانشمندی نہیں۔ کیونکہ لکھتے لکھتے ہی آدمی لکھاری بنتا ہے۔ جس طرح ایک اسٹوڈنٹ امتحانات دیتے دیتے اپنی منزل پالیتا ہے۔ آئندہ ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

حکیم خان حکیم کال پور موسیٰ سے، ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گے عمران اسد کی غزل ارسال کر رہا ہوں، یہ فرسٹ ایئر کا طالب علم ہے اور ابھرتا ہوا ایک اچھا شاعر بھی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ میرا بھانجا بھی ہے۔ اور امید ہے آپ اس کی ضرور حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔ آپ کی حوصلہ اس کے تخیل اور جذبات کو مہمیز کا کام دے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تاحیات خوش رکھے اور آپ کے اس چراغ کو زمانے کی ہواؤں سے بچائے رکھے۔

☆☆ حکیم صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ ہر ماہ دل کی گہرائی سے لکھا ہوا خلوص نامہ ارسال کرتے ہیں، ویسے ڈر ڈائجسٹ کسی کی بھی اچھی تحریر ضائع نہیں کرتا۔ عمران اسد اگر وقت کی پابندی کرتے رہیں گے تو یقیناً ان کی تحریر بھی شامل اشاعت ضرور ہوگی۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، محترم شاہد صاحب، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ نومبر 2013ء کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے، دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ ہمارے آرٹیکلز، تجزیہ لگانے کا شکریہ، میٹر آپ کے پاس ہے، پلیز دیکھئے گا۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر ڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ودیورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: آپ کے میٹر ہمارے پاس محفوظ ہیں اور مزید کے لئے گزارش ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

محسن عزیز کنگن پور سے، السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے! نومبر کا شمارہ ڈر ڈائجسٹ ملا، ہمیں پسند آیا، آپ نے ہمارا خط شائع کیا بہت شکریہ! اردو لو کا ہمیں پسند ہے، ہم سب دوست اور گھر والے ڈر ڈائجسٹ کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں، آپ جلدی بھیج دیا کریں، ہمیں بہت دور سے آنا پڑتا ہے شہر میں، کبھی کبھی تو کوئی سواری بھی نہیں ملتی! پیدل سفر کرنا پڑتا ہے۔

☆☆ محسن عزیز: محسن صاحب: نوازش نامہ بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، آپ اپنے بک اسٹال والے سے بولیں کہ وہ جلد از جلد رسالہ منگوالیا کرے اور یہ بھی معلوم کریں کہ ڈر کس تاریخ تک آجاتا ہے۔ شکریہ۔

طاہر عباس شجاع آباد سے، السلام علیکم! میں ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہا ہوں، میری طرف سے تمام قارئین کو سلام، میں ڈر ڈائجسٹ پچھلے سات ماہ سے پڑھ رہا ہوں، جب سے ڈر پڑھ رہا ہوں مجھے سب سے زیادہ کہانی زہریلا انسان اچھی لگی ہے۔ اس کے بعد طلسم کدہ، خونی سفر، دہشت ناک اچھی ہیں۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں، میں ایک کہانی ڈریکولا کی طاقت بھیج رہا ہوں اس میں غلطیاں بھی ہوں گی انہیں ٹھیک کرنا آپ کا کام ہے، میں امید کرتا ہوں کہ آپ اسے ڈر میں ضرور جگہ دیں گے۔

☆☆ طاہر صاحب: طاہر صاحب ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ کہانیوں کی پسندیدگی اور آئندہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

شاہد اقبال گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! ماہ اکتوبر 2013ء کا شمارہ سالگرہ نمبر دیکھا دل باغ باغ ہوگیا، ماشاءاللہ کافی اچھا شمارہ تھا، ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی، یقین کریں مجھ کو بہت ہی اچھا تھا۔ کافی عرصہ پہلے میں ڈر ڈائجسٹ کا قاری تھا آج پھر میں نے ڈر ڈائجسٹ سے اپنا ناطہ جوڑا ہے اور دوستوں کی محفل میں کافی عرصہ بعد شامل ہو رہا ہوں، امید کرتا ہوں ضرور جگہ عطا فرمائیں گے۔

☆☆ شاہد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں دوبارہ خوش آمدید، جب آپ نے دوبارہ ناطہ جوڑ لیا تو اب قوی امید ہے کہ یہ ناطہ مضبوط ہوگا جس کا ثبوت ہر ماہ آپ کا نوازش نامہ ہوگا۔

علی احمد کراچی سے، ڈر ڈائجسٹ کے تمام عملے اور قارئین کو السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ یہ میرا کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے۔ میں اس ڈائجسٹ کو چھ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ مگر آج تک لکھنے کی ہمت نہ کرسکا۔ پر اب اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈر وہ پہلا ڈائجسٹ ہے جس کو میں نے اتنی پابندی اور ذوق و شوق سے پڑھا ہے۔ ورنہ ڈر سے پہلے تو میرا کسی بھی قسم کے رسالے یا ڈائجسٹ میں کوئی انٹریسٹ نہ تھا۔ پتہ نہیں ڈر میں ایسی کیا خاصیت ہے کہ میں اتنی جلدی اس کی طرف راغب ہوگیا اور پھر اس کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا۔ خیر میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے اور جلد ہی اس کا نام بھی پاکستان کے نامور رسالوں میں شامل ہو جائے (آمین) اور میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اگر ہم آپ کو کوئی خط، کہانی یا غزل وغیرہ بذریعہ ای میل بھیجیں تو کیا اسے شائع کیا جائے گا؟؟ کیونکہ کچھ ماہ پہلے میرے ایک دوست نے ڈر کے لئے کچھ غزلیں بذریعہ ای میل بھیجی تھیں اور وہ شائع نہیں ہوئیں اس کا جواب ضرور دیجئے گا۔ اور پلیز! میرا خط ضرور شائع کیجئے گا۔ تاکہ میں آئندہ بھی ڈر کے لئے لکھنے کی ہمت کرسکوں۔

☆☆ علی صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، یہ خوشی کی بات ہے اور بہت بہت شکریہ کہ ڈر ڈائجسٹ آپ کو اچھا لگا، آپ اپنی کوئی بھی تحریر بذریعہ خط ارسال کریں تو زیادہ اچھا ہے۔ نوازش نامہ کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

عامر ملک راولپنڈی سے، محترم ایڈیٹر صاحب آداب! آپ سب کی صحت اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ حاضری دے رہا ہوں۔ سب سے پہلے تو آپ اور ڈر ڈائجسٹ کی تمام ٹیم کو نیا اسلامی ہجری سال مبارک ہو۔ نومبر کا شمارہ نہایت ہی شاندار شمارہ ہے۔ تحریریں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ تمام لکھاریوں کو مبارکباد، ساحل دعا بخاری بہت اچھا لکھتی ہیں، ان کے لئے مبارکباد اور دعائیں، کہانی کی اشاعت کا شکریہ، خط کے ہمراہ دو تحریریں ارسال ہیں۔

☆☆ عامر صاحب: دونوں تحریریں موصول ہو چکی ہیں، آپ کو اور تمام قارئین کو بھی اسلامی ہجری سال مبارک ہو، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے لئے خوشی اور سکھ چین کا یہ سال بنادے۔ (آمین)

محمد وقاص فیصل آباد سے، السلام علیکم! ڈر کی پوری ٹیم کو سلام، پہلی بار ڈر ڈائجسٹ خریدا ہے، پڑھ کر بہت بڑے گناہ سے بچ گیا ہوں، ویسے تو پورا ناول اچھا ہے پر ایک کہانی نے میری زندگی سنوار دی، کہانی کا نام انجام غفلت ہے، کہانی پڑھ کر مجھے بھی معلوم ہوا ہے کہ فجر اور عشاء کی نمازوں میں، میں بھی غفلت کرتا ہوں، کہانی پڑھ کر سچے دل سے توبہ کی اور نمازوں کی پابندی خصوصاً فجر اور عشاء باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں، سوچا آپ کا شکریہ ادا کردوں، جس کی وجہ سے میں راہ راست پر آیا، زندگی میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں، امید ہے شامل کر کے حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ آئندہ بھی لکھنے کا موقع ملے۔ خدا حافظ۔

☆☆ وقاص صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ انجام غفلت پڑھ کر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، اللہ آپ کو خوشیوں سے نوازے، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور ارسال کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

احسان سحر میانوالی سے، امید کرتا ہوں ڈر کا تمام اسٹاف اور پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے...... بہت زیادہ مصروفیات بھی انسان کو ہر چیز سے دور کر دیتی ہیں...... اب ہم اپنی مثال دیں تو پچھلے ہفتے پیپروں سے فارغ ہوئے...... اس سے آگے چلیں تو پچھلے ماہ ہمیں حادثہ پیش آ گیا تھا...... ہوا کچھ یوں کہ کالج سے واپس آتے ہوئے بائیک سے پی اے ایف روڈ پر بائیک سلپ ہونے پر گر پڑے جس سے ہاتھ بہت زیادہ متاثر ہوا کہنیاں اور کندھے پر بہت زیادہ چوٹیں آئیں...... آنکھ کے اوپر کا حصہ کافی متاثر ہوا...... جس کو دو ٹانکے نصیب ہوئے...... اب ہم فریش ہیں...... واپس بھی آ گئے ہیں...... کیونکہ زندگی تو چلتی ہی رہتی ہے...... اور ہم بھی چلتے ہی رہیں گے...... زندگی ہمیں دوڑاتی ہے...... اور ہم دوڑتے ہیں۔ خیر اسی کا زندگی نام زندگی ہے...... سب سے آخر میں یہی دعا کروں گا کہ تمام اسٹوڈنٹ کو ہر امتحان میں کامیابی عطا فرما...... نا صرف اسٹوڈنٹس کو بلکہ ہر مسلمان اور پاکستان کی مشکلات آسان کردے اے اللہ...... آمین......

☆☆ احسان صاحب: ایکسیڈنٹ کا سن کر افسوس ہوا، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور تمام مصائب سے دور، آئندہ ذرا خیال رکھئے گا تاکہ غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اللہ حافظ۔

سید محمود حسن حیدرآباد سے، السلام علیکم! امید ہے اللہ کے فضل وکرم سے آپ اور ڈر ڈائجسٹ کی تمام ٹیم خیریت سے ہوں گے۔ ماہ اگست کا ڈر ڈائجسٹ بہترین کہانیوں پر مشتمل تھا۔ ''نصیب کا لکھا'' اور ''خواب ناک'' مختلف طرح کی تحریریں تھیں جو کہ آج کے اس پرآشوب معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''رولوکا'' اور ''سنہری تابوت'' اس مرتبہ نئے رنگ میں نظر آئیں اور ہمیشہ کی طرح دلچسپی کا تاثر برقرار رکھا۔ میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میں اپنی لکھی ہوئی کہانیاں Email کرسکتا ہوں۔ یا صرف ڈاک کے ذریعے ہی قابل قبول ہوں گی۔ اس مرتبہ میں ایک کہانی ''خونی مسیحا'' ارسال کر رہا ہوں جو کہ یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔ میری نیک تمنائیں آپ اور آپ کی تمام ٹیم کے ساتھ ہیں۔ شکریہ۔

☆☆ محمود صاحب: برائے مہربانی اپنی کہانی بذریعہ ڈاک ارسال کیا کریں تو زیادہ اچھا ہے۔ امید ہے آپ آئندہ ماہ ضرور خلوص نامہ ارسال کریں گے۔ ویسے بھی نومبر کے شمارہ میں آپ کی کہانی بنام ''پراسرار موت'' شائع ہو چکی ہے۔

☆☆☆

نوٹ: قارئین کرام گزارش ہے کہ اپنی تحریر پر واضح اور صاف الفاظ میں Cell No اور مکمل ایڈریس ضرور لکھیں تاکہ بوقت ضرورت آپ سے رابطہ کیا جا سکے۔ شکریہ۔

سل خوردہ

محمد عثمان علی۔میاں چنوں

اچانک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور زمین کا ہلکا سا جھٹکا لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں چوہے باہر کو نکل کر نوجوان کے جسم پر چڑھ دوڑے اور لمحوں میں نوجوان کا جسم......

ایک خوفناک دہشت ناک وحشت ناک اور دل ودماغ پر لرزہ طاری کرتی ڈراونی کہانی

ولسن، لفٹ کے قریب بینچ پر بیٹھا ہوا سگریٹ پینے میں مصروف تھا، رسانیت زدہ خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اس کے ناک اور منہ سے نکلنے والے دھویں کے مرغولے ہوا میں تحلیل ہورہے تھے۔

اچانک اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ اس ٹیکسٹائل مل کا فورمین جس کا نام واروک تھا، اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اچانک ہی اس طرف آدھمکا تھا۔ واروک کو دیکھ کر ولسن کے چہرے پر شدید ناگواریت کے تاثرات ابھر آئے۔ نفرت کا تناؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔

"یہ کم بخت اس طرف کیسے آگیا......؟ باسٹرڈ......" ولسن نے صرف دل ہی دل میں کہا اور سوچا۔ "اس فورمین واروک کو رات کے اس وقت یہاں آٹپکنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ اس وقت تو اسے تہہ خانے میں اپنے کمرے میں ہونا چاہئے تھا......"

شہر گیٹس فال میں ان دنوں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ یہ جون کا مہینہ تھا اور گیٹس فال میں ایسی ریکارڈ توڑ گرمی پڑ رہی تھی کہ الامان والحفیظ...... صبح تین بجے بھی پارہ 94 ڈگری سینٹی گریڈ پر ہوتا تھا۔ ہال اکثر سوچا کرتا تھا کہ دن میں تین سے گیارہ بجے کی شفٹ کے دوران گرمی کا کیا حال ہوتا ہوگا......؟ اس کی ڈیوٹی چونکہ اس ٹیکسٹائل مل کے اندر تھی۔ اس لئے وہ کبھی...... اور زیادہ مل سے باہر نہیں نکل پاتا تھا۔ وہ اس ٹیکسٹائل مل میں پکر مشین پر کام کرتا تھا۔ وہ ابھی تین ماہ قبل ہی یہاں جوائن ہوا تھا، کام کرتے کرتے...... اب جاکر اسے 50 ڈالر، 86 سینٹ فی گھنٹہ کے حساب سے اجرت ملنے لگی تھی، یہ اجرت اس کے لئے کافی تھی...... آگے پیچھے کوئی نہ تھا اور کسی لڑکی سے بھی دوستی نہ تھی۔ اس لئے بس گزر بسر ہوجاتی تھی اور ٹھیک ٹھاک......

ولسن سیلانی شخص تھا۔ ایک جگہ تو کبھی وہ ٹک کر رہتا ہی نہ تھا۔ برکلے میں کالج چھوڑنے کے بعد تین سال کے عرصے میں وہ مختلف شہروں میں...... مختلف جگہوں پر...... مختلف کام کرچکا تھا اور اب وہ یہاں گیٹس فال میں اس ٹیکسٹائل مل میں آن پہنچا تھا۔ اب وہ برف باری کا موسم گزارنے کے بعد ہی کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تنہائی پسند اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی ہال کو اپنی اسی افتاد طبع کی بنا پر رات کو گیارہ سے صبح سات بجے والی شفٹ (ڈیوٹی) پسند تھی۔ اس شفٹ میں کام کرتے ہوئے اسے کسی سے کوئی بھی شکایت نہ

تھی۔ ماسوائے چوہوں کے......!!

وہ تیسری منزل پر کام کرتا تھا۔ تیسری منزل بالکل ویران تھی اور اجاڑ تھی۔ فلورسینٹ کی بیمار بیمار...... مدہم روشنی ہر طرف، ہر سوں پھیلی رہتی۔ مل کی دوسری منزلوں کے مقابلے میں یہاں خاموشی کا سکوت زیادہ تھا۔ کام کرنے والے یہاں لوگ بھی کم تھے، مگر چوہے......؟؟ کافی تعداد میں تھے۔ انہوں نے ہال کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہال یہاں پکر مشین سے مصنوعی دھاگے کے نوے پاؤنڈ وزنی تھیلے اٹھا کر ایک قطار میں رکھنے پر مامور تھا اور تھیلوں کے یہ ڈھیر چوہوں کے لئے نہایت محفوظ پناہ گاہ تھے اور یہ چوہے بھی عام...... معمولی نوعیت کے نہیں تھے۔ یہ موٹے موٹے پیٹ والے چوہے تھے۔ ان کے جسموں میں بے اندازہ جوئیں اور کیڑے مکوڑے چمٹے رہتے اور جن کی سرخ سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح خوفناک حد تک چمکتی دہکتی رہتی۔ سگریٹ نوشی کے علاوہ ہال کا ایک اور شوق بھی تھا۔ وہ وقفے کے دوران میں سوڈے اور کوک کے ڈبے لے کر آتا، انہیں وہ ان سوراخوں میں ٹھونس دیتا جہاں سے چوہے باہر آیا کرتے تھے اور بعد میں وہ ان کو نکال لیا کرتا تھا۔ مگر آج یہ کم بخت فورمین واروک چپکے سے ادھر آ گیا تھا۔ اگر وہ لفٹ کے ذریعے آتا تو ولسن ہوشیار رہتا۔ لیکن وہ تو سیڑھیوں سے آیا تھا۔ بالکل جیسے چوروں کی مانند۔

وہ ولسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا کر رہے ہو ولسن......؟“

”یہ چوہے! کم بختوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے......“ ولسن نے یہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

تمام چوہے اس وقت اپنے بلوں میں دبک گئے تھے۔

ولسن مزید بولا۔ ”میں ان کے بلوں میں یہ ڈبے ڈھونس دیتا ہوں......“

واروک نے زور زور سے سر ہلایا۔ اور پھر بولا۔ ”ہوں...... مگر میرا خیال ہے کہ کمپنی تمہیں اس کام کے عوض تو اجرت نہیں دیتی......“

”ہاں۔ واقعی۔ مگر ہیری نے گزشتہ بیس منٹ سے کوئی آرڈر ہی نہیں بھیجا......“ ہال نے کہا۔

”OK میں اوپر جا کر اس کو بھی دیکھتا ہوں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت کوئی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھ رہا ہوگا......“

ہال نے کوئی جواب نہ دیا تو واروک ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ دیکھو...... وہ رہا تمہارا دوست۔ شاید آج اسے نیند نہیں آ رہی......“

ہال نے گردن گھما کر اس جانب دیکھا۔ ایک کافی موٹا سا چوہا ایک تھیلے پر بیٹھا ہوا بڑی برق پاش نظروں سے ہال کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ ان دونوں کی باتیں بغور سن رہا ہو۔ ہال کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ چیں چیں کرنے لگا۔ جیسے وہ اسے منہ چڑا رہا ہو۔ ہال نے سوڈے کا ڈبہ جو کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا، گھما کر بڑے زور سے اس کی طرف پھینکا۔ چوہا چیخ مارتے ہوئے پھدکا اور اس کے نشانے سے صاف بچتا ہوا بھاگ نکلا۔

اس پچویشن پر واروک نے قہقہہ لگایا۔ جبکہ ہال بڑبڑاتا ہوا ڈبہ اٹھانے کے لئے اس طرف بڑھ گیا۔

”ویسے بائے داوے میں تمہارے پاس ایک اور کام سے بھی آیا تھا......“ واروک نے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بولو...... کون سا کام ہے......؟“ ہال نے ڈبہ اٹھانے کے بعد اس کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

واروک بولا۔ نیکسٹ پیچر ڈے 4 جولائی سے یہ مل ایک ہفتے کے لئے بند رہے گی۔ جو لوگ مل میں ایک سال سے زائد عرصے سے ملازم ہیں۔ انہیں ان چھٹیوں کی بھی تنخواہ ملے گی، But جن کی ملازمت ایک برس سے کم ہے...... انہیں اجرت نہیں ملے گی......“

”ہال اس کی طرف سپاٹ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”اب تم بتاؤ ان چھٹیوں میں تم کام کرنا چاہتے ہو......؟“ واروک نے ہال سے پوچھا۔

”کام کیا ہے......؟“

”ہم تہہ خانے کی صفائی کریں گے۔ 13 برس سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں لی گئی...... کباڑ خانہ بن گیا ہے۔ ہم موٹے پائپ سے پانی کی بوچھاڑیں مار مار کر اس کو دھوئیں گے۔ صاف کریں گے......“

”اوہ۔ تو کیا بلدیہ کی صحت کمیٹی مل کر انتظامیہ کی خبر لینے پر تل ہی گئی ہے......!! خوب......“

فورمین واروک نے تنبیہی انداز میں ہال کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”مجھے اوٹلی یہ جواب دو کہ تم کام کرنا چاہتے ہو یا نہیں......!! پہلے دو گھنٹے کا معاوضہ دوگنا ہوگا اور اس کے بعد ہر گھنٹے کام کی اجرت چار گنا ہوگی۔ کام رات کو گیارہ سے صبح سات بجے تک ہوگا......“

ہال چند لمحوں کے لئے خاموش رہا۔ وہ ذہن ہی ذہن میں حساب لگا رہا تھا کہ ایک ہفتے میں وہ کتنی رقم کما سکے گے......؟ پھر وہ بولا۔ ”میں تیار ہوں......“

”نیکسٹ منڈے کو نیچے ڈائی ہاؤس میں رپورٹ کرنا......“ واروک یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چل کر وہ رکا۔ پلٹا۔ ”تم کالج میں بھی تو پڑھتے ہو نا......؟“

”ہال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں......“

”OK کالج بوائے۔ میں یہ بات ذہن میں رکھوں گا......“ واروک یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ہال پھر بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوڈے کا ڈبہ تھا۔ اور اس کی نظریں تھیلوں پر بیٹھے ہوئے چوہوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا ذہن تہ خانے کی تاریکیوں کے خیالوں میں بھٹک رہا تھا کہ وہاں کیا حالت ہوگی؟ ہر طرف نمی اور سیلن ہوگی...... مکڑیوں کے جالے ہوں گے...... گلے سڑے کپڑے ہوں گے...... چوہے ہوں گے...... نجانے کیسے ہوں گے...... اور شاید چمگادڑیں بھی ہوں گی......

بالائی منزل سے واروک اور ہیری اور وسکو کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند منٹ بعد وسکو نے اوپر سے نائلون کے تھیلے پھینکنے شروع کر دیئے۔ ہال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا...... اب بہت سے چوہے تھیلوں پر بیٹھے ہوئے اس کی کارکردگی کا جائزہ لے رہے تھے۔

☆......☆......☆

منڈے...... صبح 11 بجے۔

جس وقت واروک وہاں پہنچا تقریباً 36 افراد وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ واروک نے پرانی جینز پہن رکھی تھی جس کے پائنچے ربڑ کے بنے مضبوط جوتوں میں اڑے ہوئے تھے۔ ہال اس وقت وسکو کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ موٹی ست اور مایوسی بھری باتیں کر رہا تھا۔ فورمین واروک کو آتا دیکھ وہ خاموش ہو گیا۔

واروک نے ان سب کو طائرانہ نظروں سے دیکھا اور پھر بولا۔ ”کیوں؟ کیا باتیں ہو رہی ہے......؟“

”کچھ نہیں......“

”تہہ خانے کی حالت بہت خراب ہے، ہم کام ختم کر کے جب باہر آئیں گے تو سبھی بھوت بن چکے ہوں گے......“

”ہاں......“ فورمین واروک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”Howere“ ہم نے تہہ خانے میں ساٹھ ہائی پاور کے بلب لگا دیئے ہیں۔ ان سے کافی روشنی ہو جائے گی اور تم لوگوں کو اپنا کام کرنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہوگی......“ پھر واروک نے ایک طرف کھڑے آدمیوں کے گروپ کو مخاطب کیا۔ ”اور تم لوگ موٹے پائپ کو پانی کی مین پائپ لائن سے منسلک کر دو گے۔ پھر یہ پائپ سیڑھیوں سے لے کر نیچے جاؤ گے۔ ہر شخص کے پاس 80 گز لمبا پائپ ہوگا اور ہاں دیکھو۔ وہاں آپس میں کوئی مسخری...... مذاق مت کرنا۔ اگر تم میں سے کسی نے اپنے کسی ساتھی پر پانی کی بوچھاڑ ماری تو وہ اسپتال پہنچ جائے گا۔“ انڈر اسٹینڈ......“

”ٹھیک ہے جناب......“

”تم دیکھ لینا ہال...... کوئی نہ کوئی زخمی ضرور ہوگا......“ واسکو نے ہال کے کان میں سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

”اور تم لوگ......“ فورمین واروک دس مرتبہ ان

لوگوں سے مخاطب ہوا جو ہال اور واسکو کے ساتھ کھڑے تھے۔ ’’آج رات تم سامان سمیٹنے کا کام کرو گے۔ تم لوگ دو دو کے گروپ میں بجلی کے ٹھیلوں میں کام کرو گے۔ نیچے بہت کاٹھ کباڑ ہے۔ اسے سمیٹ کر مغربی کنارے پر ایئر شافٹ کے پاس ڈھیر کرو گے۔ تم میں سے کوئی ایسا ہے جو بجلی کے یہ ٹھیلے چلانا نہیں جانتا......؟‘‘

کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ سب ہی ان برقی ٹھیلوں کو چلانا جانتے ہیں۔

’’OK ہم تہہ خانے کی صفائی مختلف حصوں میں کریں گے۔ مختلف ٹائم میں مختلف حصے صاف کرتا ہوں گے۔ تھرسڈے کو صفائی مکمل ہو جاتی ہے۔ فرائی ڈے کو ہم تمام سامان یہاں سے منتقل کر دیں گے۔ کسی کو کوئی بات پوچھنا ہے......؟‘‘

سب لوگ خاموش کھڑے رہے۔ ہال نے فورمین واروک کے چہرے کا غور سے جائزہ لیا۔ یہ شخص اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اور اس کے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال نے جنم لیا۔ فورمین واروک کے حوالے سے یہ خیال بہت خوش تھا۔

’’گڈ۔ ٹھیک ہے، تو پھر آؤ۔ کام شروع کریں......؟‘‘ فورمین واروک نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ٹیوزڈے نائٹ...... 2 A.M

ہال، وسکو کی مستقل بڑبڑاہٹ سے تنگ آ گیا تھا۔ ہر وقت چک چک...... بک بک...... کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ اس کم بخت کی اچھی طرح پٹائی کر ڈالے۔ But وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وسکو پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ ویسے حقیقت یہ بھی تھی کہ ہال بذات خود بھی اس کام سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ تہہ خانے کی صفائی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر اسے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ کام اتنا بے ہودہ بھی ہو سکتا ہے۔ تہہ خانے میں ایسی بدبو تھی کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر طرف سیلن تھی اور اس کے ساتھ پرانے کپڑوں، پرانے کاغذات اور گلی سڑی ہوئی لکڑیوں کی کریہہ سڑاند...... ماحول میں ناگوار حبس، گھٹن پیدا کر رہی تھی۔ چھت اور دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے ادھڑ رہا تھا۔ جس کونے سے ہال اور وسکو نے کام شروع کیا تھا۔ وہاں ہر طرف دیواروں اور چھت پر سانپ نما چھتریوں کا جھنڈ اتھا۔ وہاں سے ایک پرانی ٹیبل کھینچتے ہوئے ہال کا ہاتھ ان میں سے ایک چھتری پر جا پڑا تھا۔ اسے سانپ کی یہ چھتری گرم گرم سی محسوس ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس نے کسی بروص شخص کے برص زدہ جسم کو ہاتھ لگا دیا ہو۔

تہہ خانے میں 13 سال سے جو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بلبوں کی روشنی پر حاوی محسوس ہوتی تھی۔ بجلی کے بلبوں سے نکلتی ہوئی روشنی بھی اس تاریک ماحول میں بیمار، نحیف اور زرد معلوم ہو رہی تھی۔ دیواروں اور چھتوں پر جگہ جگہ کائی جم سی گئی تھی۔ پھر یہاں چوہے بھی تھے۔ یہ چوہے اتنے بڑے تھے کہ تیسری منزل کے چوہے ان کے مقابلے میں بونے معلوم ہوتے تھے۔ خدا کو ہی معلوم تھا کہ یہ چوہے یہاں تہہ خانے میں کس چیز پر گزارہ کرتے تھے۔ اس تازہ افتاد کے بعد ان میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ اور وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور تاریکی میں رہنے کی وجہ سے وہ نیم اندھے تھے۔

کچھ ریسٹ کر لو یار۔ سگریٹ کا کش لگانے دو......‘‘ وسکو نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان ہال سے کہا۔ وہ اس وقت تہہ خانے کے ایسے حصے میں تھے۔ جہاں انہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔

’’OK‘‘ ہال نے خودکار ٹھیلے سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگائی۔

’’کاش میں نے واروک سے اس کام کی ہامی نہ بھری ہوتی۔‘‘...... وسکو نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ’’یہ کام مردوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ کچھ ریسٹ وغیرہ ہونی چاہئے۔ اس کم بخت واروک نے مجھے آرام کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا......‘‘

’’ہال جواباً کچھ نہ بولا۔ وہ تو واروک اور چوہوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہال کے خیال کے مطابق واروک اور چوہوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ تہہ خانے میں رہنے والے چوہوں کو بھی کافی عرصے سے اس تاریکی میں رہنے کی وجہ سے انسان سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ اسی طرح واروک کو بھی انسانوں کے جذبات و احساسات کا کوئی خیال نہ تھا۔

ایک بڑا سا چوہا اپنی پچھلی ٹانگوں پر گلہری کی مانند بیٹھا ہوا اپنی موٹی موٹی اور سرخ کریہہ آنکھوں سے ان کو گھور رہا تھا۔ ہال قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ بڑی دیدہ دلیری سے ہال کے سامنے سینہ ٹھونک کر کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ اب اتنا رہ گیا تھا کہ ہال وہیں سے اسے ایک زور دار ٹھوکر لگانے کا ارادہ کر رہا تھا...... اچانک اس چوہے نے اچھل کر الٹا ہال پر حملہ کر دیا اور اس کے چمڑے کے جوتے پر دانت جما دیئے۔ ہال نے پوری قوت سے اپنا پیر گھما دیا تو چوہا اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے فرش پر گھسٹتے ہوئے دور جا گرا...... ’’چیں چیں......‘‘ کرتی آوازیں کمرے میں گونج اٹھی تھیں۔

’’نجانے کم بخت یہ چوہا اپنے ساتھ کون سی...... ؟ اور کیا کیا بیماریاں لئے ہوئے ہوگا......‘‘ ہال بڑبڑایا۔ ’’اور فورمین واروک بھی تو انسان نما ایک چوہا ہے......‘‘

’’مانتا ہوں کہ مجھے رقم کی ضرورت ہے But لعنت ہے ایسی رقم پر...... اجرت پر...... جس کے لئے ایسا گھٹیا کام کرنا پڑے......‘‘ وسکو نے ترساں و ہراساں لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ ’’لگتا ہے جیسے یہ کم بخت چوہے کچھ سوچ رہے ہوں......؟ ذرا غور کرو...... اگر ہم چھوٹے ہوتے۔ بونے ہوتے اور یہ بڑے بڑے...... تو کیا ہوتا......؟ کیسے پلے ہوئے ہیں؟ اتنے صحت مند؟ کم بخت نجانے کون سی خوراک پر گزارا کر رہے ہیں......؟‘‘

’’اپنی بکواس بند کرو تم......‘‘ ہال نے قدرے خشونت بھرے لہجے میں وسکو سے کہا۔ ’’یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... کم آن (Come on)‘‘

☆......☆......☆

ٹیوزڈے...... 4 بجے صبح کے وقت۔

کھانے پینے کا وقفہ تھا۔ ہال اور وسکو تین چار دوسرے افراد کے ساتھ بیٹھے سینڈوچز کھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سیاہ ہو چکے تھے۔ ایسی کالونچ تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود صاف نہیں ہو سکی تھی۔ ہال سینڈوچ کھانے میں منہمک تھا۔ لیکن اس کی نظریں فورمین واروک کے شیشے کے دفتر پر جمی ہوئی تھیں۔ واروک گرم گرم کافی پی رہا تھا۔ اور برگر کھانے میں مصروف تھا۔

’’رے تو گھر چلا گیا ہے......‘‘ ان میں سے ایک آدمی نے بولتے ہوئے کہا جس کا نام چارلی تھا۔

’’تے آ گئی تھی کیا اسے......؟ خود میری طبیعت بھی متلا رہی ہے۔ مکدری ہو رہی ہے......‘‘ کسی نے فوراً تبصرہ کیا۔

جواباً بولا گیا۔ ’’نہیں بلکہ اسے ایک کافی موٹے اور خوفناک چوہے نے کاٹ لیا تھا۔ وہ زخمی ہو گیا تھا......‘‘

’’اوہ، کیا واقعی......؟‘‘ ہال نے چونک کر کہا۔

’’ہاں...... چارلی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں اسی کے ساتھ کام کر رہا تھا اور پھر......‘‘

’’اور پھر......؟‘‘

’’فارگاڈ سیک...... ایسا منظر میں نے پہلے کبھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ وہ چوہا پرانے کپڑوں کے ایک بوسیدہ تھیلے میں سے کود کر باہر نکلا تھا۔ وہ چوہا لگ بھگ کسی بلی جتنا بڑا تھا۔ میری آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر ششدر رہ گیا۔ وہ چوہا لمبی زقند بھرتے ہوئے رے کے ہاتھ پر آن بیٹھا اور ساتھ ہی اس کی کلائی کو چباڈالا۔ کترنے لگا......‘‘

’’ارے باپ رے...... ایسا ہوا تھا کیا......؟ کسی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

’’ہاں۔ اور پھر رے بالکل عورتوں کی طرح چیخیں مارنے لگا۔ اچھلنے لگا...... مگر اس میں اس بیچارے کا کیا قصور تھا۔ اس کی کلائی ادھڑ چکی تھی۔ درد کی شدت اس سے برداشت نہ ہو سکی تھی۔ اور اس کی زخمی کلائی سے

خون تیز رفتاری سے بہنے لگا تھا۔ مجھے اور نہ سوجا تو میں نے ایک طرف پڑا ہوا بورڈ اٹھالیا اور اس بورڈ سے مسلسل چار پانچ بار زور زور سے اس چوہے کو مارا پیٹا۔ تب جا کر اس کم بخت باسٹرڈ نے رے کی کلائی چھوڑی۔ بورڈ کی ضربیں لگنے سے وہ تقریباً ادھ موا ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر گرا تو رے ایک لمحے کے لئے پاگل ہی ہو گیا۔ اس نے چوہے کو پیروں تلے کچل کچل کر مار دیا۔ ختم کر دیا۔ اس کا کچومر نکال دیا...... میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا انوکھا منظر دیکھا ہے۔ اس کے واروک نے رے کی مرہم پٹی کروائی اور اسے گھر بھیج دیا۔ واروک نے اس سے کہا کہ دن نکلتے ہی وہ ڈاکٹر سے معائنہ کرا لے......"

"واقعی وہ حرامی چوہا بلی کے برابر تھا......؟"
کسی نے استفسار کیا۔ شاید اسے ابھی تک چارلی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی بات مزید ہوتی۔ دفتر کا دروازہ کھلا اور فورمین واروک باہر نکلا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "چلو بھئی...... اٹھو...... کام کا وقت شروع ہو گیا......"

سب خاموشی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید واروک نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ سب اپنے اپنے مقامات کی طرف چل دیئے...... واروک چلتا ہوا ہال کے قریب آ گیا۔

"اور سناؤ کالج بوائے......؟؟ کام کیسا چل رہا ہے......؟" اس نے ہال کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ہال خاموش رہا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ واروک بھی اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

"وسکو...... آؤ چلیں......" ہال نے اپنے ساتھ کھڑے وسکو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"چلو......" وسکو نے پھیکے لہجے میں کہا اور پھر وہ دونوں تہہ خانے کی طرف بڑھتے چلے گئے......

☆......☆......☆

ویڈنسڈے...... رات کو ایک بجے۔

آج ان کی باری پانی کی بوچھاڑ سے صفائی کرنے کی تھی۔ یہ کام وہ اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک کہ کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے والی پارٹی اپنا کام ختم نہیں کر لیتی۔ موقع غنیمت تھا۔ اس لئے انہوں نے سگریٹ کے دو چار کش لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ کام کی رفتار تسلی بخش نہ تھی اور اس وجہ سے واروک بہت چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس نے انتظامیہ سے یہ کام ایک ہفتے کے اندر ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس رفتار سے یہ کام مقررہ وقت ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت وہ انیسویں صدی کے اس دفتری سامان کے کباڑ کو صاف کرنے میں مصروف تھے جو ایک کونے میں ڈھیر تھا۔ یہ کباڑ چوہوں کی ایک بہت بڑی بستی بن چکا تھا۔

جس وقت اس کباڑ کو جنبش دی گئی تو بے شمار چوہے پریشان ہو کر وہاں سے نکلے اور ادھر ادھر بکھرتے ہوئے بھاگ گئے۔ جوں جوں ڈھیر کو ہٹایا جاتا یہ چوہے کم ہوتے ہوئے کباڑ میں بیٹھتے جاتے، اس کارروائی کے دوران میں دو مزدوروں کو چوہوں نے کاٹ لیا۔ باقی مزدوروں نے اس وقت تک کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک واروک نے دو افراد کو اوپر بھاری قسم کے ربڑ کے دستانے لانے کے لئے نہیں بھیج دیا۔ یہ دستانے وہ محنت کش استعمال کرتے تھے جو کپڑا رنگنے کا کام کرتے تھے اور جنہیں تیزاب کے آمیزوں سے کام کرنا ہوتا تھا۔

ہال اور وسکو ہاتھوں میں اپنے اپنے پائپ پکڑے کام شروع کرنے کے منتظر تھے کہ ایک مزدور مائیکل نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ اپنا سینہ بھی دستانے سے ڈھکے ہوئے ہاتھ سے پیٹ رہا تھا۔ ایک بہت بڑا اور موٹا چوہا اس کی شرٹ کو دانتوں سے پکڑے ہوئے لٹک رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مائیکل کے پیٹ کو اپنی ٹانگوں سے نوچ رہا تھا۔ اس کے منہ سے نہایت کریہہ آوازیں...... چیخیں نکل رہی تھیں۔ آخر مائیکل نے اس چوہے کو جھٹک ہی دیا۔ لیکن اس وقت تک اس کی قمیض میں سوراخ ہو چکا تھا۔ اور خون کی ایک باریک سی لکیر اس کے جسم سے بہہ رہی تھی۔ خون دیکھ کر غصے کی جگہ اک خوف نے لے لی۔ ڈر کی پرچھائیاں سی اٹھ آئیں۔ اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

ہال نے پانی کی بوچھاڑ حملہ آور چوہے پر ماری...... چوہا بوڑھا تھا اور آہستہ آہستہ کسی کمین گاہ کی تلاش میں ایک طرف بڑھ رہا تھا۔ مائیکل کی شرٹ کی ایک دھجی اب بھی اس کے دانتوں میں دبی ہوئی تھی۔ پانی کی تیز رفتار طوفانی دھار چوہے سے ٹکرائی تو وہ کسی کاغذ کی طرح لڑھکتا، گھسٹتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور وہیں بے جان ہو گیا۔ اس جگہ خون کا سرخ سرخ رنگ بکھرتا اور پانی میں بہتا چلا گیا......

شور سن کر واروک ادھر آ گیا...... اس کے چہرے پر عجیب سی...... مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، وہ تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ہال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "گڈ...... کالج بوائے تم نے آخر اس ایک مردود کو مار ڈالا......"

وسکو جلدی سے بولا۔ "یہ چوہا ہے......؟ یا کوئی بلا......؟ حرام خور ایک فٹ لمبا ہے...... اور موٹا بھی......"

واروک نے وسکو کی طرف دیکھا۔ "ہوں۔ واقعی...... کسی بلا سے کم نہیں......" پھر وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "OK ہال اب تم پانی کی بوچھاڑ اس ڈھیر پر مارو......"

"ایک بوچھاڑ کیوں نہ تم پر مار دوں......؟ اگلے لمحے تم بھی اس چوہے کی طرح فرش پر مردہ پڑے نظر آ رہے ہو گے......" ہال نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے صرف دل ہی دل میں کہا اور پھر وہ پانی کی بوچھاڑ ڈھیر پر مارنے لگا......

واروک بقیہ لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "اور تم لوگ یہاں سے ہٹ جاؤ۔"

"اوہ اچھا...... بہت بہت مہربانی جناب......" کسی نے جواباً کہا۔ مگر لہجے میں گہرا طنز شامل تھا۔ جو عیاں تھا۔

اسی وقت مائیکل چیختا ہوا واروک کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر غصے سے آڑھی ترچھی لکیریں بن گئی تھیں۔ جن کی بالائی سطح شدت کی سرخ تھی۔ واروک ایک لمحے کے لئے ڈر سا گیا بلکہ وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے جا لگا۔ مائیکل بولا۔ "میں...... میں اس کا معاوضہ طلب کروں گا...... ہرجانہ دینا پڑے گا تم لوگوں کو......"

"ہاں آں...... ضرور ضرور......" واروک کا سر مثبت انداز میں تیزی کے ساتھ ہلا اور پھر وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

ہال پانی کی بوچھاڑ کباڑ پر مار رہا تھا۔ پانی اتنی قوت اور تیزی سے نکل رہا تھا کہ پرانا فرسودہ فرنیچر اس بوچھاڑ سے ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑوں میں تقسیم ہونے لگا۔ ساتھ ہی کئی چوہے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر بھاگے...... یہ چوہے اتنے بڑے تھے کہ ہال نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر مزدوروں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ چوہے اس افتاد سے اپنی جگہ گڑبڑائے ہوئے تھے۔ ہال اپنے کام میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ اب اس ڈھیر میں کوئی چوہا باقی نہیں رہا۔ اس نے پائپ بند کر دیا۔

اسی وقت واروک کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ "OK اب اس کباڑ کو یہاں سے اٹھاؤ......"

"میں نے اس کام کے لئے اپنی خدمات نہیں پیش کی تھیں......" ایک نوجوان آدمی نے باغیانہ انداز میں کہا۔ جس کا نام اپی تھا۔

"اپی کیا یہ بات تم کہہ رہے ہو......؟" واروک نے کہا۔

اپی آگے بڑھ آیا اور بولا۔ "ہاں...... ہاں...... میں کہہ رہا ہوں۔ میں ان چوہوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں نے صفائی کا کام کرنے کی ہامی بھری تھی...... یہ نہیں کہا تھا کہ میں ٹائیفائیڈ اور دیگر بیماریاں بھی مول لینے کے لئے تیار ہوں۔ بہتر ہے تم مجھے چھٹی دے دو......"

دیگر تمام لوگوں نے بھی اپی کی اس بات پر رضامندی ظاہر کی۔ وسکو نے ہال کو دیکھا مگر وہ بڑی محبت سے پائپ نلکی کو دیکھ رہا تھا۔ جس سے نکلنے والی

پانی کی دھار بیس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے شخص کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی اور جس کے زور سے آدمی اچھل کر دس فٹ پیچھے گر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے اپی...... تم اور تمہارے ساتھ جو شخص بھی جانا چاہے...... جاسکتا ہے But یاد رکھو اس کے بعد تمہیں کبھی اس مل میں دوبارہ قدم رکھنے کی اجازت نہیں ملے گی......"

"دماغ تو خراب نہیں ہوگیا......؟" ہال جبڑے بھینچتے ہوئے بڑبڑایا۔

"تم نے کچھ کہا کالج بوائے......؟"

"نہیں...... میں ذرا اپنا گلا صاف کر رہا تھا......"

"ہر وقت گلا صاف کرنا بری عادت ہے......"

ہال خاموش رہا۔ وہ کچھ نہ بولا۔

"چلو کام شروع کرو...... ہری اپ......" وارک نے سخت لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

تھرسڈے...... رات کے دو بجے۔

ہال اور وسکو آج پھر برقی ٹھیلے پر کام کر رہے تھے۔ وہ کاٹھ کباڑ کو ٹھیلے پر لادتے اور اسے مخصوص مقام پر لا کر ڈھیر کر دیتے۔ تہہ خانے میں ادھر ادھر بکھرا ہوا کاٹھ کباڑ ایک جگہ جمع ہو کر بہت بڑے ڈھیر نما پہاڑ میں تبدیل ہوگیا...... مگر اب بھی آدھا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ آج یہ چوتھا موقع تھا کہ انہیں سگریٹ کے کش لگانے کا موقع ملا تھا۔ وہ دونوں اس وقت شمالی دیوار کے پاس کام کر رہے تھے۔ جو سیڑھیوں سے بہت دور تھی۔ یہاں پر روشنی بہت مدھم ہوتی تھی جس سے ماحول سے ایسا فریب نظر پیدا ہو رہا تھا کہ باقی لوگ میلوں دور دکھائی دیتے تھے۔

"تھینکس گاڈ کہ آج زیادہ چوہے نظر نہیں آئے......" ہال نے بولتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ہاں واقعی۔ آج کسی کو بھی نظر نہیں آئے...... شاید ہوسکتا ہے کہ انہیں کم بختوں کو کچھ عقل آگئی ہو......؟"

وہ دونوں اس وقت پرانے رجسٹروں، پرانے کھاتوں، بے کار کاغذات اور پرانے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس کھڑے تھے۔

"وسکو......؟ تمہارا کیا خیال ہے......؟ آخر یہ تمام چوہے کہاں جا چھپے ہیں......؟" دیواروں میں تو بہرحال گھس نہیں سکتے......"

"معلوم نہیں ہال...... کیا پتہ......" وسکو نے کچھ بولنا چاہا کہ عین اس وقت ایک بڑی سی سیاہ چمگادڑ پھڑ پھڑاتی ہوئی آئی اور اس نے دونوں کے سروں پر غوطہ مارا اور اسی طرح پھڑ پھڑاتے، اڑتے ہوئے کہیں غائب ہوگئی۔

"یہ...... یہ تو چمگادڑ تھی......"

"چمگادڑ کا اس تہہ خانے میں کیا کام......؟ انہیں تو درختوں اور کھنڈرات میں ہونا چاہئے تھا......" وسکو نے کہا۔

"یہ بہت بڑی چمگادڑ تھی اور چمگادڑ کیا تھی......؟ بلکہ......"

"بلکہ......؟"

"یوں سمجھ لو کہ پروں والا چوہا تھا......"

"اوہ گاڈ...... مگر یہ کیونکر ممکن ہے......؟"

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہوسکتا ہے...... اور......"

"کیا ہو رہا ہے......؟ کہاں ہو تم لوگ......؟" اسی وقت کہیں سے فورمین وارک کی آواز سنائی دی۔

"زیادہ اونچا مت بولو فورمین...... Don`t Noise ہال نے کہا۔

"یہ تم بول رہے ہو کالج بوائے......؟" فورمین واک کی آواز سنائی دی۔ وہ کہیں قریب ہی آگیا تھا۔

"ہاں...... میرا ہی دماغ خراب ہوگیا تھا...... ہاؤ ایور معافی چاہتا ہوں میں۔ آئی ایم سوری......"

"آئندہ دماغ درست رکھنا...... خراب مت کرنا......" سرزنش کی گئی۔

"ہوں......"

"واپس جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ وارک واپس جا رہا تھا۔

"آخر تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو ہال......؟" وسکو نے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہال کچھ نہ بولا۔ وہ وسکو کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے گھٹنے کے بل نیچے بیٹھا اور پھر اس نے لائٹر نکال کر جلایا۔ فرش پر آگ کی مدھم زرد روشنی پھیل گئی تھی...... وسکو گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے رکوع کے بل جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ فرش پر ایک چوکور ڈھکن سا بنا ہوا تھا۔ ہال نے اس پر انگلی مارتے ہوئے چیک کیا۔

"یہ تو لکڑی ہے......"

"ہاں......" وسکو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کوئی دروازہ ہے، نیچے جانے کے لئے......"

"اوہ...... مگر نیچے کیا ہوگا......؟"

"میں نے ایسے چوکھٹے اور بہت بہت دیکھے ہیں...... میرا خیال ہے کہ نیچے مزید کوئی تہہ خانہ ہوگا......"

"اس تہہ خانے کے نیچے اور بھی تہہ خانہ ہوگا......؟"

"ہاں...... کوئی خفیہ تہہ خانہ...... جس کے اندر شاید کوئی راز ہو......"

"اوہ گاڈ......" وسکو نے ایک گہرا سانس لیتے اور اپنے سینے پر مخصوص انداز میں صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

رات کا آخری پہر...... ساڑھے تین بجے کے وقت۔

وہ اس وقت شمالی مشرقی گوشے میں تھے۔ اپی اور چارلی ان کے پیچھے پائپ لئے ہوئے کھڑے تھے۔ اچانک ہال نے کام روک کر فرش پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔"

فرش پر ایک دروازہ تھا۔ اس کے وسط میں ایک گول آہنی دستہ تھا۔

ہال اپی کے پاس جا کر بولا۔ "ذرا پائپ کو بند کردو......"

اپی نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہوئے پائپ بند کردیا۔ پھر ہال زور سے چیخا "وارک...... مسٹر فورمین...... ذرا ادھر تو آؤ......"

وارک چھپ چھپ کرتا ہوا اس طرف آنے لگا۔ "ہوں...... کیا بات ہے......؟"

"یہ دیکھو...... ہال نے دروازے پر پیر مارتے ہوئے کہا۔ "اس کے نیچے بھی تہہ خانہ ہے......"

"تو پھر کیا ہوا......؟ یہ وقفہ نہیں ہے کالج بوائے...... کام کرو......"

"میرا خیال ہے تمہارے چوہے نیچے ہیں...... وہاں وہ افزائش نسل میں مصروف ہیں شاید......" ہال نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اور وسکو نے یہاں چمگادڑیں بھی دیکھی ہیں......"

اس وقت دوسرے افراد بھی وہاں موجود تھے اور سب کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

"وارک دو ٹوک لہجے میں بولا۔ "مجھے اس سے غرض نہیں ہے...... ہمیں اس تہہ خانے کو صاف کرنے کا کام سونپا گیا ہے......"

"تمہیں اس کام کے لئے تقریباً بیس مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔ میرا خیال ہے اس پر انتظامیہ کو بہت رقم خرچ کرنا پڑے گی......"

"ہم دس گنا معاوضہ لیں گے......" کسی نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"فورمین وارک نے غور سے ہال کو دیکھا۔ "تم واقعی پاگل ہوگئے ہو...... تمہارا خیال کیا ہے؟ کہ میں اس قیاس پر کہ نیچے چوہے ہیں۔ اس کام کو ہاتھ میں لوں گا......؟"

"میں دو دن لائبریری میں گزار چکا ہوں مسٹر فورمین۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے یہ یاد دلایا تھا کہ میں کبھی کالج میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ میں نے شہر کی صفائی، ستھرائی اور صحت عامہ کے متعلق آرڈی

نیسوں کو بہت توجہ سے پڑھا ہوا ہے۔ مسٹر فورمین...... یہ قوانین 1911ء میں بنے تھے۔ اس وقت...... جبکہ یہ مل ابھی بنی بھی نہ ہوگی...... معلوم ہے۔ اس مطالعے کے نتیجے میں مجھے کیا کچھ پتہ چلا......؟ علم ہوا ہے......؟"

"چلو کالج بوائے نکلو یہاں سے...... تم خود کو ملازمت سے برطرف سمجھو......"

ہال نے جیسے اس کی بات سنی نہیں تھی۔ ان سنی کردی تھی...... اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر گیٹس فال میں صحت وصفائی کا ایک قانون ہے۔ یہ قانون ایسے جانوروں سے متعلق ہے جو بیماریوں کے جراثیم لئے پھرتے ہیں۔ ان جانوروں میں چوہے، چمگادڑیں، آوارہ کتے اور چھپکلیاں وغیرہ شامل ہیں۔ خاص طور پر چوہے، دو پیراگرافوں میں 14 مرتبہ چوہوں کا ذکر آیا ہے۔ مسٹر فورمین یاد رکھو...... اگر مجھے نکالا گیا تو میں یہاں سے سیدھا ٹاؤن کمشنر کے پاس جاؤں گا اور اسے تہہ خانے کے حالات سے آگاہ کردوں گا......"

ہال کے چپ ہونے پر فورمین وروک کچھ نہ بولا اسے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ ذہن ہی ذہن میں ہال کی باتوں پر شاید غور کررہا تھا۔ ہال بڑی آسودگی سے واروک کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر نفرت وحقارت کے آثار پیدا ہوچکے تھے۔

ہال پھر بولا۔ "اور یاد رکھو مسٹر فورمین۔ اس کے نتیجے میں قانونی کارروائی ہوگی اور یہ ٹیکسٹائل مل کافی دنوں تک بند رہے گی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے نتیجے میں تمہارا باس کیا کارروائی کرے گا۔ وہ سب الزام تم پر عائد کرکے تمہیں برطرف کردے گا......"

فورمین واروک کے ہاتھ پھیلے۔ "یہ تم...... تم کیسی باتیں کررہے ہو......؟"

پھر اس کی نظر فرش پر بنے ہوئے چوبی دروازے پر پڑی۔ "ٹھیک ہے کالج بوائے۔ میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ تم پھر مل کی ملازمت میں ہو......"

"مجھے یقین تھا کہ تم مجھے نکالنے کی حماقت نہیں کروگے......" ہال مسکرایا۔

فورمین واروک کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم کافی ذہین اور ہوشیار آدمی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم نیچے جاؤ۔ ہمیں ایک تعلیم یافتہ شخص کے نظریات کی ضرورت ہے کہ نیچے کیا حالات ہیں...... تم اور وسکو نیچے جاؤگے......"

"نہیں...... نہیں...... میں نہیں جاؤں گا۔ میں نیچے نہیں جاؤں گا......" وسکو نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تم نے......؟" واروک دہاڑا۔

وسکو خاموش ہوگیا۔

"ہمیں تین فلیش۔ لائٹوں کی ضرورت ہوگی......" ہال نے بولتے ہوئے کہا۔

"تو تم اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لے جانا چاہتے ہو......؟" واروک نے سوال کیا۔

"ہاں......"

"کس کو......؟"

"ہال کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا اور پھر وہ بولا۔ "تمہیں مسٹر فورمین۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں انتظامیہ کی نمائندگی بھی ہونا چاہئے...... کیوں......؟ کیا خیال ہے......؟ ویسے بھی مجھے اور وسکو کو یہاں اب...... زیادہ چوہے نظر نہیں آتے......"

اسی وقت کسی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

واروک نے اردگرد جمع ہونے والے لوگوں کا بغور جائزہ لیا۔ وہ سب کے سب آنکھیں نیچی کیے اپنے جوتوں کو دیکھ رہے تھے۔ آخر واروک نے چارلی سے بولا۔ "چارلی! تم اوپر جاکر تین فلیش لائٹیں لے آؤ......"

وسکو نے ہال سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "آخر تم نے مجھے اس کام میں کیوں گھسیٹا ہے...... تمہیں معلوم ہے کہ میں چوہوں سے شدید نفرت کرتی ہوں......"

"میں نے نہیں...... تمہارا نام مسٹر فورمین نے پیش کیا تھا......" ہال نے کہا۔

واروک نے ہال کو دیکھا اور ہال نے واروک کو...... دونوں ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے دیکھے جارہے تھے۔

☆......☆......☆

تھرس ڈے...... صبح چار بجے۔

چارلی تین فلیش لائٹس لے آیا تھا۔ اس نے واروک، ہال اور وسکو کو ایک ایک فلیش لائٹ پکڑادی تھی۔

"اپی، پائپ وسکو کو دے دو......"

"ہاں۔ یہ لو......" اپی نے پائپ وسکو کی طرف بڑھادیا۔

"وسکو۔ تم درمیان میں رہوگے۔ اگر نیچے چوہے ہوں تو انہیں پانی کی بوچھاڑ مار کر بھگادینا......"

وسکو کے ہاتھ کپکپارہے تھے اور ہال دل ہی دل میں مسکرارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر نیچے چوہے ہوئے تو وسکو انہیں نہیں دیکھ سکے گا اور واروک بھی ان کی طرف سے انجان بن جائے گا۔ واروک نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ "چلو دروازہ اٹھاؤ......"

دو آدمی آگے بڑھ آئے۔ پھر چند لمحوں کی سخت جدوجہد کے بعد دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے دروازے کی طرف سے کوئی چیز ٹوٹ کر گری ہو۔

"یہ کیا تھا......؟" واروک نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"یہ آواز کیسی تھی......؟"

"ڈونٹ وری۔ یہ دیکھو......" ہال نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "معمولی لاک ہے......"

سب نے اس طرف دیکھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک تالا بند تھا۔ کافی بوسیدہ اور بریدہ بریدہ تھا۔ جسے زنگ نے چاٹ لیا۔ اسی وجہ سے یہ زور لگانے پر جب دروازہ کھولا گیا تو ٹوٹ کر نیچے جاگرا تھا۔

"اوہ، مگر تالے کو تو اندر نہیں بلکہ باہر ہونا چاہئے تھا......؟" واروک کے لہجے میں استفہامیہ پن کے ساتھ ساتھ حیرت بھی موجود تھی۔

سینٹرل جیل

ملزم۔ "جناب میں بھوکا تھا۔ بے گھر تھا۔ بے یارومددگار تھا۔ اس لیے میں نے چوری کی۔"

جج۔ "تمہاری حالت واقعی قابل رحم ہے۔ میں چھ ماہ کے لیے تمہارے لیے کھانے، پینے اور رہائش کا سرکاری بندوبست کردیتا ہوں۔ سینٹرل جیل میں۔"

(علی رضا۔ کراچی)

"اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں......"

"وہ کیا......؟"

"یہ تالا اس لئے اندر لگایا گیا ہوگا کہ کوئی نہیں چاہتا ہوگا کہ اس دروازے کو اس طرف سے کھولا جاسکے۔ کم ازکم ان دنوں...... جب یہ نیا تھا۔"

"مگر اسے بند کس نے کیا ہوگا......؟ اور کیسے......؟"

"اوہ...... واقعی۔ یہ تو ایک راز ہے...... اس کے بارے میں تو انتظامیہ کا کوئی نمائندہ ہی کچھ بتاسکتا ہے......" ہال نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"میرے خیال سے باتیں بہت ہوگئی ہیں......" چارلی نے اچانک بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ چلو اب نیچے چلتے ہیں......" ہال نے کہا۔

"اوہ گاڈ......" وسکو کپکپاتے ہوئے بولا۔ "نہیں میں نیچے نہیں جاؤں گا......"

"Why....?"

"یہ آوازیں سن رہے ہو...... کتنی عجیب اور خوفناک آوازیں ہیں......"

سب نے ان آوازوں کی طرف کان لگادیئے۔ نیچے سے چوہوں کے شور مچانے، پنجوں سے فرش کو کھرچنے اور طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں۔ لگتا تھا

گویا نیچے ہزاروں چوہے موجود ہیں۔ ان کی ایک بستی آباد ہو...... شہر بسا ہو۔'' کتر کتر...... چیں چیں...... سی سی...... کھچ کھچ......'' اور نامعلوم مدہم شور سا ہو رہا تھا۔

''یہ مینڈک وغیرہ ہوسکتے ہیں......'' فورمین واروک نے پرخیال انداز میں کہا۔

''ہاہاہا......!!!'' اسی وقت ہال بڑے زور سے ہنسا۔

فورمین واروک نے منہ بناتے ہوئے فلیش لائٹ آن (on) کرتے ہوئے نیچے چکائی تو ایرانی سل خوردہ لکڑی کی سیڑھی نیچے جارہی تھی۔ نیچے فرش کے پتھر سیاہ تھے۔ جن پر کہیں کہیں سل جمی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں اور فرش...... دیواریں نم دار، سفید ہو رہی تھیں۔ بھیگی بھیگی...... رطوبت زدہ دکھائی دے رہی تھیں۔ سل خوردہ تھیں۔ فلیش لائٹ کی روشنی میں انہیں وہاں ایک بھی چوہا دکھائی نہ دیا۔

''یہ سیڑھی ہم تینوں کا وزن برداشت نہ کر سکے گی......'' واروک نے سیڑھی کو بغور دیکھنے کے بعد کہا۔

''میں چیک کرتا ہوں اس سیڑھی کو مضبوطی سے......'' چارلی نے کہا اور پھر وہ دو پائیدان اتر کر اس پر اچھل کود کرتے ہوئے سیڑھی کی مضبوطی کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بولا۔ ''سیڑھی سل خوردہ ضرور ہے۔ جس کی حالت امتداد زمانہ نے بگاڑ دی ہے۔ مگر یقین کرو...... یہ ابھی بھی کافی مضبوط ہے۔ تین لوگ بیک وقت اور با آسانی نیچے اتر سکتے ہیں......''

''میں نے تم کو ایسا کرنے کے لئے نہیں کہا تھا......'' واروک نے بے حد ترش لہجے میں کہا۔

''آپ تو اس وقت بھی نہیں تھے۔ جو چوہے نے رے کو کاٹا تھا......'' چارلی نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔

''آؤ چلیں اب......'' ہال نے جلدی سے کہا۔

فورمین واروک نے چاروں طرف کھڑے لوگوں کو گھور کر دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وسکو بھی بادل نخواستہ ان کے درمیان چل رہا تھا۔ وہ تینوں ایک ایک کر کے نیچے اتر گئے۔ سب سے آگے ہال تھے۔ پھر وسکو اور اس کے بعد واروک...... پائپ کسی سانپ کی طرح وسکو کے ساتھ ساتھ نیچے پھسلتا ہوا آ گیا تھا۔ آرہا تھا۔ وہ تینوں نیچے آگئے تو واروک نے چاروں اطراف فلیش لائٹ ماردی، اس کی روشنی میں پرانے گلے سڑے صندوقوں کا ایک ڈھیر چند لکڑی کے ڈبے...... اور کچھ اور چیزیں بے ترتیب انداز میں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں...... دریا کی طرف سے بہہ کر آنے والی مٹی...... کیچڑ اور پانی ان سب کے ربڑ کے لمبے جوتوں کے ٹخنوں تک آرہی تھی پاؤں اندر تک دھنس جاتے تھے...... چاروں طرف پراسرار عجیب وغریب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''اب تو وہ عجیب سی آوازیں نہیں آرہی ہیں......؟'' وسکو کی آوازیں اس پراسرار ماحول میں گھنٹی کی طرح گونجی۔

''ہاں...... عجیب خاموشی ہے......'' واروک نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ تینوں سیڑھیوں کے قریب کھڑے تھے۔ سیڑھیاں ان کے عقب میں موجود تھیں۔ کچھ توقف کے بعد وہ تینوں سیڑھیوں سے آگے بڑھ گئے۔ وہ تینوں بے حد احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ فرش پر کیچڑ، سیلن اور کائی سے سخت پھسلن پیدا ہو رہی تھی...... ہال نے ایک جگہ رک کر لکڑی کے ایک صندوق پر روشنی ڈالی۔

''لیلا باس وران 1898ء...... ہال نے لکڑی پر لکھے ہوئے الفاظ کو بلند آواز میں پڑھا۔

''اوہ...... کیا مطلب......؟ کیا مل اس زمانے میں بھی یہاں قائم تھی۔ موجود تھی......؟''

''نہیں...... یہ مل 1930ء میں تعمیر ہوئی تھی، Butاس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟''

ہال خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کم آن...... آگے بڑھتے ہیں......''

''ہوں......'' پھر وہ تینوں آگے بڑھتے چلے گئے۔ تہہ خانہ ان کے اندازے سے بھی زیادہ لمبا ثابت ہوا تھا۔ یہاں کی بدبو اور سڑاند اوپر سے زیادہ

تھی اور دور کہیں سے پانی کے ٹپ ٹپ گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''ارے...... یہ کیا ہے......؟'' ہال کے منہ سے حیرت سے نکلا۔ فلیش لائٹ کی روشنی میں انہیں سامنے فرش پر دو فٹ اونچی کنکریٹ کی دیوار نظر آرہی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ تینوں چونک پڑے تھے۔ اس کے آگے کچھ دکھائی تو نہیں دے رہا تھا۔ مگر عجیب وغریب آوازیں ابھر رہی تھیں۔

''آخر اس کا مقصد کیا ہے......؟'' واروک نے غور سے اس دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ دیوار اس مل کی بیرونی دیوار ہے......'' ہال نے قیاس آرائی کی۔

''میں واپس جارہا ہوں......'' فورمین واروک نے گدلے پن سے بولتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی مڑنے لگا۔

ہال نے اس کی گردن پر سختی سے ہاتھ جمادیا۔ اسے کالر سے پکڑ لیا۔ ''مسٹر فورمین...... تم کہیں نہیں جاؤ گے......''

واروک نے غور سے ہال کی طرف دیکھا۔ ''کالج بوائے...... پاگل مت بنو...... یہ بات ٹھیک نہیں ہے......''

''ششش......'' ہال نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ سرد تھا۔ ''خاموشی سے چلتے رہو...... مسٹر فورمین۔ دوستوں سے جھگڑا مت کرو......''

''ہاں...... آں...... وسکو نے مردہ لہجے میں آواز نکالی۔

''اونہہ...... یہ مجھے دو......'' ہال نے وسکو کے ہاتھ سے پائپ چھین لیا۔ ساتھ ہی اس نے واروک کی گردن چھوڑی اور پائپ کی نال کا رخ واروک کے سر کی طرف کردیا۔ وسکو بری طرح ہڑبڑا کر پلٹا اور سر پر پاؤں رکھ کر دروازے کی طرف بھاگ گیا......

''باسٹرڈ......''

''ہال نے وسکو کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور فورمین واروک سے سرد لہجے میں بولا۔ ''چلو فورمین۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے ہوں......''

طوعاً وکرہاً واروک آگے بڑھا...... دو فٹ اونچی رکاوٹ پار کر جب وہ آگے بڑھتے تو ہال نے فلیش لائٹ ادھر ادھر گھمائی...... اور اطمینان کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کے اندازے...... خیالات درست ثابت ہوئے تھے۔ یہاں کے چاروں اطراف چوہے ہی چوہے موجود تھے...... وہاں اتنا تعفن، گھن، بدبو...... موجود تھی کہ ان کا ذہن بے اختیار چکرانے لگا تھا۔ کلیجہ منہ کو آرہا تھا...... ابکائی ہچکولے کھا رہی تھی۔ تمام چوہے خاموش تھے۔ موت کی طرح، بالکل خاموش......؟؟ اور دیواروں کے ساتھ چپکے ہوئے...... جھنڈ کے جھنڈ تھے...... ہزاروں آنکھیں چمک رہی تھیں...... دہک رہی تھیں۔ خوف و دہشت کے انگارے سے برسا رہی تھیں۔ آنکھوں میں بھوک تھی۔ اک آگ تھی۔ پیاس تھی...... پیشتر چوہے تو اتنے بڑے تھے کہ انسان کے گھٹنوں تک آتے تھے۔ ہال اور وسکو نے عام چوہے دیکھے تھے۔ طاعون زدہ اور سل خوردہ چوہوں کے متعلق انہوں نے صرف سنا اور پڑھا...... مگر انہیں کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج جب انہوں نے ایسے چوہے دیکھے تو خوف ودہشت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈر رگ و پے میں اتر گیا...... اوسان خطا ہوگئے۔ وہ دونوں بے ہوش ہوتے ہوتے رہے تھے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ششدر کھڑے تھے۔

''کالج...... کالج ب...... بوائے...... یہاں تو ہر طرف چوہے ہی چوہے ہیں۔ ان کی ایک الگ دنیا آباد ہے......'' فورمین واروک پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''اب......؟'' وہ اب بھی خود پر قدرے قابو رکھے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں خوف کی ہلکی سی لرزش آچکی تھی۔

''ہاں...... ہاؤ ایور (However) چلتے رہو...... کم آن......'' ہال نے جواباً کہا۔

وہ دونوں آگے بڑھ گئے...... پائپ ان کے پیچھے لہراتا اور گھسٹتا رہا...... ہال نے مڑ کر دیکھا۔ چوہوں نے

اب اس دوفٹ اونچی دیوار کے ساتھ بھی پوزیشن لے لی تھی...... بالکل ایک فوج کی مانند اس وہ ان دونوں کو اپنے نرغے میں لے رہے تھے...... رفتہ رفتہ...... آہستہ آہستہ خاموشی کا یہ سکوت چھٹنے لگا تھا۔ چوہوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ کچھ چوہے پائپ کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھے اور اس جگہ سے پانی باریک باریک...... پتلی دھاریوں کی شکل میں چھوٹ رہا تھا۔

ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ پاکر ایک چوہے نے ان کو دانت نکوسے، جیسے ان کا مذاق اڑا رہا ہو۔ منہ چڑا رہا ہو...... اور پھر اپنا سر نیچے کرلیا۔ اپنے کام میں جیسے مصروف ہوگیا۔ بہت بڑی اسی وقت ہال کی نظر اوپر اٹھی تو اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیلتے ہوئے سائیڈوں میں جالگیں۔ تہہ خانے کی وسیع چھت چمگادڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ تمام چمگادڑیں چھت سے الٹی لٹک رہی تھیں۔ وہ بہت بڑی بڑی تھیں۔ چیلوں اور گدھوں کی جسامت کی تھیں۔

"اوہ...... وہ...... و...... وہ دیکھو......"

واروک کی فلیش لائٹ کی روشنی میں کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک ناسانی کھوپڑی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ امتداد زمانہ نے اس کی حالت بدل دی تھی۔ وہ انتہائی خستہ اور بوسیدہ ہورہی تھی۔ اس پر سرسبز کائی جمی ہوئی تھی۔ مٹی سے لتھڑی ہوئی...... اور ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی ان دونوں کو دیکھ کر ہنس رہی ہو۔ قہقہہ لگارہی ہو، اس کے آگے مزید کچھ فاصلے پر انسانی پنجر کی ہڈیاں بھی پڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں......

واروک بولا۔ "ہال...... میرے خیال سے واپس چلتے ہیں......"

"نہیں......" ہال نے سرد اور سخت لہجے میں بولتے ہوئے واروک کی کمر میں پائپ کی نلکی ماری۔ گاڑ دی۔ "چلتے رہو۔"

واروک نے بے اختیار اپنے ہونٹ بھینچ لئے، اس وقت ہال کو اپنے وجود میں کسی جنونی اور پاگل کی روح دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "مسٹر فورمین۔ مجھ سے پہلے تم دیوانہ ہوجاؤ گے...... میں تمہارا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا......"

وہ دونوں انسانی پنجر کے اوپر سے آگے گزر گئے...... چوہے ان کی طرف سے بالکل بے پرواہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان کی طرف بڑھ بھی نہیں رہے تھے...... تھوڑی دور آگے ہال نے ایک چوہے کو راستہ کاٹتے دیکھا...... اور اس کے ساتھ ہی ہال نے ایک عجیب سی پراسرار آواز سنی، ایک سرسراہٹ سی...... بالکل گھسٹنے کی آواز...... ہال کے ساتھ ساتھ واروک نے بھی چونک کر اس طرف دیکھا تو دونوں کا ذہن جیسے ہوا میں گھوم گیا۔ ان کے سامنے بے انتہا پراسرار...... انوکھا...... قطعی عجیب منظر رواں تھا۔ ایسا منظر جو کبھی کسی زندہ انسان نے نہیں دیکھا ہوگا۔ مگر یہ منظر واروک کے بجائے ہال کے لئے اور بھی اطمینان بخش ثابت ہوا۔ گزشتہ چند دنوں سے اس کے ذہن میں اس قسم کا منظر کئی بار آچکا تھا۔ ابھرا تھا۔

"یہ...... یہ...... دو...... دیکھو...... یہ کک...... سر کیا ہے......؟" واروک اب دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

ان کے سامنے موجود چوہے پیٹ کے بل کھسک رہے تھے۔ رینگ رہے تھے۔ ہال نے غور سے دیکھا۔ اس تاریک اور سل خوردہ ماحول نے چوہوں میں ایک عجیب سی شیطانی تبدیلی پیدا کردی تھی، یہ تبدیلی سورج کی روشنی میں ہرگز نہیں آسکتی تھی۔ فطرت اس تبدیلی کو آنے ہی نہ دیتی۔ قطعی نہیں...... But یہاں فطرت نے ایک نیا روپ ان چوہوں کو دے دیا تھا۔ جہاں سورج کی کرنیں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ جہاں طاعون زدہ، سل خوردہ اور سل خوردہ ماحول تھا۔ طاعون کی طرح "سل" بھی ایک بیماری ہے۔ جس سے پھیپھڑے میں زخم پڑجاتے ہیں اور منہ سے خون آنے لگتا ہے۔ جیسے تپ دق...... جبکہ "سیل" نم دار، بھیگی ہوئی جگہ ہوتی ہے۔

یہ چوہے کیا تھے...... دیوزاد تھے۔ کئی چوہے تو تین تین فٹ لمبے بھی تھے۔ لیکن ان کی پچھلی ٹانگیں نہیں تھیں اور وہ آنکھوں سے بھی اندھے تھے۔ ان کی آنکھیں بے نور تھیں۔ بالکل چمگادڑوں کی طرح اندھے...... وہ پیٹ کے بل اپنی کمزور اگلی ٹانگوں کی مدد سے نہایت کریہہ انداز میں رینگ رہے تھے۔ گھسیٹ رہے تھے۔ واروک نے پلٹ کر ہال کو دیکھا۔ ہال واقعی بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ اس کی ہمت کا قائل ہوگیا۔

وہ بولا۔ "ہال ہم آگے نہیں جاسکتے۔"

"مگر میرا خیال ہے کہ یہ چوہے تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں......" ہال نے جواباً کہا۔

"فارگاڈ سیک...... پاگل مت بنو ہال......" واروک نے جلدی سے کہا۔

ہال کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ ابھری...... "آگے بڑھو مسٹر فورمین......"

واروک پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "چوہوں نے پائپ کو کترنا شروع کردیا ہے ہال...... اگر انہوں نے پائپ کو کاٹ دیا تو ہم کبھی واپس نہیں جاسکیں گے......"

"میں بھی جانتا ہوں...... چلو آگے بڑھو......" ہال کا لہجہ سرد تھا۔ اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔

واروک بولا۔ "تم پاگل ہوگئے ہو......؟"

ابھی کی بات جاری تھی کہ اسی وقت ایک چوہا واروک کے جوتوں پر ہوکر ایک طرف پھدکا...... واروک کے حلق سے چیخ نکل گئی بلکہ وہ بے اختیار اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا، ہال مسکرایا اور روشنی ادھر ادھر ڈالی۔ چوہے اب ان کے چاروں طرف تھے۔ صرف ایک فٹ کے فاصلے پر...... واروک آگے بڑھنا لگا تو فرش پر موجود چوہے دائیں بائیں اس طرح چھٹنے لگے...... ہٹنے لگے جیسے اسے راستہ دے رہے ہوں...... ہال واروک کے پیچھے پیچھے تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک ابھار تھا۔ مگر یہ ابھار دیوار کی شکل میں نہیں تھا بلکہ ڈھلوان کی صورت میں تھا......

واروک چلتے ہوئے اس ابھار پر پہنچا...... ہال نے واروک کی طرف دیکھا تو واروک کے چہرے کا تمام رنگ کسی لٹھے کی طرح سفید ہورہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں...... اسی وقت وہ چلایا۔ "اوہ مائی گاڈ...... سیوی گاڈ......" اس کے ساتھ ہی وہ پلٹا اور بھاگنے لگا ہی تھا کہ ہال نے پھرتی کے ساتھ پانی کی تیز رفتار بوچھاڑ اس پر ماری...... پانی کی تیز، بے حد طوفانی دھار واروک کے سینے پر شدت سے پڑی۔ نتیجتاً وہ اس کے زور سے اچھلا اور ابھار کے دوسری طرف جاگرا...... اس کی چیخیں بڑی لرزہ خیز تھیں۔ قیامت برپا...... شوں شوں کرتے ہوئے پانی کی آوازوں سے بھی زیادہ بلند......

"ہال...... فارگاڈ ہال......" وہ حلق کے بل چلایا۔ اس کی چیخ تہہ خانے میں کسی فٹبال کی طرح اچھل پڑی تھی۔ "ہیلپ می...... فارگارڈ ہیلپ می ہال...... ہال......؟"

اور پھر اس کی چیخیں جیسے یکلخت گھٹ گئیں۔ ایسی عجیب آواز سنائی دی جیسے کوئی خونخوار درندہ اپنے شکار کو ادھیڑ رہا ہو۔ واروک کی دردناک، کربناک موت کے بھیانک لمحات سے ہمکنار، چیخیں ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔ جن میں کمزوری بے پناہ تھی۔ پھر یہ چیخیں معدوم ہوگئیں...... زندگی موت کے آگے گھٹنے ٹیک چکی تھی۔ گوشت کترنے، ادھڑنے، چبائے جانے...... اور ہڈیوں کے کٹاک کٹاک ٹوٹنے کی دلخراش، جگر خراش آوازیں گتھم گتھا سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں کو ہال بخوبی سن رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مکروہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ عین اسی وقت بغیر ٹانگوں والا ایک چوہا گھسٹتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں آن ٹکرایا......

وہ دل و جان سے لرز اٹھا۔ چونکتے ہوئے اچھل پڑا۔ اس چوہے کا جسم پلپلا اور گرم تھا۔ نہایت مکروہ جسم...... ہال نے پائپ کا رخ اس کی طرف کرکے پانی کی بوچھاڑ اس پر ماری...... مگر اب پانی میں پریشر نہیں رہا

تھا۔ پائپ کو جگہ جگہ سے چوہوں نے کتر ڈالا تھا۔ جہاں سے پانی بوچھاڑوں کی شکل میں پھوٹ رہا تھا۔ چھوٹ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ چوہا پانی کی یہ بوچھاڑ لگنے پر فرش پر گھسٹتے ہوئے کئی فٹ دور لڑھک گیا...... ہال آگے بڑھتے ہوئے اس ابھار تک پہنچا جہاں قدرے چبوترے نما جگہ اٹھی ہوئی تھی۔ جیسے کسی سیڑھی کا ایک زینہ ہو۔ دوسرے ہاتھ سے ہال نے فلیش لائٹ کی روشنی دوسری طرف نیچے پھینکی۔ آگے راستہ تھا۔ بلندی کی دوسری طرف ایک طاق سا بنا ہوا تھا۔ اس طاق میں ایک بہت بڑا چوہا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ بڑی بڑی عمر گزیدہ سفید مونچھیں جھول رہی تھیں۔ اس کی نا اگلی ٹانگیں تھیں اور نا پچھلی...... ہال جمپ لگاتے ہوئے دوسری سائیڈ پر آیا تو وہ چوہا اس کے سامنے پیروں کے پاس کسی پتھر کی طرح آگرا...... ہال نے غصے سے اس کے جسم پر پوری قوت سے پاؤں مارا تو اس چوہے کے منہ سے ایک عجیب سی مکروہ آواز خارج ہوئی...... یہ چوہا نہیں بلکہ چوہیا تھی۔ چوہوں کی اس بستی کی ملکہ عالیہ...... اس کا عجیب سا وجود تھا۔ بے نام وجود...... وہ اپنی جگہ سے اس سے مس نہ ہوئی۔

''شاید اس کی اولادوں کی اولاد کے جسم پر کسی وقت میں چمگادڑوں کی طرح پر نکل آئے ہوں......''
ہال نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اس چوہیا کے پاس ہی واروک کے مردہ جسم کے سرخ لوتھڑے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس چوہیا نے چند ہی لمحوں میں اس کی تکا بوٹی کر کے رکھ دی تھی۔ بلاشبہ چوہوں کی اس ملکہ کا قد کسی کتیا برابر تھا۔

''گڈ بائے واروک...... میری تسلی ہوگئی۔ تم مر گئے۔ جان چھوٹی تم سے......'' ہال نے بولتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اندرونی ڈر تمہیں موت کی آغوش میں لے ڈوبا ہے۔ مگر میں بزدل نہیں ہوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ آگے بولتا...... اسی وقت چوہیا ملکہ جو گھسٹتے اور ناک کے سہارے ہال کے زندہ جسم کی خوشبو سونگھتے اس کے قریب پہنچ چکی تھی، اس نے ہال کی ٹانگ چبانے کے لئے اپنا بھاڑ جیسا منہ کھولا مگر ہال تیزی کے ساتھ ایک طرف ہٹ گیا۔

ہال تیزی کے ساتھ واپس مڑ گیا وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے واپس جا رہا تھا۔ اور راستے میں اپنے سامنے آنے والے چوہوں کو وہ پائپ سے پانی کی بوچھاڑ مار کر روک رہا تھا...... مگر اب پانی کا دباؤ آہستہ آہستہ کم سے کم تر ہو رہا تھا۔ بعض چوہے پھر بھی بڑھ بڑھ کر اس کی ٹانگوں پر حملے کر رہے تھے۔ ایک چوہے نے تو اس کی ران کو اپنے دانتوں میں دبا لیا...... ہال نے اسے جھپٹ کر خود سے الگ کیا اور پوری قوت سے اسے دور پھینک دیا۔ کسی گیند کی طرح مار دیا۔ مگر اتنی دیر میں وہ چوہا اس کی پینٹ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر ساتھ لے گیا۔

''کچرر...... اور چیں چیں......''
ابھی اس نے واپسی میں تین چوتھائی راستہ ہی طے کیا تھا کہ تاریکی میں ہر طرف پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی گونج پھیل گئی۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک بہت بڑی چمگادڑ اس کے چہرے سے آن ٹکرائی۔ اس اندھیرے میں پلنے والی چمگادڑیں ابھی اپنی دموں سے محروم نہیں ہوئی تھیں۔ چمگادڑ اس کی گردن کے گرد حلقہ بنا کر چمٹ گئی اور اس کی گردن کے نرم نرم گوشت میں بے صبری اور بے رحمی کے ساتھ دانت گاڑ دیئے۔

ہال کے حلق سے ایک دلدوز چیخ خارج ہوئی۔ اس نے پائپ کی نلکی سے چمگادڑ کو مارنا شروع کیا اور ضربیں لگاتا ہی چلا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ چلاتا رہا۔ آخر کار چمگادڑ نے اس کی گردن چھوڑ دی اور کہیں نیچے بے جان ہو کر جا گری۔ ہال لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا...... فرش پر چوہے بھی اس پر حملے کر رہے تھے۔ اب وہاں ایک تہلکہ خیز کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا اور اب اس نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ مگر چوہے شاید اسے زندہ واپس جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ سب اچھل اچھل کر اس پر حملے کر رہے تھے۔ ایک چوہے نے اس کے پیٹ میں ناف پر دانت جما دیئے...... وہ بری طرح پیٹ سے چمٹ گیا تھا۔ ایک دوسرا چوہا تیز رفتاری سے اس کے جسم پر چڑھ کر کندھے پر آ بیٹھا اور ساتھ ہی اس

نے ہال کے کان کے سوراخ میں منہ ڈال دیا...... ہال دیوانوں کی طرح چلانے اور چیخنے لگا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بے سمت منہ اٹھائے بھاگا......

کہیں سے ایک چمگادڑ اڑتی ہوئی اس کے سر پر آ بیٹھی اور ہال کی کھوپڑی کی کھال ادھیڑ کر لے اڑی...... ہال کے قدموں میں تیز رفتاری کے بجائے لرزش پیدا ہوگئی، بھرپور کپکپاہٹ اسے اپنا جسم بے جان ہوتا ہوا محسوس ہوا...... بہت سے چوہے دوڑتے، بھاگتے اور اچھلتے کودتے ہوئے اس کے جسم پر چڑھتے چلے گئے...... اس کے کانوں میں بے شمار چوہوں کی عجیب و غریب خوفناک آوازیں بھرتی چلی گئیں...... پھر اس کے لئے کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک چپٹے اور ابھرے ہوئے کالے پتھر پر جا گرا۔

اسی وقت ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور زمین کو ہلکا سا جھٹکا لگا، تمام چوہے اس کے جسم کو ادھیڑنے میں مصروف تھے۔ بے شمار چوہے اس کے جسم پر چڑھ دوڑے اور لمحوں ہی لمحوں میں اس کا جسم ان چوہوں کے نیچے چھپ گیا۔ مگر جس کالے ابھرے ہوئے پتھر پر اس کا جسم گرا تھا۔ اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی گڑگڑاہٹ بدستور ہچکولے کھائے جا رہی تھی۔ جیسے زلزلے کے جھٹکے لگ رہے ہوں۔

☆......☆......☆

''ان دونوں کو گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے......'' چارلی نے بولتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں نیچے چل کر دیکھنا چاہئے......''

''میں نہیں جاؤں گا...... ہرگز نہیں جاؤں گا میں نیچے......'' وسکو نے فوراً روہانسے لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، تم نہیں جانا موٹے......'' اپی نے حقارت سے وسکو سے کہا۔

''آؤ ابھی چلیں......'' بورگن نے کہا۔ وہ دوسرا پائپ لے آیا تھا۔ ''میں اپی، فیلڈ اور چارلی نیچے جائیں گے...... اسٹیو تم جا کر کچھ اور فلیش لائٹس لے آؤ۔''

''ٹھیک ہے......'' اسٹیو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ عین اسی وقت ان سب کو گڑگڑاہٹ کی تیز آواز سنائی دی اور فرش کو جھٹکا سا لگا۔

''ارے یہ کیا تھا......؟''

''زمین کو جھٹکا سا لگا ہے......''

اس وقت زمین پھر لرزی۔ اب کی بار شدت میں اضافہ تھا۔

''کہیں زلزلہ تو نہیں......؟'' ''معلوم نہیں......'' فیلڈ نے فوراً کہا۔ اب کی بار زمین کانپنا شروع ہوگئی۔ چیزیں الٹ پلٹ گئیں۔ دیواروں کا سیمنٹ ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگا تھا۔

''بھاگو...... نہیں تو ہم سب مارے جائیں گے......'' یہ آواز وسکو کی تھی۔ جو پوری قوت سے چلایا تھا۔

سب بھاگ کھڑے ہوئے...... در و دیوار پوری شدت سے لرز رہی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی...... سیمنٹ اکھڑ رہا تھا۔ اینٹیں گر رہی تھیں۔ یکلخت کافی فاصلے پر موجود تین ستون بیک وقت ٹوٹ گئے۔ چھت دھماکے کے ساتھ نیچے گرتی چلی گئی۔ اسی وقت ایک اور دھماکہ ہوا...... ایسا خوفناک بھیانک دھماکہ کہ دل ڈوب ڈوب جائے...... اچانک چھت کا ایک بہت بڑا بوسیدہ حصہ ٹوٹ کر بھاگتے ہوئے وسکو کے اوپر آن گرا۔ اس کا وجود ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔ غائب ہو گیا۔ بھاگتے بھاگتے چارلی نے پلٹ کر اس طرف دیکھا مگر اسی وقت وہ لڑکھڑایا اور گھسٹ کر دور تک چلا گیا...... وہیں سے زمین پھٹ گئی اور وہ نیچے جا گرا...... اگلے لمحے ہی تمام ٹیکسٹائل مل زمین بوس ہوگئی۔ گرد و غبار کا نہایت کثیف بگولا جیسے چاروں اطراف پھیل گیا۔ جس میں ہر چیز چھپ گئی۔ یہ سیل اور سل خوردہ مل اپنے انجام سے دو چار ہو چکی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ زندگی اور موت کا بھیانک باب شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ قدرت کے کھیل اور اسرار قدرت ہی جانتی ہے......

انوکھی سزا

خلیل جبار۔حیدر آباد

ایک نوجوان اپنی طاقت اور عھدے کے زوم میں لوگوں کو روندتا ھوا سرپٹ بھاگے جارھا تھا اسے خوف خداوندی بھی نہیں تھی، مجبور اور پریشان لوگوں کو دل کھول کر اذیت دیتا کہ پھر اچانک......

خوف وہراس کے لبادے میں لپٹی ایک عجیب وغریب نا قابل فراموش دلخراش واقعہ

میں ایک لیڈی ڈاکٹر ہوں اور ایک میٹرنٹی ہوم میں نوکری کرتی ہوں، ہماری یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ خواتین کی مناسب دیکھ بھال کریں اور ڈیلیوری ہوجانے پر ماں اور بچہ دونوں خیریت سے اپنے گھر چلے جائیں۔ انتہائی دیکھ بھال کے باوجود کبھی کبھار کوئی کیس بگڑ بھی جاتا ہے جسے ہمیں بڑے اسپتال ٹرانسفر کرنا پڑجاتا ہے۔ کیس بگڑنے میں زیادہ تر خواتین کا ہی قصور ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایت پر مکمل عمل نہیں کرتیں، دوائیاں پابندی سے نہیں لیتیں۔ غذا پر کچھ خاص توجہ نہ ہونے پر کیس کو بگڑنا ہی ہوتا ہے۔ ہم خواتین کو ڈراتے بھی ہیں تاکہ وہ اپنے اوپر دھیان دیں، اچھی غذا سے خون کی کمی نہیں ہوتی۔

اس روز اسپتال میں کوئی کیس نہیں آیا تھا، میں اپنی ڈیوٹی پر تھی۔ فارغ بیٹھنے کی وجہ سے وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا، اس لئے وقت گزاری کے لئے میں اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی، گرمی کے دن تھے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی اور مجھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگ رہے تھے۔ حیدرآباد کی یہی خاص بات ہے کہ یہاں دن کتنا ہی گرم کیوں نہ ہو رات ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اس لئے اس شہر میں گرمیوں میں چھت پر سونے کا رواج عام ہے۔ میں دوسری منزل پر تھی لیکن کھڑکی سے سڑک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سڑک پر سناٹے کا راج تھا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گزرنے پر کوئی گاڑی یا رکشہ وغیرہ گزرتا نظر آجاتا تھا۔ اور میں خود کو بیدار رکھنے کی بھرپور کوشش کررہی تھی۔

اچانک ایک رکشہ اسپتال کے گیٹ پر آکر رکا۔

ایک پولیس والا کسی عورت کو سہارا دیتا ہوا گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ عورت کو دیکھتے ہی میں سمجھ گئی۔ ڈلیوری کیس ہے۔ کچھ دیر میں اسپتال میں اپنی انٹری کی خانہ پری کرا کے وہ کانسٹیبل عورت کو اوپر لے آیا، عورت بڑی تکلیف میں دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ڈائجسٹ کو ٹیبل پر رکھا اور اپنی ساتھی نرس کو اشارہ کیا کہ وہ عورت کو کمرے میں لے جائے۔ ایک سادہ پرچے پر کچھ دوائیاں اور ضروری سامان لکھ کر کانسٹیبل کے حوالے کیا جس کا نام معراج تھا۔

"یہ چیزیں فوری لے آئیں۔"

"جی بہتر۔" کانسٹیبل معراج پرچہ لیتے ہوئے بولا۔

اسپتال کے گیٹ کے پاس ہی میڈیکل اسٹور تھا۔ وہ سامان جلدی سے لے آیا۔ اس عورت کا نام روبینہ تھا۔ وہ پسینے میں نہائی ہوئی اور سخت تکلیف میں دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے فرائض انجام دینا شروع کردیئے۔

پھر ایک گھنٹہ بعد میرے ہاتھوں میں ایک عجیب و غریب بچہ تھا۔ ایسا بچہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دو آنکھوں کے بجائے ایک آنکھ ماتھے پر تھی۔

بیچ سر میں ایک چھوٹا سا سینگ ابھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایسے مسکرایا تھا جیسے کوئی سمجھدار بچہ ہو۔ حیرت انگیز طور پر وہ ذرا بھی نہیں رویا تھا۔ مجھے حیران وپریشان دیکھ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ میں سمجھی کہ کوئی نرس ہنسی ہے۔ میں نے اپنی ساتھی دونوں نرسوں کو دیکھا وہ بھی حیرانی سے بچے کو دیکھ رہی تھیں، ان کا قہقہہ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پھر بھی میں نے ان سے پوچھا۔

"یہ قہقہہ کس نے لگایا تھا؟"

"اس بچے نے ہی لگایا ہے۔" نرس شہلا نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"یہ...... یہ کیسا بچہ ہے؟" نرس شگفتہ نے کہا۔

"میں خود حیران ہوں ایسا بچہ میں نے پورے کیریئر میں نہیں دیکھا۔" میں نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

اکثر ہمارے پاس ایسے کیسز ہوتے رہتے ہیں جن میں کسی بچے کی ٹانگیں جڑی ہوتی ہیں۔ کسی بچے کے دو دھڑ ہوتے ہیں۔ کسی بچے کے ہاتھ جسم سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے بچے کچھ وقت جی کر انتقال کرجاتے ہیں۔ مگر اس طرح کا بچہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس لئے خوف آنا فطری تھا۔ میرے ساتھ جو نرسیں تھیں وہ بھی بری طرح خوف زدہ تھیں۔

"اب کیا کریں؟" نرس شگفتہ نے کہا۔

"میں اس کے باپ سے بات کرتی ہوں۔" بچے کو لے کر میں کمرے سے باہر آئی۔

مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر اس کا گھبرا جانا فطری تھا۔ وہ لپک کر میرے پاس آیا۔

"جی ڈاکٹر صاحبہ خیریت ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بچے کی ماں خیریت سے ہے لیکن......" میں کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن...... کیا...... کیا ہوا بچہ خیریت سے ہے نا؟" معراج نے پوچھا۔

میں سوچ میں پڑگئی اسے کیسے بتاؤں کہ اس کے یہاں کیسے عجیب وغریب بچے کی ولادت ہوئی ہے۔

میری مسلسل خاموشی پر معراج کے چہرے پر پریشانی کی گہری لکیریں بنتی جارہی تھیں۔ میں واپس روم میں گئی اور ایک نرس کو اشارے سے بچہ باہر لانے کو کہا۔

نرس کے بچے کو لانے پر معراج لپک کر اس بچے کی طرف آیا لیکن جیسے ہی اس کی بچے پر نظر پڑی وہ گھبرا کر پیچھے ہوگیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی بچے کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس کی یہی حالت رہی۔ پھر اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ اس طرح رونے پر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور میں ہمت کرکے اس کے قریب گئی اور اس کو دلاسا دینے کی غرض سے بولی۔

"ہمت سے کام لو معراج، اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔"

"قصور...... سارا قصور میرا ہی ہے ڈاکٹر صاحب۔" وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"تمہارا قصور......" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحبہ یہ قدرت نے مجھے سزا دی ہے۔"

"کس بات کی سزا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے برے اعمال کی سزا ہے۔ پولیس کے محکمے میں آنے کے بعد میں خود کو ناخدا سمجھ بیٹھا تھا۔ ملزمان سے دوستانہ رویہ، کمزور اور بے گناہ لوگوں پر تشدد کرکے رقوم بٹورنا میرا مشغلہ بن گیا تھا، میرے افسر بھی مجھ سے اس لئے خوش تھے کہ میں ان کو کما کر دے رہا ہوں اور کما کر دینے والے اہلکار، افسران کی نگاہوں میں داد و تحسین پاتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ بھی تھا۔ افسران کا منظور نظر بن کر میں کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا کہ جس میں مال حاصل ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میری پولیس میں نوکری لگی تھی۔ میری ڈیوٹی ایک چوک پر رات میں لگی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ایسے میں ایک نوجوان کا وہاں سے گزر ہوا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ میرے پاس آیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"

"جج...... جی میں کراچی سے آرہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اچھا کراچی سے آرہے ہو، بس کا ٹکٹ ہے تمہارے پاس؟" میں نے ذرا رعب سے کہا۔

"ٹکٹ...... بس والے ٹکٹ کہاں دیتے ہیں۔ ویسے ہی پیسے لے کر رکھ لیتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"مجھے تو بہت ہوشیار لگتا ہے جلدی سے بتا چوری کرنے کا ارادہ کرکے گھر سے نکلا ہے نا۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"م...... م...... میں چور نہیں ہوں۔" وہ بوکھلا۔

"تو چور نہیں ہے پھر اتنا گھبرا کیوں رہا ہے۔ بول کیوں گھبرا رہا ہے۔" میں زور سے چیخا۔

میرے چیخنے پر وہ سہم گیا۔ میں نے اس کے سہم جانے کا فائدہ اٹھا کر اس کی تلاشی لینی شروع کردی۔ اس کی دونوں جیبوں سے کچھ خاص رقم برآمد نہ ہوسکی۔ صرف پچاس روپے ہی نکلے۔

"بقول تیرے کراچی سے آرہا ہے اور تیری جیب سے یہ رقم برآمد ہوئی ہے۔ صحیح بتادے تو چوری کرنے ہی نکلا ہے نا۔"

"میں سچ بتا رہا ہوں کراچی میں ایک میت میں شرکت کرنے گیا تھا اور جو رقم لے کر گیا تھا وہ اتنی زیادہ نہیں تھی جو بچ جائے۔"

"اب اس سے پہلے کہ میرا دماغ گھومے میری نظروں سے دور ہوجا، ورنہ میں تجھے لاک اپ میں لے جاکر بند کردوں گا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"وہ میرے پیسے......" اس نے اپنے پچاس روپے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی جارہا ہے یہاں سے یا چوری کے مقدمے میں لاک اپ میں بند کروں۔" میں نے گھورتے ہوئے کہا۔

میرے غصے سے گھورنے پر وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے اس طرح بھاگنے پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ جسے میں نے بڑی مشکل سے روکا۔ وہ مجھے ہنستا دیکھ کر پلٹ سکتا تھا۔ اور میری پہلی "پیدا" کو مانگ لیتا۔

میرے سینئر ساتھیوں نے مجھے اچھی طرح سے سمجھایا ہوا تھا کہ جب بھی پیدا کرنا ہو اپنے لہجے کو سخت بنالو۔ جتنا غصہ کروگے "پیدا" اتنی ہی زیادہ ہوگی اور اگر چہرے پر مسکراہٹ آئی تو پھر سمجھ لو کہ تم نے سامنے والے پر جتنا رعب ڈالا ہے وہ سب ختم اور وہ تم سے فری ہونے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا اگر پیدا کرنا چاہتے ہو تو پھر کسی کو فری ہونے کا موقع مت دو پھر دیکھو کتنی پیدا ہوئی ہے۔"

میں نے اپنا لہجہ سخت کرکے پچاس روپے کی پیدا کرلی تھی۔ پہلی پیدا ہونے پر میں بہت خوش ہوا تھا۔ اب میرا یہ معمول بن گیا میری جہاں بھی ڈیوٹی لگتی لوگوں کو بہانے، بہانے سے تنگ کرکے ان کی جیبوں سے رقوم نکلوانے لگا تھا۔ میں خود بھی تھانوں میں دیکھ رہا تھا کہ دوسرے اہلکار کس طرح لوگوں پر ظلم کرکے رقم نکلوا لیتے ہیں۔ طرح طرح سے ان پر تفتیش کے نام پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ان کے عزیز رشتہ دار انہیں تشدد سے بچانے کے لئے نہ جانے کہاں، کہاں سے رقم اکٹھی کرکے پولیس اہلکاروں کو رشوت کے طور پر دیتے ہیں۔ جن کی تھانے سے باہر ڈیوٹیاں لگتی ہیں وہ مختلف کاروباری لوگوں اور راہ گیروں کو تنگ کرکے ان سے رقوم نکلواتے ہیں۔

یہ سب باتیں مجھے پتا چلنے پر میرا دل بھی بہت سخت ہوگیا تھا۔ میں کسی پر بھی رحم نہیں کھاتا تھا صرف "پیدا" پر میرا سارا زور ہوتا تھا۔ اس پیدا میں کچھ حصہ میرے سینئر کا بھی ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں سمجھ گیا سب کو رقم دینے کی ضرورت نہیں، صرف اپنے افسر کو خوش رکھو، باقی ساتھیوں کو چائے پر ٹرخادو۔ یہی ان کی اوقات ہے، غلط کام پر جب پکڑ نہ ہو تو انسان کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہورہا تھا۔ میرے افسر مجھے ایسی جگہ پر ڈیوٹی دینے لگے تھے جہاں "پیدا" زیادہ ہوتی تھی۔ ناجائز کمائی جب آتی ہے تو وہ اپنی واپسی کا راستہ بھی نکال لیتی ہے۔ جوا، شراب، بازاری عورتوں سے تعلقات رکھنا جیسی برائیاں مجھ میں آتی چلی گئیں۔ دوستوں کے ساتھ کھانے پینے، عیاشی کی محفلیں جمانا معمول بن گیا تھا۔ میرے عزیز و رشتے دار بھی مجھے رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ میں معمولی سپاہی ہوکر خرچ اس طرح کرتا ہوں جیسے کوئی رئیس زادہ ہوں۔ جب لوگ مجھ سے پوچھتے کہ میں اتنا خرچ کیسے کرتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند اور گردن اکڑ جاتی تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے میری گردن میں سریا آگیا ہو جو گردن کو سیدھا رکھے ہوئے ہے۔

"یہ سب اوپر کی کمائی کا کمال ہے۔" میں کہتا۔

"ارے بھئی کیا تم بھی اوپر کی کمائی لیتے ہو۔" وہ مجھے حیرت سے دیکھتے۔

"کیا کروں مہنگائی اس قدر ہوگئی ہے کہ اوپر کی کمائی کے بغیر گزارا نہیں ہے۔" میں فخر سے کہتا۔

دن بہت اچھے گزر رہے تھے۔ اوپر کی کمائی سے جیب ہر وقت نوٹوں سے بھری ہوتی تھی اس لئے گھر میں کوئی فکر و فاقہ نہیں تھا۔ میرے آئے دن کے فضول قسم کے خرچوں سے تنگی آنے لگی تھی خوشامدی دوستوں کے اکسانے پر میں آئے دن مخصوص جگہوں پر عیاشی کی محفلیں منعقد کرنے لگا تھا۔ ان محفلوں میں دل کھول کر خرچ کرتا جس سے میری جیب خالی رہنے لگی تھی۔ دوستوں کا بھی خاصہ مقروض ہوگیا تھا۔ مگر میں پریشان پھر بھی نہیں تھا کیونکہ اوپر کی کمائی میں اکثر ایسے مواقع آجاتے تھے کہ میں اپنا سارا قرضہ چند دنوں میں چکا دیتا تھا اس لئے مجھے دوستوں سے پھر نیا قرضہ مل جاتا تھا۔ دوستوں کے قرضہ دینے سے انہیں یہ فائدہ تھا کہ وہ میری محفلوں میں کھل کر مفت میں عیاشی کرلیتے تھے اور میں انہیں اس لئے مفت میں عیاشی کرادیتا تھا کہ وہ میری خوشامد اور جھوٹی تعریفیں کرنے میں بڑے ماہر تھے ان کے منہ سے اپنی بے جا تعریفیں سن کر میرا سر فخر سے اور غرور سے تن جاتا تھا۔

انہی دنوں میں دوستوں کا خاصہ مقروض ہوگیا جو پیدا ہورہی تھی اس کا زیادہ حصہ قرض چکانے میں صرف ہورہا تھا۔ میرے افسر کو پیدا میں حصہ نہ ملنے وہ بھی مجھ

سے روشنارو شناسا رہنے لگا تھا مجھے اس بات کا احساس تھا اور میں پوری کوشش میں تھا کہ کہیں سے پیدا کا آسرا ہو جائے تا کہ افسر کو خوش کر دوں ورنہ میری ایسی جگہ ڈیوٹی لگا دے گا جہاں بالکل بھی پیدا کا آسرا نہ ہو۔ ایسا ہو جانے پر میرے لئے عیاشی تو دور کی بات گھر کا خرچہ چلانا بھی مشکل ہو جاتا اور پھر ایک دن مجھے موقع مل ہی گیا۔

ہوا یہ کہ ایک اسپتال سے کچھ فاصلے پر میری ڈیوٹی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے کہ ایک شخص کو میں نے موٹر سائیکل پر آتے دیکھا۔ اسے دیکھ کر میں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی روک دی۔

''اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟'' میں نے ذرا رعب سے کہا۔

''میں گھر سے آ رہا ہوں اور وہ جو سامنے اسپتال ہے وہاں جا رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''مجھے تو تم چور دکھائی دے رہے ہو۔''

''چور، یہ، یہ آپ کیسی بات کر رہے ہو، کیا میں شکل سے آپ کو چور دکھائی دیتا ہوں۔'' اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔

اس کا غصے سے مجھے دیکھنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا کیوں کہ عوام کو غصے سے دیکھنا ہم پولیس والوں کا کام ہے اگر عوام نے ہمیں غصے سے دیکھنا شروع کر دیا تو ہم پولیس والے پیدا کس طرح کر سکیں گے۔

''اس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا تلاشی دو۔'' میں نے کڑک کر کہا۔

اس نے اپنے ہاتھ اوپر کر لئے۔ میں نے اس کی تلاشی لینی شروع کر دی، کچھ کاغذ اور پچیس ہزار روپے کی رقم کے سوا جیب سے کچھ نہ نکلا۔

''کہاں سے یہ رقم لے کر آ رہے ہو، کسی کو لوٹا ہے تم نے؟'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

''م...... مم...... میں نے کک...... کک...... کسی کو نہیں لوٹا۔'' وہ بولا۔

''پھر اتنی رقم رات گئے جیب میں ڈال کر کیسے گھوم رہے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔

''یہ رقم میں اپنے دوست کاشف سے ادھار لے کر آیا ہوں۔ میری بیوی کی آپریشن سے ڈلیوری ہونی ہے۔ اگر میری بیوی کا بروقت آپریشن نہ ہوا تو پیدا ہونے والے بچے اور بیوی دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔''

''کہانیاں گھڑ لینے میں تم چور اچکوں کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے اپنے ہاتھوں میں پچیس ہزار کی رقم کو للچائی نظروں سے دیکھا۔

اس رقم میں سے کچھ رقم میرے اپنے افسر کو دے دینے سے اس کی ناراضگی دور کر دینے کے لئے کافی تھی۔

''نہیں...... نہیں...... میں چور نہیں ہوں۔'' وہ بولا۔

''اچھا اب تم مجھے بتاؤ گے کہ تم چور نہیں ہو، میرا اندازہ بالکل غلط ہے، میں نے اچھے اچھے چوروں کا دماغ درست کر کے رکھ دیا ہے پھر تم کس کھیت کی مولی ہو، ابھی تھانے کے ڈرائنگ روم کی سیر کرواؤں گا نا تو پھر تم سب کچھ فر فر بولنے لگو گے کہ یہ رقم تم کہاں سے چرا کر لائے ہو۔'' میں نے کہا۔

''میرا یقین کریں میں سچ بول رہا ہوں، میری بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے یہ رقم فوری طور پر اسپتال میں جمع کرانی ہے۔'' وہ گڑگڑایا۔

''اچھا اس کا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں، تم سچے ہو، تمہارا دماغ درست کئے بغیر گزارا نہیں ہے۔'' میں نے فوراً ریوالور نکال کر تان لیا۔

''یہ...... یہ...... کیا کر رہے۔'' وہ گھبرایا۔

''تو مجھے جھوٹا ثابت کرنا چاہ رہا ہے نا، میں اس وقت تیرے سر کا نشانہ لے کر گولی چلاؤں گا اور تیرے مرنے پر تیری لاش سامنے جو گندا نالا ہے اس میں پھینک دوں گا۔'' میں نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسا غضب نہیں کرنا، میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے۔'' وہ التجا کرنے لگا۔

''تیری ہمت کیسے ہوئی، مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی، آج تک میرے کسی افسر نے مجھے جھوٹا نہیں کہا تو کیا میرے افسر سے بھی بڑھ کر ہے۔''

''مجھ سے غلطی ہو گئی ہے مجھے جانے دیں، میری

بیوی اسپتال میں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔''

''جاؤ اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ اور یہ بات ذہن میں رکھنا آئندہ کبھی کسی پولیس والے کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش نہ کرنا میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں، لیکن دوسرا پولیس والا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' میں نے ایسے کہا جیسے اس پر احسان کر رہا ہوں۔

''جی وہ میرے پیسے......''

''اتنی بدتمیزی کرنے پر پیسے لینے کی توقع رکھتا ہے، زندہ رہنے کے لئے چپ چاپ چلا جا اور پیسوں کو بھول جا۔''

''نہیں...... ایسا ظلم نہ کریں۔ میں یہ بڑی مشکل سے پیسے لے کر آیا ہوں کہیں اور سے اتنی جلدی پیسے ملنے کی امید بھی نہیں ہے۔'' وہ میرے پاؤں میں پڑ گیا اور گڑگڑانے لگا۔

اس کے گڑگڑانے سے مجھے یہ سمجھنے میں آسانی ہو گئی تھی کہ وہ اثر رسوخ والا شخص نہیں ہے ورنہ وہ مجھے دھمکیاں دینے لگتا یا میری اوپر شکایت کر کے اپنی رقم وصول کر لیتا۔ اس پر مجھے بہت ترس آ رہا تھا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ مجھے بھی رقم کی اشد ضرورت تھی۔ میں کسی بھی طرح سے یہ آئی رقم اسے لوٹانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاؤں پر پڑتا دیکھ کر اسے زور سے ٹھوکر ماری۔ وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ ریوالور کا رخ میں نے پھر اس کی طرف کر دیا۔ میں ابھی فائر کھولنے ہی والا تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس لئے وہ چلایا۔

''خدا کے لئے گولی نہیں چلانا۔''

''نہیں گولی چلانی پڑے گی تو اس طرح باز نہیں آئے گا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''میں چلا جاتا اگر میری بیوی کی زندگی ہوتی تو وہ ضرور بچ جائے گی اور اگر اس کی زندگی نہیں ہوئی تو مر جائے گی۔'' اس نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اب آئے نا اپنی اوقات میں، موت کے سامنے اچھے اچھے لوگ سنبھل جاتے ہیں۔ تو بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے اس وقت دل ہی دل میں بڑی خوشی ہو رہی تھی کیونکہ اسے مارنے کی ایکٹنگ کام میں آ گئی تھی۔

میں نے سنا تھا رات میں پولیس والے عوام کو لوٹ لیتے ہیں، مزاحمت کرنے پر گولی مار کر ہلاک کرنے سے دریغ نہیں کرتے، آج میں نے اس کا ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔

پچیس ہزار کی رقم جیب میں آ جانے پر میں بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ جلدی سے ڈیوٹی کا وقت ختم ہو اور میں گھر جاؤں۔

دو گھنٹے میں نے بڑی بے چینی میں گزارے اپنے ساتھی کے آنے پر میں اپنی ڈھیلی پینٹ کو درست کرتے ہوئے گھر کو روانہ ہو گیا۔ جب میں اسپتال کے پاس سے گزرا۔ وہاں میں نے ایک ایمبولینس کے پاس خواتین کو روتے ہوئے دیکھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ اسپتال کے وارڈ بوائے کسی خاتون کو اسٹریچر پر اٹھا کر ایمبولینس کی طرف لے کر آ رہے تھے ان کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جس سے میں نے پچیس ہزار کی رقم لوٹی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا وہاں رکنا مشکل ہو گیا اور میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ ان عورتوں کو پتا چلنے پر ان کا سارا غصہ مجھ پر آ سکتا تھا۔

شام گئے جب میری ڈیوٹی پر واپسی ہوئی میں سخت خوفزدہ تھا، رات جس بے رحمی کا میں نے مظاہرہ کیا تھا یہ سچ ہے کہ پولیس کانسٹیبل بن جانے پر ہم لوگوں میں تکبر بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے انسان کو انسان نہیں سمجھتے، ان سے رویہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے وہ کوئی حقیر سی شے ہوں۔ اپنے افسران کے سامنے ہم ایسے بن جاتے ہیں جیسے معمولی سے چوہے ہوں۔ میں اپنے افسر کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں اس شخص نے رات کے واقعہ کی شکایت نہ کر دی ہو۔ میرے اس اقدام سے ایک حاملہ عورت کی ہلاکت ہو گئی تھی۔ وہ بروقت اسپتال میں پیسے جمع کرا دیتا تو شاید اس کی بیوی

ہلاک نہ ہوتی۔ ڈر اور خوف کی حالت میں جب اپنے افسر کے سامنے گیا وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے معراج آج بڑے گھبرائے ہوئے ہو، طبیعت وغیرہ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں طبیعت ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے پچیس ہزار کی رقم اپنے افسر کے سامنے رکھ دی۔

وہ اتنی زیادہ رقم دیکھ کر چونکا۔ میں نے رات کا واقعہ بیان کر کے جب اپنے ڈر اور خوف کا ذکر کیا۔ میرے افسر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"پولیس والے ہو کر ڈرتے ہو، تم کیسے پولیس ہو؟ شیر بنو شیر۔"

"میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا ہے نا، اس لئے ڈر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں تمہاری ڈیوٹی آج کہیں اور لگا دیتا ہوں اور کچھ معاملہ ہوا بھی تو میں سنبھال لوں گا، تمہیں کسی بھی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" افسر نے پچیس ہزار کی رقم میں سے اپنا حصہ نکال کر رکھ لیا۔

میں جب تھانے سے جانے لگا تو ایک بار پھر افسر نے میرے کندھے پر زور سے تھپکی دی۔

"پولیس والے ہو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن کوئی شکایت کرنے اس لئے نہیں آتا کہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ ان کی شکایت کا کوئی ازالہ نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ نئے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

میرے افسر نے سچ ہی کہا تھا واقعی وہ شخص میری شکایت کرنے نہیں پہنچا۔ اس نے صبر کر لیا تھا۔ اس کے نہ آنے پر میں بھی مطمئن ہو گیا تھا اور اپنی کارروائیوں کو ختم کرنے کے بجائے جاری رکھا۔

ایک سال گزرنے پر میری بیوی کے بچے کی ولادت ہوئی، میں بچے کو دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ بچہ ہو بہو ایسا ہی تھا۔ چند گھنٹے جی کر مر گیا۔ میں نے اس بات کا زیادہ نوٹس نہ لیا۔ جب دوسرا اور تیسرا بچہ بھی ایسا ہوا تو مجھے زبردست جھٹکا لگا اور میں نے اس شخص کی تلاش شروع کر دی کیونکہ مجھے اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس شخص نے مجھے بددعا دی ہے جبھی میرے گھر کے ایسے بچوں کی ولادت ہو رہی ہے۔

میں اس شخص سے اپنے کئے کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اسپتال سے اس شخص کا پتہ مجھے مل گیا اور یہ بھی معلومات ملی تھی کہ آپریشن میں تاخیر سے ہی اس شخص جس کا نام منور علی ہے اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ میں اس پتے پر پہنچا۔ وہاں وہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور اب وہ بیوی کے انتقال ہو جانے پر کرائے کا مکان خالی کر گیا تھا۔ کہاں گیا کسی کو کوئی خبر نہ تھی۔ میں اس شخص سے اپنے کئے کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کا دل دکھایا تھا۔ جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے کہ میرے ایسے بچے پیدا ہو رہے ہیں اور چند گھنٹے جی کر مر جاتے ہیں، یہ بچہ بھی دیکھ لینا چند گھنٹے سے زیادہ جی نہ سکے گا۔ کاش...... کاش وہ شخص منور علی مل جاتا میں اس کے پاؤں میں پڑ جاؤں گا، وہ جب تک مجھے معاف نہیں کرے گا میں اس کے پاؤں سے لپٹا رہا ہوں گا۔ وہ چاہے مجھے کتنی ہی ٹھوکریں کیوں نہ مارے، میں خوشی خوشی سہہ لوں گا۔ لیکن جب تک وہ مجھے معاف نہیں کرے گا میں اس کے قدموں سے دور نہیں ہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے تسلی دوں یا اسے احساس دلاؤں کہ تم بہت ظالم انسان ہو، نہ جانے کتنے اور ایسے لوگ ہوں گے جو اس کے ظلم کا شکار ہوئے ہوں گے جن کے بارے میں اسے پتا بھی نہیں ہے۔

منور علی کے بارے میں ہی معراج کو معلوم ہے اس لئے اسے ڈھونڈ کر معافی مانگنا چاہتا ہے۔

کانسٹیبل معراج نے بالکل درست کہا تھا وہ بچہ چند گھنٹے جی کر مر گیا تھا اور میں اس مردہ بچے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی نہ جانے کانسٹیبل معراج کی یہ سزا کب ختم ہوگی۔

امر پریم

آصفہ سراج-لاہور

دونوں سہیلیاں حالات اور واقعات سے بہت زیادہ دل برداشتہ تھیں، انھوں نے خودکشی کا فیصلہ کرلیا اور پھر وہ رات کے اندھیرے میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آگے بڑھیں کہ اچانک......

ایک عجیب و غریب انہونی بات جسے پڑھ کر قارئین خود فیصلہ کریں گے کہ کیا ایسا ممکن ہے

وہ تینوں آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھیں...... ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ بھی لیتی تھیں۔ تینوں بہت گہری سہیلیاں تھیں۔ چلتے چلتے اپنی منزل کے قریب پہنچ کر وہ تینوں رک گئیں...... اور ایک دوسرے پر نظر مرکوز کردیں اور پھر اسی خاموش ماحول میں کئی لمحے بیت گئے۔ ان کو آپس میں اس قدر لگاؤ تھا کہ اپنے اسی لگاؤ کو امر کرنے کے لئے وہ اس دہلیز پر جا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

موسم صبح سے ہی خراب تھا، بارش بھی وقفے وقفے سے ہو رہی تھی...... اچانک دور کہیں بجلی کڑکی تو وہ تینوں لرز کر رہ گئیں۔ وہ تینوں سہیلیاں شانتی، شیوانی اور پارو تھیں، آپس میں اس قدر پریم تھا کہ چاہتی تھیں کہ...... اس سنسار سے جانے کے بعد بھی ان کا پریم امر رہے۔ اور مر تیو ہو جانے کے بعد بھی ان کی آتماؤں کے سمبندھ باقی رہیں۔ اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ ہر سکھ

میں ہر دکھ میں۔ اسی لئے آج وہ مہا گیانی سادھو کی دہلیز پر پہنچ گئی تھیں۔

پارو کچھ زیادہ ہی جلد باز ہو رہی تھی جبکہ شانتی اور شیوانی ذرا چپ چپ سی تھیں۔ بات یہ نہیں تھی ایسا نہیں تھا وہ دونوں پارو سے پریم نہیں کرتی تھیں بلکہ اس حد تک جانے کا سوچ کر تھوڑی سی وحشت زدہ تھیں...... پریم تو ان تینوں میں بے مثال تھا...... سب لوگ ان کے پریم کی مثال دیا کرتے تھے۔

آج موسم کے تیور بہت خوفناک تھے۔ اندھیری رات...... سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے پڑے تھے۔ دور دور تک ان تینوں کو کوئی منش نظر نہیں آتا تھا۔ بس چلتے چلتے کبھی کسی بلی کے رونے کی آواز جسم میں کپکپی دوڑا دیتی۔ یا کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز حوصلہ پست کر دیتی...... بہرحال چلتے چلتے وہ تینوں اپنی منزل کے پاس پہنچ گئی تھیں...... مگر اب تک خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہی تھیں کہ اچانک دور کہیں بجلی گری۔ شیوانی کی جہاں چیخ نکلی...... وہیں پارو اور شانتی بھی لرز کر رہ گئیں۔ مگر حوصلہ کرتے ہوئے دروازے کو ہاتھ لگا دیا۔ دروازے کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ دروازہ چرر چرر کی آواز کے ساتھ خود بخود کھل گیا تو وہ تینوں اندر داخل ہو گئیں۔ اندر عجیب منظر تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں...... تو دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا...... چاروں طرف کالی ماتا، شیروں والی ماتا، ہنومان، بھگوان کرشن جی کی مورتیاں نصب تھیں۔ ایک چھوٹا سا آگ کا الاؤ روشن تھا۔ ایک سادھو کالی ماتا کی مورتی کے آگے گردن جھکائے موجود تھا۔ کالی ماتا کی مورتی کی آنکھوں میں ایک خوفناک قسم کی چمک تھی۔ ہاتھوں میں ترشول اور خنجر تھا۔ زبان باہر نکلی ایسی سرخ کہ جیسے کسی کا خون پیا ہو۔

بہرحال تھوڑی دیر میں سادھو نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر دیوی کو پرنام کیا...... اور پھر اٹھ کر اپنی گرجدار آواز میں بولا۔ "...... کیا بات ہے بالکو...... یہاں کیوں آئی ہو؟"

شانتی اور شیوانی...... تو ڈر ہی گئیں، سادھو کی لال لال آنکھیں دیکھ کر مگر پارو نے ہمت کی اور سادھو کو اپنی ساری سمسیا بتائی۔

"سوچ لو بالکو...... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے تم وچار کر کے دیکھو...... کہ شمشان میں چتا جلنے کے بعد بھی تمہاری آتمائیں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گی۔ یعنی اگر تم میں سے کسی کی بھی مرتیو ہو گئی تو اس کی آتما مرگھٹ میں نہیں بلکہ اوش ایک دوسرے کے ساتھ رہے گی...... کیا تمہیں ڈر نہیں لگے گا...... کہ تم اس سے بات کر رہی ہو، اس منش کے ساتھ چل رہی ہو جو اس سنسار میں نہیں ہے پرنتو تم چاہو بھی تو پھر اس سے چھٹکارا نہ پا سکو گی۔"

"نہیں سادھو مہاراج...... ہم اسی لئے یہاں آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہم پر اپنا شکتی شالی منتر کا جاپ کر کے ہمارے پریم کو امر کر دیجئے۔ جیتے جی تو ہم سب اکٹھے ہیں۔ اور ہم چاہتے بلکہ ہماری یہ اچھا ہے کہ پرلوک سدھارنے کے بعد بھی ہم اکٹھے رہیں۔ آپ چنتا نہ کریں اور اپنے جاپ کا ابھیوگ کریں۔" پارو نے کہا۔

"جیسے تمہاری اچھا......" سادھو نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنے شکتی شالی منتر کا جاپ کرنے لگا۔ جاپ کرنے کے دوران اس نے تینوں کے ہاتھ سے خون نکالا اور جاپ کا منتر پڑھتے ہوئے اسے اگنی میں ڈال دیا۔ منتر پورا ہونے کے بعد سادھو نے کہا۔ "اب تم تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لو......"

ان تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب تم لوگ اگنی کو ساکشی مان کر وچن لو کہ اس سنسار سے جانے کے بعد بھی تم لوگ ایک دوسرے سے ملتی رہو گی۔ ہر سکھ میں ہر دکھ میں ساتھ ساتھ رہو گی۔" سادھو نے کہا۔

"ہاں ہم لوگ وچن دیتے ہیں کہ ہر موڑ پر ایک دوسرے کی رکھشا کریں گے......" شانتی، شیوانی اور پارو ایک زبان ہو کر بولیں۔

کام ہو جانے کے بعد وہ تینوں خوشی خوشی گھر سے باہر نکلیں اور اپنے گھر کی طرف چل پڑیں...... ان تینوں کے گھر ایک ہی بلڈنگ میں تھے...... بلڈنگ کی سیڑھیاں

چڑھتے ہوئے وہ تینوں پھر رک گئیں...... پارو کہنے لگی۔ "یاد رکھنا آج سے ٹھیک 3 دن بعد 10 بجے یاد سے آ جانا۔" یہ کہہ کر تینوں اپنے اپنے گھر میں داخل ہو گئیں۔

☆......☆......☆

"اور سناؤ شوانی تم ٹھیک تو ہو نا۔" شانتی نے پوچھا۔

"ہاں تم کیسی ہو؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" شیوانی بولی۔ "پرنتو ایک بات تو بتاؤ۔"

"ہاں پوچھو۔" شانتی کے کہنے پر شیوانی کہنے لگی......

"سچ پوچھو تو مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارا پریم بہت ہے مگر مجھے یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے......" شیوانی کے کہنے پر شانتی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہو، پرنتو سنسار کا نیم ہے کہ ایک آتا ہے تو ایک چلا جاتا ہے۔ سب لوگ دنیا میں ہی پریم کرتے ہیں۔ پرنتو وہ لوگ سدا ساتھ ہمیشہ تھوڑی رہتے ہیں۔ یہ وچار تو تھوڑا الگ ہے...... یہ سچ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بہت پریم کرتے ہیں، ایک دوسرے کے بنا جینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔" شانتی کے کہنے پر شیوانی نے ایک سرد آہ بھری۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ گھور اپرادھ ہے۔" شیوانی نے جھرجھری لی۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو...... پریم اپنی جگہ مگر...... مگر...... آتما ہتھیا" وہ دونوں کانپ اٹھیں۔

"نہ بابا نہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے جب سنسار سے جائیں گے تب کی تب دیکھیں گے مگر اب کیوں اپنی زندگی کو روگ لگا لیں مرنے کا۔" شیوانی بولی۔

"ہاں میرے من میں بھی یہی بات تھی۔ بھگوان کی دی ہوئی سانسوں کو کیوں ٹھکرائیں......" سیوانی نے اطمینان کی سانس لی۔ وہیں شانتی کے چہرے پر بھی سکون پھیل گیا۔ "ٹھیک ہے پھر ہم دونوں مل کر پارو کو سمجھائیں گے، وہ بہت بیقرار ہو رہی ہے وہ جانتی نہیں ہے وہ کیا کرنے جا رہی ہے......"

☆......☆......☆

دوریاں دوستی بڑھاتی ہیں
دل کو دل کے قریب لاتی ہیں
کیا ہوا ہم جو بچھڑ جائیں گے
پھر بھی ہم دوستی نبھائیں گے

پارو گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ شانتی شیوانی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ "کیا ہوا تم دونوں کو کیوں گم صم ہو......" پارو نے ان دونوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"ہم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" شیوانی بولی۔ پارو کے دیکھنے پر سانتی نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ پارو کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟" پارو کے کہنے پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

ہمت کر کے شانتی بولی۔ "دیکھو پارو ہمیں غلط نہ سمجھنا ہمارا مطلب تھا کہ ہمارے پریم کے لئے کیا مرنا ضروری ہے...... زندگی ایشور کا دیا ہوا وردان ہے۔ آتما ہتھیا کرنے سے ہماری مکتی نہیں ہو پائے گی۔ بھگوان ہم سے ناراض ہوں گے۔"

پارو نے ان دونوں کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔ "ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر میں اپنے پریم کو آزمانا چاہتی ہوں...... اس دھرتی پر ایک نئی مثال قائم کرنا چاہتی ہوں۔ دوستی کی...... پیار کی...... قربانی کی......"

شیوانی اور شانتی نے ہر ممکن کوشش کی پارو کو سمجھانے کی مگر پارو نہ مانی...... "تم کیا سمجھتی ہو۔ میرا پریم جھوٹا ہے۔ دوستی فریب ہے...... میں اس سنسار کے سارے نیم بدل ڈالوں گی۔ سب ختم ہو جائے گا، باقی رہے گا تو صرف ہمارا پریم...... لوگ ہماری پریم کی مثال دیا کریں گے...... مثال دیں گے دوستی کی سچی دوستی کی......" پارو سمجھنے کی تمام حدوں سے نکل چکی تھی۔ وہ بیقراری کے عالم میں بولتی چلی گئی......

شانتی۔ شیوانی چپ چاپ اسے دیکھے گئیں۔

"لیلیٰ مجنوں...... ہیر رانجھا...... سوہنی ماہیوال۔

شیریں فرہاد...... کے بعد لوگ صرف ہمیں یاد رکھیں گے ہمارے پریم کو ہماری دوستی کو ہم اپنے پریم کر امر کر جائیں گے...... یہ امتحان ہم دیں گے اور یاد رکھنا تم دونوں کو بھی اس امتحان میں پورا اترنا ہے۔ کل رات 10 بجے میں تم دونوں کا انتظار کروں گی۔ یہ تمہاری دوستی کا امتحان ہے۔"
پارو یہ سب کچھ کہہ کر چلی گئی اور شانتی شیوانی دونوں سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کو تکنے لگیں......

بالآخر چپ ٹوٹی اور شانتی بولی...... "پارو تو پاگل ہو چکی ہے۔ چلو اسے چل کر سمجھاتے ہیں۔ کہیں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔"

"نہیں شیوانی اس وقت وہ جنون میں ہے، وہ کچھ نہیں سمجھے گی، مگر ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اسے روکنے کے لئے، یہ سراسر پاگل پن ہے، وہ دیوانی ہو گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر کل بات کریں گے۔" شانتی نے کہا۔ اور اپنے فلیٹ کی طرف چل پڑی۔

☆......☆......☆

رات کے ٹھیک 10 بجے تھے، تینوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر جا رہی تھیں، خاموشی سے، شانتی اور شیوانی کچھ بولنے کی کوشش کرتیں تو پارو انہیں چپ کروا دیتی، اسی خاموشی سے چلتے چلتے وہ دسویں منزل پر بنے ٹیرس پر جا کر کھڑی ہو گئیں۔ پارو ان دونوں کو سمجھاتی رہی "کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوتا، بس تم لوگ تھوڑی سی ہمت کرو پھر ہم سب ہمیشہ کے لئے ساتھ رہیں گے۔ گھبراؤ نہیں......"

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں...... "چلو گنتی شروع کرتی ہوں، میں تین تک گنوں گی، گنتی پوری ہوتے ہی ہم تینوں یہاں سے نیچے چھلانگ لگائیں گے۔"

گنتی شروع کی...... ایک...... ٹک ٹک ٹک......

گھڑی جو کہ پارو نے پہنی تھی۔ وہ ایسے زور سے ٹک ٹک کرنے لگی جیسے وہ بھی پارو کے ساتھ گنتی گن رہی ہو۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ شیوانی اور شانتی کے دل بھی لرز رہے تھے...... دو...... پارو نے دو بھی گن لیا اور پھر شیوانی اور شانتی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتیں...... پارو کی آواز آئی...... تین......

وہ دونوں یکدم چیخ اٹھیں۔ "پارو......" مگر پارو نے تین گنتے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔

شانتی اور شیوانی نے جلدی سے ہاتھ آگے کیے کہ پارو کا ہاتھ پکڑ لیں گی...... مگر...... مگر ان کے ہاتھ خالی ہی رہ گئے اور پارو نیچے گرتی چلی گئی...... گرتے گرتے پارو انہیں خالی نظروں سے دیکھتی رہی...... ان نظروں میں بہت کچھ تھا...... دکھ...... غصہ...... وہ دونوں دیکھتی ہی رہ گئیں اور پارو ان کی نظروں کے سامنے ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

وہ سکتے میں آ گئیں...... دیکھتے ہی دیکھتے نیچے بھیڑ لگ گئی۔ یکدم شیوانی کو ہوش آیا اور پھر وہ شانتی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگی۔ اور بھاگتی رہی...... اس نے اپنے فلیٹ میں آ کر دم لیا۔

آدھا گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ ان کی مائیں گھبرائی ہوئی آئیں۔ "شانتی...... شانتی...... شیوانی...... پارو...... پارو......" کہتے کہتے ان کی آواز بھرانے لگی۔

"کیا...... کیا ہوا پارو کو ماں؟" شیوانی جو کہ اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ بولی۔ "پارو...... پارو نے آتما ہتھیا کر لی ہے۔"

"کیا؟" شیوانی بولی۔

"ہاں پارو نے آتما ہتھیا کر لی ہے۔"

وہ دونوں دھاڑیں مار مار کر رو پڑیں...... آخر ان کی پیاری دوست تھی پارو، کچھ بھی تھا، پارو کی جان ان کی وجہ سے گئی تھی، کیا تھا اگر وہ اس کو سمجھاتیں...... اسے اس کی نادانی سے روکنے کی کوشش کرتیں...... رو رو کر ان کے دل کا غبار نکلنے لگا۔ وہ نیچے اتر کر پاؤں کے فلیٹ میں آ گئیں۔ پارو کی لاش دیکھ کر ان کے کلیجے پھٹنے لگے۔

پولیس بھی آ چکی تھی۔ انہیں جب پتہ چلا کہ شیوانی اور شانتی پارو کی دوست تھیں۔ تو انہوں نے ان سے بھی طرح طرح کے سوالات کیے جس کے جوابات انہوں نے سوچ سمجھ کر دیئے...... پولیس نے اچھی طرح چھان بین کی...... اور اچھی طرح مطمئن ہو کر چلی گئی۔

دن بہت اداس اور بے کیف گزرنے لگے۔

ہر گزرتا دن شیوانی اور شانتی کیلئے اداسی لے کر آتا۔ انہیں پارو بہت یاد آتی۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ انہیں تڑپا دیتا۔ انہیں پارو کو کھونے کا بہت صدمہ تھا۔ ان دونوں کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ دونوں اکثر اکٹھی ہی اس جگہ بیٹھی رہتیں جہاں وہ تینوں بیٹھا کرتی تھیں۔ ان کی نگاہیں دور کہیں بھٹک رہی ہوتیں، ذہن کہیں اور ہی رہتا، انہیں رہ رہ کر پارو سے آخری ملاقات یاد آتی...... اس دن بھی وہ دونوں سیڑھیوں کی ریلنگ کو پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں جب انہیں پارو کی آواز سنائی دی......

کیا امیری ہے کیا غریبی ہے
ہم ملے اپنی خوش نصیبی ہے
سب کی آنکھوں میں اک سوال ہیں ہم
دوستی کی نئی مثال ہیں ہم
ٹھوکریں کھا کے مسکرائیں گے
پھر بھی ہم دوستی نبھائیں گے

وہ دونوں یوں اچھل پڑیں جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو، دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر پیچھے دیکھا...... تو انہیں لگا جیسے ان کی سانس رک جائے گی، کیونکہ ان سے کچھ فاصلے پر پارو کھڑی تھی۔ "پ، پ، پا...... پا...... پ...... پارو تم۔" شیوانی ہکلانے لگی۔

شانتی کی بھی سٹی گم ہو چکی تھی۔ وہ بھی یک ٹک پارو کو دیکھنے لگی۔ جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی...... سفید لباس میں پارو بہت بھلی لگ رہی تھی...... پھر پارو ان دونوں کے قریب آنے لگی تو وہ دونوں لاشعوری طور پر پیچھے کی طرف کھسکنے لگیں۔

اچانک پارو ہنسنے لگی اور پھر ہنستے ہی چلی گئی۔ "کیا ہوا ڈر گئیں تم دونوں، تم تو میری دوست ہو نا، ہم تینوں نے تو سوگند کھائی تھی نا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے، پھر کیا ہوا۔ میں نے اپنا وچن نبھایا...... اب میں تم دونوں کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

پارو کے کہنے کی دیر تھی کہ شیوانی اور شانتی دونوں بھاگنے لگیں، وہ بہت بدحواس ہو رہی تھیں، بھاگتے بھاگتے دونوں اپنے فلیٹ میں چلی گئیں۔

"کیا ہوا شانتی، شیوانی، تم دونوں گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو۔" شانتی کی ماں فلیٹ میں داخل ہوئی۔

"کک...... ک...... کک، کچھ نہیں ماں، کچھ بھی تو نہیں۔" شانتی بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم دونوں کو پارو کا بہت صدمہ ہے مگر بیٹا جانے والوں کے ساتھ تو جایا نہیں جاتا، تم کو جینا ہے زندہ رہنا ہے جو اس سنسار میں آیا ہے اسے لوٹ جانا ہے، کسی کو جلدی تو کسی کو دیر میں مگر جانا تو ہے ناں، یہی ریت ہے، یہی نیم ہے، یہی جیون کا فسانہ ہے، تمہیں اپنا دل لگانا ہو گا، کچھ تو بولا کرو ہنسا کرو...... اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کرو۔" شانتی کی ماں بولتی چلی گئی۔

شیوانی اور شانتی چپ سادھے ساری باتیں سنتی رہیں...... پھر کچھ دیر بعد وہ پرسکون ہو گئیں۔

مگر انہیں روز بروز پارو کی یاد ستانے لگی۔ وہ اداس اداس رہنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی، اکثر وہ پشیمان رہنے لگیں...... جب بھی انہیں پارو کی یاد ستاتی...... وہ رو پڑتیں، کچھ بھی تھا پارو ان سے دوستی میں آگے نکل گئی تھی، انہیں اب خود پر ملال تھا۔

اس دن بھی شیوانی اور شانتی باتیں کر رہی تھیں کہ پارو کی آتما ظاہر ہو گئی، اسے دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئیں، ان کی گھبراہٹ دیکھ کر پارو نے زوردار قہقہہ لگایا اور ہنسنے لگی۔ "ہاہا...... ہاہاہا...... تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تم دونوں کا ساتھ چھوڑ دوں گی، نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، تم دونوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ میرے ساتھ چھل کیا ہے مگر میں اپنی دوستی پوری نبھاؤں گی، میں تم دونوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گی سچ کہہ رہی ہوں۔"

پارو کی بات سن کر ان دونوں کے رنگ اڑ گئے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے پارو کی آتما غائب ہو گئی۔ مگر اب یہ روز کی بات ہو گئی تھی، کبھی اکیلے میں اور کبھی ان دونوں کے سامنے پارو کی آتما ظاہر ہو جاتی، وہ بہت غصے میں ہوتی، اس کا کہنا تھا کہ "تم دونوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔"

وہ دونوں اندر ہی اندر گھٹنے لگیں...... دل ہی دل میں خوفزدہ تھیں، پارو کی آتما ان دونوں کے علاوہ کسی کو نظر

نہیں آتی تھی۔ اس لئے وہ پارو کے بارے میں کسی سے بات بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

شیوانی اور شانتی دونوں کی زندگی میں مشکل آچکی تھی۔ ان دونوں کی حالت اس وقت بالکل ویسے ہی تھی جسے نہ نگلا جائے نہ اگلا جائے روز روز کی ٹینشن سے وہ دونوں پریشان تھیں اور اپنا سکون کھوتی چلی جارہی تھیں پھر ایک دن وہ دونوں اکٹھی بیٹھی پارو کے بارے میں باتیں کرنے لگیں، بات سے بات نکلتی چلی گئی پھر انہیں احساس ہوا کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں ان دونوں کی غلطی زیادہ تھی، انہیں اس سادھو کے پاس جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اگر چلی ہی گئی تھیں تو جو وچن انہوں نے لیا تھا اسے پورا کرنا چاہئے تھا۔ جیسے کہ پارو نے کیا تھا بے شک ان تینوں میں پارو زیادہ جذباتی تھی...... مگر پیار تو تینوں میں ایک ہی جیسا تھا اگر پارو ان کے لئے جان دے سکتی تھی تو وہ دونوں بھی تو اس سے اتنا ہی پیار کرتی تھیں کہ پارو کے لئے جان دے سکتی تھیں۔ مگر جو کچھ ہوا تھا بالکل اچانک ہوا تھا کہ جس سے وہ دونوں بوکھلا کے رہ گئی تھیں مگر اب شیوانی اور شانتی کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا اور وہ اپنی غلطی کو سدھارنے کے لئے تیار ہوگئی تھیں......

اے میرے دوست میری جان ہے تو
سارے جگ میں میری پہچان ہے تو
جان و دل تجھ پہ وار جائیں گے
پھر بھی ہم دوستی نبھائیں گے

رات کا وقت تھا دور دور تک سناٹا، لوگ اپنے فلیٹوں میں سو رہے تھے شیوانی اور شانتی دونوں اسی ٹیرس پر کھڑی تھیں، جہاں سے پارو نے چھلانگ لگائی تھی...... اور وہ دونوں چھلانگ لگانے ہی والی تھیں کہ انہیں اپنے پیچھے سے پارو کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں...... اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، اچانک پارو کی آواز سنائی دی۔ "شیوانی، شانتی کیا کررہی ہو تم دونوں۔"

دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پارو کی آتما انہیں ہی دیکھ رہی تھی......

"وہی جو تم چاہتی تھی، ہم دونوں اپنا وچن نبھا رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہم سے غلطی ہوئی ہے اور اب ہم اسی غلطی کو سدھار رہے ہیں۔" یہ کہہ کر شیوانی اور شانتی نے اپنی طرف سے چھلانگ لگادی مگر، مگر یہ کیا؟ ان دونوں کو کسی نے پیچھے کی طرف کھینچ لیا......

یہ دیکھ کر انہیں بہت اچنبھا ہوا کہ انہیں بچانے والی کوئی اور نہیں ان کی دوست پارو تھی...... "غلطی صرف تم سے ہی نہیں مجھ سے بھی ہوئی تھی...... تم دونوں نے تو مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی، میں ہی پاگل تھی جو سمجھ ہی نہ سکی کہ دوستی کی آزمائش کا یہ کون سا طریقہ ہے، اپنی دوستی تو ہم لوگ اکٹھے رہ کر بھی نبھا سکتے تھے، دوستی کے لئے مرنا ضروری نہیں، پہلے مجھے غصہ تھا، میں سمجھی تھی کہ تم مجھ سے دوستی نہیں نبھا سکیں...... اس لئے تم دونوں کو دوستی کا احساس دلانے کے لئے تم دونوں کو ڈراتی رہی۔" پارو نے کہا۔ "مگر اب مجھے بھی احساس ہوگیا ہے کہ تم دونوں بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہو، تمہیں مرنا نہیں ہے بلکہ تم دونوں کو زندہ رہ کر اپنی دوستی نبھانی ہے، میں بہت خوش ہوں، اب میں جارہی ہوں۔" یہ کہہ کر پارو کی آتما غائب ہوگئی......

شانتی اور شیوانی کے من سے بہت بڑا بوجھ ختم ہوگیا اور وہ شانت ہوگئیں، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر گئیں اور ایک دوسرے سے وعدہ کرلیا کہ ایسے دوستی نبھائیں گی جیسے کہ پارو چاہتی تھی...... اور پھر وہ دونوں مسکرا اٹھیں......

اگلے دن انہوں نے اپنے فلیٹ میں پارو کی آتما کی شانتی کے لئے پوجا رکھوائی، سب لوگ پوجا میں مصروف تھے، شانتی اور شیوانی دونوں پارو کی ہار چڑھی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھنے لگیں کہ انہیں محسوس ہوا کہ پارو نے انہیں دیکھ کر پلکیں جھپکائی ہوں، وہ اور غور سے دیکھنے لگیں پھر اچانک انہوں نے یونہی ذرا سائیڈ پر دیکھا...... تو دیکھا؟ کہ پارو ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ پارو نے مر کر بھی اپنا وچن نبھایا تھا۔ اپنی دوستی نبھائی تھی، اور یہ سچ کر دکھایا تھا کہ مر کر بھی اپنی دوستی نبھائیں گی ساتھ ساتھ رہیں گی......

پھر وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

☠

موت کی جیت

ایس امتیاز احمد - کراچی

ہال کے چبوترے پر لیٹا ہوا مردہ اچانک اٹھ بیٹھا، اس کی گردن سے اس کا سرا جدا تھا، اس نے فرش پر اپنے قدم رکھے اور پھر چشم زدن میں اس نے پاس کھڑی خوبرو لڑکی کو دبوچ لیا کہ اتنے میں پھر......

صدیوں پرانی چاہت وخلوص کی عکاسی کرتی ایک عجیب ودلگداز دلفریب حقیقت

وہ جس وقت سے میوزیم سے ہوکر آئی تھی۔ اس کا ذہن عجیب بے چینی میں مبتلا تھا۔ میوزیم میں اس نے ایک ایسی انہونی بات محسوس کی تھی کہ وہ خود پر قابو نہ پاسکی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے! ایک ایسی شخصیت جس کی موت کو قریباً چار ہزار سال گزر چکے تھے۔ اسے کیسے جانی پہچانی محسوس ہوئی؟ ممکن ہے اس نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہو جس کی شکل وصورت میوزیم میں رکھی ہوئی ممی سے ہو بہو ملتی جلتی ہو؟ لیکن کب اور کہاں اس نے ایسے شخص کو دیکھا تھا۔

وہ بے چینی کے ساتھ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی اور پھر صوفے پر بیٹھ کر اس نے ان تمام لوگوں کی شکلوں کو اپنے ذہن میں لانا شروع کیا جو اس کے واقف کار تھے یا جنہیں وہ اکثر و بیشتر دیکھتی رہتی تھی۔ اس کے گھر

کے لوگ اس کے دوست، یونیورسٹی میں اس کے کلاس فیلو، اور اس کے علاوہ اسے پڑھانے والے استاد؟ لیکن کوئی بھی شکل ایسی نہ تھی جو میوزیم والی ممی سے تھوڑی بہت بھی مشابہت رکھتی ہو۔ پھر وہ کون تھا؟ اس کے چہرے کو دیکھ کر وہ یک دم ٹھٹک کیوں گئی تھی؟

صبح کے وقت جب وہ اپنے مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں مصری عجائب گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نظر ایک ایسی ممی پر پڑی جو وہاں رکھی ہوئی سب چیزوں سے نمایاں اور الگ نظر آرہی تھی۔ وہ فراعنہ مصر کے زمانے کے ایک کاہن کی ممی تھی۔ جس کا سر اور تن الگ الگ ایک اونچی جگہ پر رکھے ہوئے تھے۔ کاہن کا گرانڈیل جسم ایک سرخ رنگ کے جبے میں لپٹا ہوا تھا۔ گردن کے گرد سبز رنگ کی ایک ریشمی شال تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر اس کا سر ایک بڑے طشت کے درمیان قرینے سے رکھا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی خوب صورت داڑھی بڑی بڑی کنول کی سی آنکھیں اور گورا چٹا رنگ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کاہن کی ممی کے قریب پہنچی۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک نامعلوم سی کشش اسے اس ممی کی طرف کھینچ رہی ہے۔

وہ جونہی اس کے قریب پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ کاہن کی بڑی بڑی آنکھوں میں زندگی ہے اور وہ اسے بڑے غور سے تک رہی ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ان آنکھوں میں ہلکی سی حرکت بھی دیکھی تھی۔ جیسے وہ آنکھیں پلک جھپکی بھی ہوں۔ اور پھر۔ اس نے کٹے ہوئے سر کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ بھی دیکھی جس میں نہ جانے کتنے ہی بھید چھپے ہوں۔ وہ یک دم ٹھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے شدت سے یہ محسوس کیا کہ وہ چہرہ اس نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔ وہ اسے جانتی ہے اور شاید اسے پسند بھی کرتی ہے۔ لیکن وہ ہے کون؟ اسے اپنے قریب قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ اس نے یک دم پلٹ کر دیکھا۔ اس کے قریب ہی میوزیم کا گائیڈ کھڑا تھا۔

"مس...... اس ممی میں آپ کی گہری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا ضرور چاہتی ہوں گی۔" اس نے بڑے ادب سے کہا۔

وہ قدرے چونک گئی اور بولی۔ "ہاں۔ میں جاننا چاہتی ہوں...... کہ...... یہ کس کی ممی ہے؟"

"یہ کاہن طامس ہے جو شہنشاہ اخناطون کے زمانے میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ یہ بڑی پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ لیکن ایک روز شہنشاہ اخناطون اس سے خفا ہوگیا اور اسے اپنے سامنے قتل کروا کر اس کی لاش اور سر کو چورستے میں لٹکا دیا تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ اور آج بھی کاہن طامس کی لاش اپنے کٹے ہوئے سر کے ساتھ اس میوزیم میں اس دور کی یاد ہے۔"

"لیکن۔ کس جرم کی بنا پر اتنے بڑے کاہن کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا؟" اس نے سوال کیا۔

"اس معاملہ میں یونانی تاریخ خاموش ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسا راز ہو جسے صرف کاہن طامس اور شہنشاہ اخناطون کے علاوہ کوئی تیسرا شخص نہ جانتا ہو اور طامس کی موت کے ساتھ ہی وہ راز بھی ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا ہو۔"

اس کی نظر ایک مرتبہ پھر ممی کے سر کی طرف گئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی اب اس ممی کے ہونٹ غصے سے بھینچے ہوئے تھے اور پیشانی پر کئی سلوٹیں نمودار ہوچکی تھیں۔ آنکھوں کی چمک غصے کی لالی میں تبدیلی ہوچکی تھی۔ وہ یک دم وہاں سے پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی میوزیم سے باہر نکل گئی۔

تمام دن وہ اس سر کٹی ممی کے بارے میں سوچتی رہی۔ آخر وہ کیا راز تھا جو کاہن طامس کی موت کا سبب بنا؟ پھر شہنشاہ اخناطون اس کی لاش اور کٹے ہوئے سر کو چورستے میں لٹکا کر اپنے لوگوں کو کون سی عبرت دلانا چاہتا تھا۔ لوگوں کو تو یہ علم ہی نہیں ہوگا کہ طامس کو کس جرم کی اتنی بڑی سزا دی گئی تھی، پھر وہ عبرت کس بات سے حاصل کرتے! وہ یک دم چونکی۔

اگر اسے وہ راز معلوم ہو جائے تو اس کا مقالہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہوگا، وہ تاریخ کے ایسے سربستہ راز سے پردہ اٹھا دے گی جس پر چار ہزار سال پرانی گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

کاہن کے کٹے ہوئے سر میں چند ہی لمحوں میں جو اس نے تبدیلیاں دیکھی تھیں ان سے یہ بات ظاہر تھی کہ چار ہزار سال بعد بھی اس میں کوئی غیر مرئی قوت موجود ہے۔ اپنے دور کا وہ یقیناً ایک بہت بڑا انسان ہوگا۔ شہنشاہ اخناطون نے اس کی شہرت اور قابلیت سے جل کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔

اس کا جی چاہا کہ وہ ایک مرتبہ پھر جا کر اس ممی کو غور سے دیکھے۔ لیکن خوف اور دہشت نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ کانپ گئی اور اسے پسینہ آگیا۔

اپنے کمرے میں اسے شدید گھٹن کا احسان ہوا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکیوں کو کھولنا چاہا تو اس نے دیکھا کہ وہ سب پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر یک دم کمرے سے باہر نکل آئی اور کوٹھی کے باہر لان میں گھومنے لگی۔ شام ہوچکی تھی۔ ہر طرف بجلی کے قمقمے روشن ہوچکے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف اس نے دیکھا۔ وہ ابھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ یک دم نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر اسے بڑی فرحت محسوس ہوئی اور وہ بے اختیار ہو کر گھاس پر ہی لیٹ گئی۔

نہ جانے وہ کب تک وہاں لیٹی رہی۔ اس کے نزدیک جھینگروں کی مسلسل آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن ان سب سے بے نیاز اس کا دھیان کاہن طامس کی ممی کی طرف تھا۔ اس نے یک دم اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا گویا وہ ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ جھینگروں کی تیز تیز آوازیں اب اسے بڑی ناگوار محسوس ہوئیں اور وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

اس کے کمرے کا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا اور اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اپنے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے کچھ خوف محسوس ہوا۔ دروازے کے قریب قدرے رکی اور پھر اپنی بزدلی پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ آخر یہ اسی کا کمرہ تو تھا جہاں وہ آکر مکمل سکون محسوس کرتی تھی۔ اپنے ہی کمرے سے خوف کس بات کا؟

وہ چلتی ہوئی سوئچ بورڈ کے قریب پہنچی۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اسے صحیح طور پر اندازہ تھا کہ سوئچ بورڈ کس جگہ پر ہے۔ سوئچ بورڈ کے قریب پہنچ کر جب اس نے بجلی آن کرنے کے لئے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے کیوں اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے اندھیرے میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ اسے پہچاننے میں ہرگز دقت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ اسی کاہن طامس کی آنکھیں تھیں۔ اس نے گھبرا کر فوراً سوئچ دبا دیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر انتہائی پریشان ہوئی کہ کمرے میں روشنی نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اسے اپنے کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر جیسے تاریکی میں کوئی اس کی طرف بڑھنے لگا۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ خوفزدہ ہو کر دیوار سے جا لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کمرے میں جیسے طوفان آگیا ہو۔ میز پر رکھے ہوئے تمام کاغذات اڑ اڑ کر کمرے میں بکھر گئے۔ کسی نے اس کے چہرے پر دھپ کے ساتھ اپنا ہاتھ رکھ دیا تو اس کی چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔

اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے چچا اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس کی پرورش اس کے چچا نے ہی کی تھی۔ چچی کے فوت ہونے کے بعد اس کے چچا نے اسے باپ بن کر ہی نہیں بلکہ ماں بن کر پالا تھا۔ اسے پڑھا لکھا کر اعلیٰ تعلیم بھی دلائی تھی۔ وہ اب ایم اے کے بعد ہسٹری میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ تمام قوموں کی تاریخ میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی مصری تاریخ سے

تھی فراعنہ مصر کے عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات پڑھ کر وہ بڑی خوش ہوتی تھی۔ ان واقعات کو پڑھتے وقت وہ بالکل اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے وہ ایک ننھی منی بچی ہے اور اس کی دادی اماں اسے جنوں اور پریوں کی کوئی دلچسپ اور حیرت انگیز کہانی سنا رہی ہیں۔

مصری تاریخ کی ریسرچ کے سلسلے میں ہی اسے مصر آنا پڑا۔ اس کے دادا مرحوم اسے بتایا کرتے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی مصر سے ہی ہندوستان آئے تھے۔

مصر میں اس کے چچا کے ایک گہرے دوست اب بھی موجود تھے۔ اس لئے انہیں یہاں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اس کے چچا کے دوست نے ان دونوں کو اپنی کوٹھی کا ایک الگ حصہ رہائش کے لئے دے دیا تھا۔ وہ دن بھر مصر کے اہرام میں گھومتی اور پھر اپنے کمرے میں آ کر اپنا مقالہ مکمل کرتی رہتی۔ اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہوگیا تھا۔ اور اسے اپنے کمرے سے ایک گونا گوں محبت ہوگئی تھی۔ وہ دن بھر گھومنے پھرنے کے بعد جب اپنے کمرے میں پہنچتی تو اسے بے حد اطمینان محسوس ہوتا۔

اس نے یک دم آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی اور ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ موجود تھی۔ یقیناً اس نے رات کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اس نے سوچا۔

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹی؟" اس کے چچا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا میری طبیعت کو؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

اس کے چچا نے متفکرانہ انداز سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔ "کل رات تمہاری چیخ کی آواز سن کر میں جب بھاگم بھاگ تمہارے کمرے میں پہنچا تو اندر مکمل تاریکی تھی اور کمرے کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ میں نے بتی جلائی تو عجیب منظر دیکھا۔ پنکھے کی تیز ہوا کی وجہ سے میز پر رکھے ہوئے تمہارے مقالے کے تمام کاغذات اڑ کر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور تم دیوار سے پشت لگائے بے ہوش پڑی تھیں۔ تمہارے چہرے کے اوپر بھی ایک بڑا کاغذ چپکا ہوا تھا۔ جس نے تمہارا پورا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔"

☆......☆......☆

وہ دن بھر اپنا مقالہ لکھنے میں مصروف رہی۔ لیکن شام کو جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی کہ اس نے پورے پندرہ صفحات میں کاہن طامس کی مردانہ حسن اور جوانی کی تعریف کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا تھا۔ اپنے ذہن میں کاہن طامس کی وجاہت و عظمت کی چھپی ہوئی تصویر غیر ارادی طور پر وہ کاغذ پر منتقل کر چکی تھی۔ اس نے جھلا کر تمام کاغذات کو ریزہ ریزہ کر ڈالا اور پھر انہیں آتش دان میں پھینک دیا۔ "آخر یہ کاہن طامس جسے قتل ہوئے چار ہزار سال گزر چکے تھے۔ اس کے ذہن پر اس بری طرح کیوں سوار ہوگیا تھا۔ اس میں آخر ایسی کون سی کشش تھی جو اسے بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔"

وہ اب اکثر اوقات پریشان رہنے لگی۔ چہرے کی سرخی زردی میں تبدیل ہونے لگی اور صحت مند جسم لاغر ہونے لگا تھا۔ اس کے سر میں ہر وقت ہلکا ہلکا سا درد رہنے لگا اور وہ بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتی۔ رات کے وقت اکثر نامعلوم سے الفاظ بڑبڑاتی رہتی اس وجہ سے اس کے چچا کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ کئی ایک ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ لیکن کوئی بھی اس کے مرض کی صحیح تشخیص نہ کر سکا۔ آخر ایک روز اس کے چچا نے بڑے پیار سے اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔

"بیٹی۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہاری کن مصیبتوں سے پرورش کی ہے۔ تم میری زندگی کی واحد امید ہو۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق تمہیں کوئی مرض نہیں ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم روز بروز گھلتی جا رہی ہو۔ بیٹی میں تمہارا چچا ہی نہیں تمہارا ہمدرد دوست بھی ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ تمہیں آخر ایسا کون سا دکھ ہے جو

تمہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے، مجھے بتاؤ تمہارے اس دکھ کا آخر علاج کیا ہے؟" اور اس کے چچا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

چچا کی حالت دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوا اور وہ بولی۔ "چچا جان مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں تو خود حیران ہوں کہ مجھے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے؟"

"تم رات کو اکثر کچھ الفاظ بڑبڑاتی ہو۔ کیا تمہیں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں؟" اس کے چچا نے اسے کریدا۔

"ڈراؤنے خواب؟" اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ "وہ خواب نہیں ہوتے چچا جان۔"

"تو پھر کیا ہے؟" چچا نے سوال کیا۔

"کوئی شخص ہر روز مجھے آ کر کہتا ہے کہ تمہیں تمہارا محبوب بلا رہا ہے۔ وہ اپنے خوب صورت محل میں تمہارا منتظر ہے تم میرے ساتھ چلو۔ لیکن میں اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی ہوں۔ وہ ضد کرتا ہے تو میں اسے شدت سے جھڑک دیتی ہوں، وہ منت سماجت کرتا ہے لیکن میں کوئی پروا نہیں کرتی۔ آخر وہ مایوس ہو کر کہتا ہے۔ ایک روز تمہیں آنا پڑے گا۔ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ تمہیں ایک روز ضرور اپنے ساتھ لے جائے گا۔ کیونکہ اس نے تمہیں حاصل کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

میں چیخ اٹھتی ہوں۔ "نکل جاؤ یہاں سے میں کسی کو نہیں جانتی۔"

اس کا چچا بغور اس کے چہرے کو تکتا رہا اور اچانک پوچھا۔ "کون ہے وہ جو اپنے خوب صورت محل میں تمہارا انتظار کر رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" وہ بولی اور پھر چچا سے سوال کیا۔ "چچا جان۔ یہ کاہن طامس کون ہے؟"

"کاہن طامس؟" اس کے چچا کا چہرہ یک دم زرد ہوگیا اور خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ "بیٹی یہ ایک بدروح کا نام ہے۔ اپنے بزرگوں سے میں نے سنا

ہے کہ وہ شہنشاہ اخناطون کے زمانے میں ایک عبادت گاہ میں کاہن تھا۔ بہت سی بدروحیں اس کے قبضے میں تھیں۔ وہ ان بدروحوں کے ذریعے مصر کی ہر اس خوب صورت اور جوان لڑکی کو اپنی عبادت گاہ میں بلالیتا تھا۔ جسے وہ پسند کرلیتا تھا، شہنشاہ اخناطون نے اسے قتل کرواکر اس کی لاش چوراہے پر لٹکوادی تھی۔ لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟!"

"میں نے اس کی ممی یہاں میوزیم میں دیکھی ہے، اس کی شکل وصورت دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ شہنشاہ اخناطون نے اسے کسی اور وجہ سے قتل کروایا ہوگا۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔ گفتگو کرتے وقت اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"لیکن بیٹی" اس کا چچا پریشان ہوگیا۔ "مصر کی تاریخ اور ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں اس کے بارے میں وہی انکشاف کیا ہے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں چچا جان۔ اس کا کٹا ہوا سر دیکھ کر مجھے خوف ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے چہرے پر جو معصومیت ہے اور اس کی آنکھوں میں جو محبت کی چمک ہے وہ مجھے بار بار اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

"بیٹی!!!" اس کا چچا جیسے چیخ اٹھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ایک شیطان کے چہرے پر معصومیت کا کیا سوال! اور ایک بدروح کی آنکھوں میں محبت کی چمک کے کیا معنی؟ ضرور تم پر اس بدروح کا اثر ہوگیا ہے۔" وہ زار وقطار روتے ہوئے چیخے۔ "وہ تمہیں ہم سے چھین لینا چاہتا ہے۔ میری بچی۔ خدا کے لئے تم اس شیطان کا خیال اپنے دل سے نکال پھینکو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ تمہارا باپ اور تمہارے آباؤ اجداد کی روحیں تم سے خفا ہوجائیں گی۔" وہ بغور اپنے چچا کی حالت کو دیکھتی رہی وہ اس کے سامنے رو رو کر بری طرح گڑگڑا رہے تھے۔

"میں تو اپنے مقالے کے لئے صرف وہ راز جاننا چاہتی ہوں جو کاہن طامس کے قتل کا باعث بنا۔ ورنہ مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنا مقالہ ادھورا چھوڑ دوں تو میں۔"

"کاہن طامس کے قتل کا باعث وہی ہے جو تاریخ میں لکھا ہے۔ تم اپنے مقالے میں بھی وہی کچھ لکھو۔ اور اب میں اس جگہ ایک پل بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ میں آج اور اسی وقت یہاں سے واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔ تم فوراً تیاری مکمل کرلو۔" اس کے چچا جلدی جلدی بولے۔

"یہاں سے جانا چاہتے ہیں آپ؟" وہ بڑبڑائی۔ پھر جیسے کسی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

"ٹھیک ہے چچا جان ہمیں یہ جگہ چھوڑ ہی دینی چاہئے۔" اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے پاؤں اپنے ہاتھوں سے سہلا رہا ہے پھر اس نے محسوس کیا کہ آنسو کے دو قطرے ٹپک کر اس کے پاؤں پر گرے اور کوئی اپنے گال اس کے پاؤں کے ساتھ رگڑ رہا ہے۔ کوئی اس سے رک جانے کی التجا کررہا تھا۔ لیکن کون؟ اس انوکھے لمس نے اس کے پاؤں میں گویا زنجیر ڈال دی۔ وہ یہاں سے کیسے جاسکتی ہے؟

"میں صرف آج کی رات اور رکنا چاہتی ہوں۔ کل صبح ہم یہاں سے ضرور چلے جائیں گے۔" وہ اپنے چچا سے بولی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن کل صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی ہم اس منحوس جگہ سے دور ہوں گے۔ تم آرام کرو، میں کل صبح کے جہاز سے واپسی کے لئے ٹکٹوں کا انتظام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس کے چچا کمرے سے باہر چلے گئے۔

دو قطرے اس کے پاؤں پر اور ٹپکے۔ اور کسی نے اس کے پاؤں چھوڑ دیئے، یہ اس کی شکر گزاری کی علامت تھی۔

رات ہوتے ہی وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش کا شکار ہوگئی۔ وہ یہاں سے جانا ضرور چاہتی تھی۔ لیکن اس کا دل نہ جانے کیوں مٹھی میں آیا جارہا تھا۔

آج کاہن طامس کا کٹا ہوا سر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آکر غائب ہوجاتا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جارہی تھی کہ آخر اس کی اپنی ذات کا اس سر کٹے کاہن سے کیا تعلق ہوسکتا ہے جسے مرے ہوئے بھی چار ہزار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے چچا سے یہ کہہ چکی تھی کہ وہ کل صبح اس جگہ کو چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن۔ کیا کل صبح وہ یہاں سے جاسکے گی؟ اور اگر وہ یہاں سے چلی گئی تو پھر کبھی کاہن طامس کا خوب صورت وجود جو صدیوں سے بے جان پڑا تھا نہ دیکھ سکے گی۔

آخر اس صدیوں پرانی ممی میں ایسی کون سی بات ہے کہ وہ اس کے لئے دیوانی ہوئی جارہی ہے۔ اس کے چچا کا کہنا تھا کہ "کاہن طامس بری روحوں پر قابض تھا اور ان کے ذریعہ حسین وجمیل لڑکیوں کو اپنے معبد میں بلاکر اپنی ہوس کا نشانہ بناڈالتا تھا۔"

لیکن اس کا دل یہ گواہی دیتا تھا کہ کاہن ایسا نہیں تھا یہ سراسر اس پر بہتان تھا۔ اور پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک عجیب سوال ابھرا۔ "اگر کاہن اتنی ہی پراسرار قوتوں کا مالک تھا تو اسے شہنشاہ اخناطون قتل کروانے میں کیسے کامیاب ہوسکتا تھا؟ وہ اپنی قوتوں سے ہمیشہ زندہ رہ سکتا تھا۔ اور اگر وہ اپنی روحانی قوت کی بنا پر آج بھی زندہ ہوتا تو انہی بدروحوں کے ذریعہ وہ کبھی کا اسے بھی اٹھوا کر اپنے پاس بلالیتا۔" اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ جگہ چھوڑنے سے قبل وہ ایک مرتبہ کاہن طامس کی ممی کو ایک نظر دیکھنے میوزیم میں ضرور جائے گی۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ پورا شہر محو خواب تھا۔ باہر مکمل سکوت تھا جیسے وہ کوئی شہر نہ ہو بلکہ قبرستان ہو۔ لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی مسلسل چھت کی طرف تک رہی تھی۔

اچانک فضا میں پراسرار سی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کھڑکیوں کے پردوں کو سرسرا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہوا میں شدت پیدا ہونے لگی اور چند ہی لمحوں بعد اچھی خاصی تیز ہوا چلنے لگی۔ وہ آہستگی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بڑے سکون کے ساتھ اس نے فرش پر اپنے نرم ونازک سفید سفید پاؤں رکھ دیئے اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر وہ ننگے ہی پاؤں دروازے کی طرف اس طرح بڑھنے لگی۔ جیسے وہ چل نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں اڑ رہی ہو۔ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اسی حالت میں دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کی پیٹھ پر لہرا رہے تھے۔

ہوا نے اب ایک چھوٹے سے طوفان کی صورت اختیار کرلی تھی اور فضاؤں میں سسکیوں کی آوازیں گھل مل جاتیں، ماحول بے حد پراسرار ہورہا تھا۔ طوفان بڑھ رہا تھا اور اس کے قدم بھی تیزی کے ساتھ میوزیم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ تاریکیوں کو چیرتی ہوئی جوں جوں میوزیم کے قریب ہورہی تھی طوفان میں شدت آرہی تھی۔ وہ جب میوزیم سے چند گز کے فاصلے پر تھی تو طوفان اتنا شدید ہوچکا تھا کہ آگے بڑھتے وقت وہ لڑکھڑا کر ایک پتھر پر گر پڑی جس سے اس کا ایک پاؤں زخمی ہوگیا۔ لیکن وہ اس سے بے پرواہ ہوکر پھر آگے بڑھنے لگی۔ اس کے قریب ہی ایک درخت طوفان کی زد میں آکر جڑ سے

چوہا

ست جھگڑالو بیوی اپنے شوہر پر برس رہی تھی۔ وہ بے چارہ مسکین صورت بنائے ہوئے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ بیوی بولے جارہی تھی۔

"بزدل کہیں کے، تم انسان ہو کہ چوہے؟"

شوہر عاجزی سے گڑگڑایا۔ "بیگم میں انسان ہوں، چوہا ہوتا تو تم اس وقت تھرتھر کانپ رہی ہوتیں۔"

(رانا اشفاق۔ کراچی)

اکھڑ کر ایک مہیب شور کے ساتھ چند قدم کے فاصلے پر گر پڑا۔ ایک لمحے کی تاخیر ہوجاتی تو وہ اس کے نیچے آ کر یقیناً پس جاتی۔

میوزیم کی عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس کے قدم بڑے دروازے کی طرف بڑھنے لگے اور وہ ایک راہداری میں سے گزر کر بڑے دروازے تک جا پہنچی۔ خلاف توقع بڑے دروازے پر کوئی دربان موجود نہ تھا۔ وہ جونہی دروازے کے قریب پہنچی تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ اور تیز تیز چلتی ہوئی اس جگہ جا پہنچی جہاں کاہن طامس کی ممی کو اس نے دیکھا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی کہ ممی اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ اس کا سر جس طشت میں پڑا تھا وہ طشت بھی خالی تھا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ دوسرے کمروں کی طرف بڑھی، وہ جس کمرے کے دروازے کے قریب بھی پہنچتی کوئی غیر مرئی قوت خود بخود دروازہ کھول دیتی۔ اس نے محسوس کیا جیسے کوئی برابر اس کے آگے آگے چل رہا تھا اور دروازے کے قریب پہنچتے ہی اسے کھول دیتا تھا۔ اس نے تمام کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا لیکن اسے ممی کہیں نظر نہ آئی۔ وہ پلٹ کر پھر اس جگہ آ کھڑی ہوئی جہاں اس نے پہلے روز ممی کو دیکھا تھا۔ اسے وہاں کھڑے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اس نے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنی، اس نے یکدم پلٹ کر دیکھا۔

اس کے قریب سر سے پاؤں تک سیاہ لبادہ اوڑھے کوئی شخصیت موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چیخنا ہی چاہتی تھی کہ اسے آواز آئی۔ ”گھبراؤ نہیں! میری ذات سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے، میں تمہارا دوست ہوں۔“ یہ آواز اسی سیاہ پوش ہستی کی تھی۔ اسے پھر آواز آئی۔

”میں جانتا ہوں تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ آواز پھر آئی۔ ”تم غالباً یہ دیکھ کر پریشان ہو کہ یہاں پر رکھی ہوئی کاہن طامس کی ممی کہاں غائب ہوگئی؟“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”کاہن طامس کی ممی کو فی الحال یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔“

”لیکن کہاں؟“ وہ یکدم پوچھ بیٹھی۔

”کہیں بھی، لیکن تمہیں چار ہزار سال پرانی اس ممی سے کیا دلچسپی ہے؟“ سیاہ پوش نے اچانک اس سے سوال کیا۔ وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ ایک قہقہہ میوزیم ہال میں گونجا۔ ”میں جانتا ہوں تم اس ممی میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہی ہو۔“

”کیوں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

”اس لئے...... کہ...... تم...... وہ راز جاننا چاہتی ہو جو کاہن طامس کے قتل کا باعث بنا۔“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

دوبارہ ایک قہقہہ گونجا۔ ”وہ راز تمہیں میں بتا سکتا ہوں۔“

”تم؟؟؟“ وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

”ہاں! کیونکہ میں اس راز سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

وہ اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ یہ سیاہ پوش ہستی وہی گائیڈ تھا جو پہلے روز اسے میوزیم میں ملا تھا۔ لیکن اسے یہ سیاہ لبادہ اوڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید وہ اسے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ جان کر کہ اس سے ایک گائیڈ مخاطب تھا۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ وہ بولی۔ ”میں تمہاری مشکور رہوں گی گائیڈ اگر تم مجھے ان واقعات سے آگاہ کر دو، جن کے تحت کاہن طامس کو شہنشاہ اخناطون نے قتل کروا کر اس کی لاش چوراہے پر لٹکوادی تھی اور پھر کئی روز تک وہ عبرت کا نشان بنی لٹکتی رہی۔“

”یقیناً میں تمہیں ان سب باتوں سے آگاہ کر دوں گا۔ کیوں کہ میرے علاوہ انہیں اور کوئی نہیں جانتا۔“ وہ کہنے لگا۔

”آج سے چار ہزار سال پہلے شہنشاہ اخناطون جو فراعنہ مصر میں سب سے جلیل القدر اور بارعب حاکم تھا مصر کے سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اس کے دور میں بے شمار معبد تھے جن پر کاہنوں کا قبضہ تھا۔ اکثر کاہن اپنے معبدوں میں کنواری لڑکیوں کی عصمت لوٹ لیا کرتے۔ طامس بھی اس دور میں ایک بڑے معبد کا کاہن تھا۔ کاہن طامس ڈیل ڈول اور شکل وشباہت کے لحاظ سے اس دور کا حسین ترین شخص تھا۔ مصر کی زیادہ تر دوشیزائیں اس پر فریفتہ تھیں۔ وہ اس کے پاس معبد میں پہنچ کر طرح طرح کے عشوؤں سے اسے لبھانے کی کوشش کرتیں، لیکن وہ ایک ایسا پتھر ثابت ہوا تھا جس پر حسن کا کوئی حربہ کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی شہرت مصر کے ہر گلی کوچے میں پھیل گئی۔ شہنشاہ اخناطون نے اس کی شہرت سے متاثر ہو کر اسے ایک روز اپنے دربار میں بلایا تو وہ بھی مردانہ وجاہت کے اس حسین وجمیل مجسمے کو دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔“

یہ کہہ کر گائیڈ کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر بولا۔

”شہنشاہ اخناطون نے اسی روز اسے کاہن اعظم کا لقب دے دیا اور اسے مصر کے سب سے بڑے معبد کا انچارج بنا دیا۔ کاہن طامس نے ستاروں کے علم پر عبور حاصل کیا اور دن رات عبادت میں مصروف رہنے لگا۔ مصر کی حسین دوشیزائیں اب بھی اس کے گرد بھنوروں کی طرح منڈلاتی تھیں۔

آخر کاہن طامس نے حسن کی دیوی افرودیتی کی عبادت شروع کی۔ شب وروز کی اس عبادت سے افرودیتی بہت خوش ہوئی اور اس سے پوچھا۔ ”اس کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“

”کاہن طامس نے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور بولا۔ ”اے حسن کی دیوی افرودیتی۔ میرا اپنا وجود ہی میرا دشمن ہوگیا ہے۔ میرے جسم کی خوب صورتی کو دیکھ کر بے شمار کنواری لڑکیاں مجھے اپنی عصمتوں کے گوہر نذر دینا چاہتی ہیں لیکن میں کسی برائی کی دلدل میں دھنسنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں تم میرے پاس اس دوشیزہ کو بھیج دو جسے تم نے صرف میرے لئے بنایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں وہ چیز ہمیشہ کے لئے حاصل کرلوں جو میرے ہی وجود کا نصف حصہ ہے۔“

یہ سن کر افرودیتی مسکرائی اور بولی۔ ”تمہارے لئے جس دوشیزہ کا انتخاب میں نے کیا ہے وہ مصر کی حسین ترین لڑکی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو اپنے وجود کے حسن کو بھول جاؤ گے...... لیکن......“

”لیکن......؟ لیکن کیا......!“ کاہن طامس چلایا۔

”لیکن وہ دوشیزہ تمہیں اس زندگی میں حاصل نہ ہوسکے گی۔“

”کیوں؟“ وہ چیخ اٹھا۔

”یہ تمہیں صرف وقت بتائے گا۔“ جواب ملا۔

اور اسی شام اپنی چند خادماؤں کے ہمراہ ایک دوشیزہ اس سے ملنے اس کے معبد میں آ پہنچی۔ وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ حسن اور خوب صورتی کی اس سے زیادہ دلکش تصویر اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کے کان میں سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔ یہی وہ دوشیزہ ہے جسے افرودیتی نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ یہی تمہاری منزل ہے۔“

وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اور بالکل اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ انتہا کی بے خودی کے عالم میں وہ اسے تکتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ ”ہم چاہتے ہیں تم اپنے ستاروں سے ہماری قسمت کا حال پوچھ کر بتاؤ۔“ دوشیزہ اس سے مخاطب تھی۔

وہ یک دم چونک پڑا۔ ”آپ کی قسمت کا حال؟“

ایک خادمہ آگے بڑھی اور بولی۔ ”کاہن طامس آپ شہزادی زولہ سے مخاطب ہیں۔“

”شہزادی زولہ؟“ وہ یک دم سٹپٹا گیا۔ ”شہنشاہ اخناطون کی اکلوتی بیٹی؟“

اس نے ادب سے جھک کر شہزادی کو تعظیم دی اور بولا۔ ”میں آج ہی ستاروں سے آپ کے مستقبل کے بارے میں پوچھ کر آپ سے کل عرض کر دوں گا۔“

اس نے دیکھا کہ شہزادی زولہ بھی اسے یک تک دیکھنے میں محو تھی۔ سر سے پاؤں تک ایک ٹھنڈی لہر

اس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ اوران چند لمحوں میں ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا۔"

یہ کہہ کر گائیڈ خاموش ہوگیا اور بے چینی کی سی کیفیت میں ادھر سے ادھر پھرنے لگا۔ خاموشی کافی طویل ہوگئی تھی۔ اس کا ذہن کلبلانے لگا۔ "پھر کیا ہوا۔ پھر کیا ہوا۔" آخر وہ پوچھ بیٹھی۔ "پھر کیا ہوا گائیڈ؟"

"پھر؟" وہ یک دم رک گیا۔ "پھر شہزادی زولہ اور کاہن طامس ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔

شہزادی بلا ناغہ رات کو اس سے ملنے اس کے معبد میں آتی اور تمام رات اس کے پہلو میں گزاردیتی۔ ان دونوں کی محبت اس قدر عروج پر پہنچ چکی تھی کہ وہ ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ کرسکتے تھے۔ اور پھر......"

گائیڈ بے چین ہوگیا اور تیزی سے میوزیم ہال میں گھومنے لگا۔ آخر وہ آکر اس جگہ رک گیا جہاں وہ لمبی میز پڑی تھی جس پر کاہن طامس کی لاش پڑی تھی اور اب خالی تھی۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب ہوکر بولا۔ "پھر ایک روز شہنشاہ اخناطون کو ان کی لافانی محبت کا علم ہوگیا۔ وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگ گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک کاہن اس کی بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسالے گا۔

وہ رات ایک انتہائی بھیانک تھی جب حسب معمول شہزادی زولہ کاہن طامس سے ملنے اس کے معبد میں آئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی محبت کا نذرانہ پیش کرنے لگی۔

اچانک دھڑام کی آواز کے ساتھ معبد کا دروازہ کھلا اور ان کے سامنے شہنشاہ اخناطون کھڑا تھا۔ دونوں خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔

شہزادی زولہ کو شہنشاہ نے بالوں سے کھینچ کر کاہن طامس سے الگ کیا اور دوسری صبح طامس کو بھرے دربار میں قتل کردینے کا حکم صادر کردیا۔

کاہن طامس کو جب قتل گاہ میں لایا گیا تو شہنشاہ بھی وہاں موجود تھا، شہزادی زولہ ایک کھڑکی میں سے اپنے محبوب کو قتل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ جب جلاد نے اس کی گردن مارنے کے لئے اس کا سر جھکایا تو وہ ایک دم کھڑا ہوکر شہنشاہ اخناطون سے مخاطب ہوا۔

"شہنشاہ۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ مجھے قتل کرواکر تم میری زندگی اور میری لافانی محبت کو ختم کردو گے۔ لیکن یہ تمہارا وہم ہے۔ میں نے افرودیتی کی اتنی عبادت کی ہے کہ میرے جسم سے میری روح الگ ہوجانے کے بعد بھی میں زندہ رہوں گا۔ میرے جسم کا حسن اور جوانی اسی طرح برقرار رہے گی۔ اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔ جب میں اپنی کھوئی ہوئی محبت کو دوبارہ حاصل کرلوں گا۔"

پھر کاہن طامس چیخ کر بولا۔ "شہزادی زولہ کو مجھ سے الگ کرکے آج تم جیتے ہو لیکن وہ وقت بھی ضرور آئے گا جب آخر کار جیت میری ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ جلاد نے تیز دھار کلہاڑے کا ایک بھر پور وار کیا اور کاہن طامس کا سر لڑھکتا ہوا دور جاگرا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ نکلا جس سے قتل گاہ کا تمام فرش سرخ ہوگیا۔ کھڑکی کے پیچھے شہزادی زولہ کی چیخ گونجی اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔"

گائیڈ یہاں تک کہہ کر پھر خاموش ہوگیا۔ وہ نہایت محویت سے اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس کے بعد شہنشاہ نے کاہن طامس کی لاش اور کٹا ہوا سر مصر کے سب سے معروف بازار کے چورستے پر لٹکادیا جہاں کئی روز تک وہ لٹکا رہا۔"

وہ راز جو اب تک تاریخ کے اوراق سے پوشیدہ تھا وہ جان چکی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ گائیڈ نے اسے ایسا انمول راز بتادیا تھا جو اس کے مقالے کے لئے بڑا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اب یہاں سے واپس جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح طامس کے کٹے ہوئے سر کو ایک نظر دیکھ لے۔ وہ بھی قدم اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ گائیڈ کی آواز آئی۔ "اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب کاہن طامس نے اپنی کھوئی ہوئی محبت کو دوبارہ حاصل کرلیا۔"

"وہ کیسے؟" اس نے پلکیں اٹھا کر سوال کیا۔

"شہزادی زولہ۔" وہ بولا۔ "چار ہزار سال بعد اسے پھر مل گئی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سر سے سیاہ نقاب اٹھادیا، اس کے سامنے کاہن طامس زندہ کھڑا تھا۔

وہ چیخنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ چیخ سکی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاؤں میں کسی انجانی طاقت نے زنجیریں ڈال دیں۔ کاہن طامس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ جسے وہ اب تک گائیڈ سمجھ رہی تھی وہ حقیقتاً کاہن طامس ہی تھا۔

وہ خوفزدہ سی ہوکر پیچھے ہٹنے لگی۔

وہ بولا۔ "شہزادی زولہ کیا تم نے اپنی اس محبت کو قطعی فراموش کردیا ہے جو تم کبھی مجھ سے کرتی تھیں؟"

"شہزادی زولہ؟" وہ بڑبڑائی۔ "لیکن میں تو......"

"تم وہی شہزادی زولہ ہو۔ آج سے چار ہزار سال پہلے میں نے تم سے ہی محبت کی تھی۔ شہزادی ہم ایک ہی جسم کے دو حصے ہیں۔ یہ دو حصے اب الگ نہیں رہ سکتے۔ میں نے شہنشاہ اخناطون کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ ایک نہ ایک روز اپنی محبت، اپنی شہزادی کو ضرور حاصل کرلوں گا۔ اور آج...... آج میں نے تمہیں پالیا ہے۔"

وہ اب بالکل اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جالگی۔ کاہن طامس کی آنکھوں میں ایک عجیب سحر تھا جو اسے مدہوش کئے جارہا تھا۔ وہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتی جارہی تھی۔ کاہن طامس نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑلیا اور اپنے ہونٹ اس کے خوب صورت اور گلابی ہونٹوں پر ثبت کردیئے۔ بوسہ اس قدر طویل تھا کہ وہ جھلا اٹھی۔ خود کو چھڑانے کے لئے اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے لیکن ان بازوؤں کی گرفت سے خود کو آزاد نہ کراسکی۔

اس نے اس کے سر کے لمبے بالوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا تاکہ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے دور ہٹا سکے۔ کھٹاک کی ایک آواز پیدا ہوئی اور کوئی وزنی چیز اس کے ہاتھوں میں لہرانے لگی۔

وہ ایک بہت ہی دہشت ناک منظر تھا۔ کاہن طامس کے سر کے بالوں کا ایک گچھا اس کی انگلیوں میں بھنچا ہوا تھا اور اس کا کٹا ہوا سر اس کے ہاتھ کے نیچے لہرا رہا تھا۔ گردن سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ اور سر سے بھی خون کی سرخ سرخ بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

ایک زوردار چیخ میوزیم کے ہال میں گونجی اور وہ بے ہوش ہوکر کاہن طامس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

دھڑام کی آواز کے ساتھ میوزیم کا دروازہ کھلا اور چند لوگ بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ ان آدمیوں میں کاہن طامس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی دوشیزہ کا چچا بھی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کاہن طامس کے بے سر کے دھڑ نے دوشیزہ کو اپنے بازوؤں پر اٹھایا۔ اس کا سر دوشیزہ کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ وہ اسے اٹھائے آگے بڑھا، اس کے قدم ایک تہہ خانے کی طرف اٹھنے لگے۔

دوشیزہ کا چچا چیخ اٹھا۔

"ٹھہرو کاہن طامس! ٹھہرو۔"

ایک پل کے لئے کاہن طامس رکا۔ "مجھے معاف کردو طامس۔ مجھے معاف کردو۔ مجھ سے میری بیٹی نہ چھینو۔" اس نے التجا کی۔

"اب تم وہ شہنشاہ اخناطون نہیں ہو کہ مجھ سے میری محبوبہ کو چھین سکو۔" آواز پھر گونجی۔ "دیکھو میں نے چار ہزار سال بعد تمہاری بیٹی کو پھر حاصل کرلیا ہے۔ میں جیت گیا ہوں اخناطون، میں جیت گیا ہوں۔" خوفناک قہقہہ پھر گونجا اور بے سر کا دھڑ تہہ خانے میں اتر گیا۔

سب لوگ بھاگ کر تہہ خانے کے قریب پہنچے۔ لیکن اچانک ایک وزنی پتھر کہیں سے لڑھکتا ہوا آیا اور آکر تہہ خانہ کے منہ پر جم گیا۔

وہ پتھر آج بھی اس میوزیم میں تہہ خانے کے اوپر جما ہوا ہے جسے انتہائی کوشش کے باوجود بھی کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلاسکی۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 103

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رولوکا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا، رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا، رولوکا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ماضی میں کھویا تھا کہ کس کس طرح اس کا واسطہ نادیدہ قوتوں سے پڑا اور پھر ان نادیدہ قوتوں نے کسی طرح چھل اور دھوکہ سے کام لے کر اسے تنگ کیا کہ اتنے میں رولوکا کو کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ سسکیوں کی آواز غمزدہ تھی۔ پھر رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟'' رولوکا کی آواز سن کر سسکنے کی آواز مزید تیز ہوگئی۔ وہ ایک نسوانی وجود تھا جو کہ سسک رہا تھا۔ رولوکا بولا۔ ''بھئی آپ کون ہیں؟ اور رات کے اس وقت میرے کمرے میں آکر آہ وزاری کا مقصد کیا ہے؟'' پھر رولوکا بولا۔ ''آپ کھل کر سامنے آئیں اور بتائیں کہ اصل مقصد کیا ہے؟'' رولوکا کی آواز سن کر وہ بولی۔ ''رولوکا صاحب میں ایک ابھاگن اور بدنصیب روح ہوں۔ میں زندہ تھی تب بھی مجھے چین نہیں ملا اور مرنے کے بعد تو میں اور بھی بے سکون ہوگئی اور ان تمام بے سکونی میں میرا اپنا عمل دخل ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہوا وس میں اڑنے لگی میں دولت مند بننے کی خواہش میں مردوں کے ہاتھوں کھلونا بن گئی اور پھر جب مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں نے خودکشی کرلی۔ میرا قدر دان اور مجھ سے سچا پیار کرنے والا ایک شخص تھا اور نہ ہی اس کی باتوں پر کان دھرے، مرنے کے بعد میں نے ان لوگوں سے انتقام لینا شروع کردیا، جن لوگوں نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی، میں نے اپنا آلہ کار شاہنواز کو بنایا۔ میں نے شاہنواز کی خواہش پوری کی یعنی اسے دولت مند بنادیا۔ اس کے ہاتھ میں نے لوگوں کو قتل کرانا شروع کردیا۔ شاہنواز میرے اشارے پر من وعن چلنے لگا۔ ابھی بھی میرے کئی دشمن باقی ہیں اور جب تک میں انہیں بھیانک انجام سے دوچار نہیں کردیتی اس وقت تک مجھے چین نہیں ملے گا۔ مگر اب شاہنواز میرے سامنے گناہ ثواب اور ضمیر کی باتیں کرنے لگا ہے، اب وہ میری بات ماننے سے کترا رہا ہے۔ وہ عنقریب آپ کے پاس آئے گا تاکہ مجھ سے بچ جائے۔ میرا یہ کہنا ہے کہ آپ اس کی بات مان کر میرے راستے میں رکاوٹ نہیں کھڑی کرنا ورنہ میں آپ سے بھی نمٹ لوں گی۔ اور ویسے میں نے شاہنواز کو دھمکی دے دی ہے کہ اگر تم نے میری باتوں پر عمل نہیں کیا تو میں تمہیں عبرت کا نشان بنادوں گی۔'' (اب آگے پڑھیں)

رولوکا مطب کے ایک کمرے میں بیٹھا تھا کہ ملازم آیا، ملازم کو دیکھتے ہی رولوکا بولا۔ ''مختار علی کیسے آنا ہوا؟''

رولوکا کی بات سن کر مختار علی بولا۔ ''حکیم صاحب آپ کے پاس حکیم وقار نے بھیجا ہے اور فرما رہے ہیں کہ کوئی صاحب آئے ہیں، بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اگر آپ فارغ ہیں تو میں ان صاحب کو آپ کی خدمت میں لے آؤں۔'' ملازم یہ بول کر خاموش ہوکر کھڑا ہو گیا۔

پھر رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''جاؤ اور انہیں لے کر آجاؤ، دیکھتا ہوں کہ کیا مسئلہ درپیش ہے؟''

رولوکا کی بات سن کر ملازم پلٹا اور چلا گیا۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ملازم کے ساتھ ایک صاحب آئے۔ چہرے سے وہ زیادہ بلکہ بہت ہی زیادہ پریشان لگ رہے تھے۔

رولوکا بولا۔ ''جناب تشریف رکھیں۔'' اور پھر رولوکا نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

رولوکا مختار سے بولا۔ ''مختار علی جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آؤ۔''

''جی ابھی لایا۔'' یہ بول کر مختار علی پانی لینے چلا گیا۔

رولوکا کی سامنے والی کرسی پر وہ صاحب اپنی

گردن نیچی کئے بیٹھے تھے کہ اتنے میں مختار علی گلاس میں ٹھنڈا پانی لے آیا۔ رولوکا بولا۔ ”مختار علی پانی رکھ دو اور اب جاؤ۔“

رولوکا کی بات سن کر مختار علی واپس چلا گیا۔ ابھی تک وہ صاحب رولوکا کے سامنے گردن نیچی کئے بیٹھے تھے۔ رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ”جناب آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا میں جان سکتا ہوں، اگر کوئی مسئلہ درپیش ہے تو بلا جھجک فرمائیں۔ آپ بہت زیادہ پریشان لگ رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں اوپر والے کی مدد سے میری کوشش ہوگی کہ آپ کی درپیش پریشانی دور ہوجائے۔“

رولوکا کی باتیں ابھی جاری تھیں کہ ان صاحب کی سسکیاں رولوکا کو سنائی دیں۔ وہ صاحب بہت غمگین انداز میں سسکنے لگے تھے۔

رولوکا جھٹ اپنی کرسی سے اٹھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”آپ غم نہ کریں، حوصلہ رکھیں، صبر سے کام لیں، اگر آپ حوصلہ ہار گئے تو اپنے مسائل پر قابو پانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوجائے گا۔ خاموش ہوجائیں اور چلیں پانی پئیں۔“ اور یہ بول کر رولوکا نے ٹھنڈے پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

ان صاحب نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور پانی کا گلاس رولوکا کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے ہونٹ لگا کر غٹا غٹ گلاس خالی کردیا۔

رولوکا بولا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، اپنا مسئلہ بتائیں تاکہ میں اس پر غور کرسکوں، اگر آپ نے حوصلے سے کام نہ لیا تو آپ اپنی پریشانی میں مزید الجھ جائیں گے۔“

وہ صاحب لمبے لمبے سانس لیتے رہے اور ان کو رولوکا یک ٹک دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد وہ گویا ہوئے۔

”حکیم صاحب میں بہت آس و امید لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ میرے لئے آخری امید ہیں...... ورنہ میں اب خودکشی کرلوں گا۔ میری اذیتیں مجھ سے ناقابل برداشت ہوگئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی مجھ سے بڑا بدنصیب دنیا میں ہو۔“

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”ایسی بات نہ کریں، دنیا کے خالق و مالک نے کسی بھی انسان کو دنیا میں بدنصیب پیدا نہیں کیا، دنیا میں جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے وہ تمام تر اچھائیوں کے ساتھ آتا ہے، پھر آہستہ آہستہ وہ پروان چڑھنا شروع ہوتا ہے، انسان کی زندگی میں وسائل مسائل، رنگ روپ، رہن سہن اور ماحول کا سب سے بڑا عمل دخل ہے۔ دنیا کا نظام چلنے کے لئے راجا پرجا اور دیگر لوگوں کا اپنے اپنے شعبے سے وابستگی ضروری ہے۔ دنیا کا نظام چلنے کے لئے چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑے کام کا ہونا لازمی ہے۔ ہر آدمی کا اپنا عمل ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے اچھائی کرے یا برائی۔ اپنے اچھے عمل سے اپنے پیدا کرنے والے اور دنیا میں موجود لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بن جائے یا پھر برا۔“

وہ صاحب بولے۔ ”حکیم صاحب آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔ میں ان باتوں کو من و عن تسلیم کرتا ہوں، میری اپنی ساری غلطیاں ہیں جس کی وجہ سے آج میں چین سے بے چین ہوں، شب و روز بلکہ پل پل کا چین و سکون بھی دور ہوگیا ہے اور میں خودکشی کرنے کے در پہ ہوں، کاش! کہ میں شروع شروع میں سوجھ بوجھ سے کام لیتا تو آج اس نوبت تک نہ پہنچتا۔ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے مگر جب ایک آدمی اپنے حالات سے ناقابل حد تک پریشان ہوجاتا ہے، اس کے سامنے کوئی اچھائی کا راستہ نظر نہیں آتا، جتنا وہ سوچتا ہے اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہے، وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہوجاتا ہے، تو پھر وہ جہنم میں جا پہنچتا ہے۔

اب تو میرے دماغ میں بھی یہی بیٹھ گیا ہے کہ پل پل مرنے سے اچھا ہے کہ ایک ہی مرتبہ زندگی سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔

حکیم صاحب آپ کو اللہ کا واسطہ، میری مدد

کریں، اور مجھے ناقابل برداشت اذیت سے بچالیں! میں دنیا سے جانے کے بعد بھی قیامت تک آپ کے لئے دعائیں کرتا رہوں گا، اب مجھ میں حوصلہ یا ہمت نہیں کہ پل دو پل کی اذیت بھی برداشت کرسکوں، اور خاص طور پر میرے لئے رات تو جہنم کی تکلیف سے بھی بڑھ کر ہوجاتی ہے۔“ اور یہ بول کر وہ صاحب پھر دوبارہ سسکنے لگے، ان کی آواز جیسے گلے میں اٹک گئی، پھر وہ زار و قطار ہچکیوں سے رونے لگے۔

ان کی حالت دیکھ کر رولوکا نے انہیں رونے دیا کہ اس طرح انسان کے دل کا غبار نکل جاتا ہے اور آدمی اندرونی طور پر ہلکا ہوجاتا ہے۔ اتنی دیر میں رولوکا اپنی کرسی سے اٹھا اور جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آیا۔ تقریباً دس منٹ تک وہ صاحب زار و قطار روتے رہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ شانت ہوگئے اور گردن نیچی کرکے بیٹھے رہے۔

رولوکا اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قریب آکر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”چلیں پانی پی لیں۔“

انہوں نے رولوکا کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئے۔ اس کے بعد وہ چند منٹ خلاؤں میں گھورتے رہے، شاید اپنی سوچوں کی ڈوری کو سلجھا رہے تھے۔

اتنی دیر میں رولوکا اپنی کرسی پر بیٹھ کر ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

وہ گویا ہوئے۔ ”حکیم صاحب میرا نام شاہنواز ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا پایا۔ میرے والدین کی خواہش رہتی تھی کہ وہ میرے لئے آسمان کا تارا توڑ کر لے آئیں۔ خیر میں آہستہ آہستہ پروان چڑھتا گیا اور پھر جب جوان ہوا تو میں اپنے محلے کی ایک لڑکی کو پسند کرنے لگا۔ وہ خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔

میں خود بھی سینکڑوں میں ایک تھا۔ وہ لڑکی بھی میری چاہت کا دم بھرنے لگی۔ ایک سال تک ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ ایک دن میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ ”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

میری بات سن کر وہ بولی۔ ”شاہنواز میرا مشورہ ہے کہ تم کوئی اچھا سا کاروبار یا پھر کوئی اچھی سی نوکری کرلو۔ تم کسی مقام پر پہنچے نہیں اور شادی کی بات کر بیٹھے۔

بھئی میرا تو دل چاہتا ہے کہ میرا شوہر خوب پیسے والا ہو۔ میری ہر فرمائش پر دل کھول کر خرچ کرے، میں ہواؤں میں اڑتی پھروں، ایک آزاد پنچھی کی طرح۔ میں سب سے الگ تھلگ نظر آؤں، میرے ارد گرد نوکر چاکر ہوں جو کہ میرے حکم پر دوڑتے پھریں، ناں بابا...... ناں...... میں کسی بھی انگلے کنگلے سے شادی نہیں کروں گی۔ اور ویسے بھی میں کون سی بھاگے جارہی ہوں۔ تم میری خواہش کا احترام کرو اور دولت مند بن جاؤ تو میں تمہاری ہوجاؤں گی ورنہ......“

اور حکیم صاحب اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس کی باتیں سن کر میں بولا۔ ”شازیہ! میں تمہاری باتوں پر غور کرتا ہوں اور میں کوشش شروع کردیتا ہوں کہ میں تمہاری خواہش پر پورا اتر سکوں، لیکن ایک بات یاد رکھنا سراب کے پیچھے بھاگنے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی۔“

حکیم صاحب اس رات میں ماہئی بے آب کی طرح رہا، نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی، صبح ہوئی تو میری آنکھیں دیکھ کر میرے گھر والے پریشانی میں مبتلا ہوگئے اور باز پرس کی تو میں نے بہانہ کردیا کہ رات بھر میرے سر میں شدید درد رہا ہے اور اس وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی۔“

میرے بابا بھاگے بھاگے گئے اور حکیم صاحب سے سر درد کی دوا لے آئے اور مجھے زبردستی دوا دی، خیر میں نے گھر والوں کا دل رکھنے کے لئے دوا کھالی۔

مگر میں دن بدن حال سے بے حال ہوتا گیا۔

خیر وقت بہت ہی بڑا مرہم ہوتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ شازیہ کی چاہت میں میرا پاگل من شانت ہونے لگا۔

انہی دنوں شازیہ نے ایک کمپنی میں نوکری لی۔ اس کے شب وروز کے معمولات بدلتے گئے، ہم دونوں کی سوچ میں خلیج جیسا فرق آتا گیا۔ میں اپنے والدین کی امید اور خواہشات کے پیش نظر شازیہ کے لئے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا۔

شازیہ آئے دن نئے نئے دوستوں میں نظر آنے لگی، اس کے تمام دوست مرد تھے، وہ ادائے دلربائی سے مردوں کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لے لیتی، وہ پیسوں میں کھیلنے لگی، ہر کوئی اس پر ہزاروں کے نوٹ نچھاور کردیتا، مگر کوئی بھی اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے لئے تیار نہ ہوتا، اس کی یہ خواہش جڑ پکڑتی گئی کہ کوئی نہ کوئی دولت منداسے اپنی بیوی بنالے۔ مگر اس کی یہ خواہش کمزور پڑنے لگی۔

ایک دن وہ مجھے ملی۔ وہ ذہنی طور پرا لجھی ہوئی تھی۔ چند منٹ وہ میرے قریب بیٹھی رہی مگر وہ برابر خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھتی رہی۔ میری باتیں سنتی رہی اور صرف ہاں...... ناں...... کرتی رہی۔ آخر میں نے کہا۔

''شازیہ میری یہ آخری بات یادرکھنا......ایک دولت مند، زمیندار، نواب اور کمپنی فیکٹری کا مالک بازار میں جاتا ہے، اپنے پسندیدہ وجود پر لاکھوں نچھاور کرتا ہے، مگر افسوس صد افسوس کہ چند سو یا چند ہزار کمانے والا، اس خوب صورت وجود کو اپنا شریک حیات بنا کر گھر نہیں لاتا۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرو کہ اس عورت کا معاشرے میں مقام کیا ہے؟'' اور یہ بول کر میں فوراً اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

آئے دن طرح طرح کی اس کی خبریں مجھے ملتی رہتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ لٹتی رہی۔ دل پھینک منچلے اور عیاش لوگ اسے کھلونا بنا کر اس سے کھیلتے رہے اور اس کی دولت مند بننے کی خواہش دم توڑتی رہی۔

اور پھر ایک روز یہ خبر ملی کہ شازیہ نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔

میں ہفتوں اس کی یاد میں بلکا اور آنسو بہاتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ضروریات کے دھارے میں بہتا چلا گیا۔ شازیہ کی یادیں معدوم ہوتی گئیں۔ مجھے عورت ذات سے عجیب سی نفرت ہوگئی اور میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔ مگر شرافت اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اور پھر ایک رات ...... صبح ہی سے موسم بہت خراب تھا۔ وقفے وقفے سے بوندا باندی شروع تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی سارا علاقہ بھیانک اندھیروں میں ڈوب گیا۔ پورے علاقے سے لائٹ بھی روٹھ کر جاچکی تھی۔ میرے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور میں خیالوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا میری آنکھیں بند تھیں کہ اچانک۔

مترنم نسوانی ہنسی سنائی دی۔ جھٹ میری آنکھیں کھل گئیں کہ میرے کمرے میں نسوانی ہنسی؟ میں فوراً اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے پورے کمرے میں دیکھنے لگا۔ میری حالت عجیب ہوتی جارہی تھی کہ پھر اچانک نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔

قہقہہ سن کر میں اور بھی بدحواس ہوگیا، اس کے بعد تو قہقہہ پر قہقہہ گونجنے لگا اور پھر مجھے میری حالت زیادہ غیر ہوئی تو میرے سامنے ایک سفید ہیولہ نمودار ہوا۔

اور پھر پلک جھپکتے ہی وہ ہیولہ ایک عورت کا روپ دھار گیا۔ اس کی پشت میری طرف اور چہرا دوسری طرف تھا۔

اسے دیکھ کر میرے منہ سے خوف کے عالم میں نکلا۔ ''کون ہو تم؟''

''میری آواز سن کر وہ پھر ہنسی اور آہستہ آہستہ اپنا چہرا گھمانے لگی اور پھر مجسم وہ میرے سامنے کھڑی

ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ بہت ہی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''شاہنواز۔''

میں نے اپنا نام سننا تھا کہ میں جیسے اچھل پڑا اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''شازیہ تم؟''

''اوہ! تو تم نے مجھے پہچان لیا۔'' ابھی بھی وہ ادائے دلربائی سے مسکرائے جارہی تھی۔ پھر بولی۔ ''شاہنواز گھبراؤ نہیں...... اور نہ مجھ سے ڈرو...... میں حقیقت میں شازیہ ہی ہوں......

دیکھو، تمہاری محبت اور چاہت چار سال بعد بھی مجھے تمہارے سامنے کھینچ لائی۔ تم تو مجھے یکسر بھول گئے تھے لیکن میں......'' اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اپنے سامنے اسے مجسم کھڑا دیکھ کر میں تو جیسے سکتے کے عالم میں تھا۔ میری آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا...... چار سال بعد وہ یکدم اچانک میرے سامنے آگئی تھی۔

میں زیادہ اچنبھے میں یوں تھا کہ ''کمرے کا دروازہ بند تھا تو وہ اندر آئی کیسے؟''

اس کی آواز سنائی دی۔ ''شاہنواز گھبراؤ نہیں...... اور نہ ہی مجھ سے خوف کھاؤ...... شاہنواز میں تمہاری چاہت ہوں...... تمہاری محبت ہوں...... دیکھو! آخر تمہاری محبت اور چاہت مجھے تمہارے سامنے لے آئی۔ اب تو تم خوش ہوجاؤ...... کیا اپنے سامنے مجھے دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔''

''آ...... آ...... آں...... ارے یہ بات نہیں...... تم اس وقت...... اور ہاں...... تم اتنے سال کہاں رہیں...... اور تم نے میرا پتہ کیسے حاصل کیا؟''

''بھئی لگن اگر سچی ہو تو اپنی محبت کو پالیا جاتا ہے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ میں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔ تم تو مجھے بالکل بھول گئے تھے، اگر تم میری چاہت میں بے قرار رہتے تو اس طرح آرام وسکون سے کمرے میں نہ موجود ہوتے اور پھر مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس طرح نہ گھبراتے۔ کیا تم سوچ رہے ہو کہ میں اس وقت تمہارے سامنے کیوں موجود ہوں؟''

''ہاں یہی بات ہے، چار سال بعد تم اچانک اور اس طرح تم بند کمرے میں کس طرح آئیں؟ اور پھر چار سال بعد یہ تمہیں میرا اچانک خیال کیسے آیا، اور پھر تم نے مجھے ڈھونڈا کس طرح؟''

''ارے تو اس میں گھبرانے والی کون سی بات ہے، میں نے کہا نا کہ لگن سچی ہو تو کبھی نہ کبھی پتہ لگ ہی جاتا ہے، اور رہا یہ سوال کہ میں بند کمرے میں کیسے آئی تو میں یہ چھپاؤں گی نہیں بلکہ صاف صاف بتادیتی ہوں کہ...... میں ایک روح ہوں۔''

اور یہ سننا تھا کہ میری تو گھگھی بندھ گئی، کاٹو تو میرے جسم میں لہو نہیں۔ میری حالت غیر ہونے لگی، تو میری بگڑتی حالت کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی۔ ''شاہنواز گھبراؤ نہیں...... میری ذات سے تمہیں کوئی بھی تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ تمہارے دن پھر جائیں گے، دولت سے تمہارا گھر بھر دوں گی، تم عیش وآرام اور ٹھاٹ سے زندگی بسر کروگے۔

جب میں زندہ تھی تو میری ذات سے تمہیں بہت دکھ پہنچا، تمہاری چاہت ومحبت پختہ تھی، تم مجھ سے سچی محبت کرتے تھے، مگر میں نے بے وفائی کی۔ لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ اس کا ازالہ کرکے میں تمہاری زندگی میں خوشیاں بھر دوں...... بس اتنی سی میری خواہش ہے کہ تمہیں بس میرے بتائے ہوئے راستے پر چلنا پڑے گا۔ پھر تم دیکھنا کہ چند دنوں میں ہی تمہاری زندگی چکا چوند ہوجائے گی۔ اب تم آرام سے سوجاؤ...... میں چلتی ہوں کیونکہ میرے جانے کا وقت ہورہا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً حسب ضرورت تمہارے پاس آتی رہوں گی، بس تمہیں میرے بنائے ہوئے منصوبے پر عمل کرنا ہوگا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، بالکل بھی گھبراؤ نہیں، تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔'' اور پھر وہ اچانک کمرے سے غائب ہوگئی۔

اس کے اس طرح چلے جانے سے میں حواس باختہ سوچتا ہی رہ گیا۔ خیر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا

اور سوچ لیا کہ اب دیکھو آگے آگے ہوتا کیا ہے۔

خیر وہ اپنے پروگرام کے مطابق میرے پاس آتی رہی، میرے پاس دولت کا انبار لگنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ میں اس کے پروگرام پر عمل کرتا رہا۔ میرے ہاتھوں اس نے لوگوں کا قتل کرانا شروع کر دیا۔

حکیم صاحب میں اب اس گھناؤنے فعل سے تھک گیا ہوں۔ میرے ہاتھوں کوئی تیرہ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کے پروگرام کے مطابق میرے عمل کا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، میں اس اذیت سے بے زار آ چکا ہوں۔ وہ تین دن پہلے آئی تھی، اور مجھے خوفناک دھمکی دے کر گئی ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ مجھے عبرت کا نشان بنا دے گی۔ اور پھر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کسی نے تمہاری مدد کی تو میں اس سے بھی نمٹ لوں گی۔"

ساری باتیں سن کر رولوکا بولا۔ "شاہنواز صاحب آپ گھبرائیں نہیں۔ غلطیاں تو آپ سے ہوئی ہیں۔ خیر اب آپ اس گھناؤنے فعل سے تنگ آ گئے اور آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یہ اچھی بات ہے۔ وہ کل رات میں میرے پاس بھی آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں آپ کی مدد نہ کروں۔ یعنی اس کا خونی کھیل جاری رہے۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں، آج رات آپ کے پاس وہ نہیں آ سکے گی اور میں کوشش کروں گا کہ آج ہی رات اس کا صفایا ہو جائے، ورنہ موقع ملتے ہی وہ آپ کو جانی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ آپ بالکل بھی فکر نہ کریں پرسکون ہو کر جائیں۔"

اور پھر اسی رات رولوکا نے شازیہ کی روح کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

☆......☆......☆

اس کو سب روزی کہتے تھے، اس کے باپ کا نام مائیکل تھا۔ وہ کمشنر صاحب کے بنگلے میں صفائی کا کام کرتا تھا اس کے ساتھ ایک نہایت کالی بدصورت سی لڑکی بھی رہا کرتی تھی۔ وہ آتی اور باپ کے کام میں اس کا ساتھ دیتی اور چلی جاتی، اس کو کسی نے اہمیت نہ دی۔ اس بنگلے کا وہ سب سے گرا ہوا ملازم تھا۔

پھر وہ اکیلا آنے لگا اس کی لڑکی روزی آنا بند ہو گئی۔ اور پھر یوں ہوا کہ صرف روزی آنے لگی، اس کا قد بڑھ گیا تھا، رنگ اور سیاہ چمکدار ہو گیا۔ اس میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں۔ اس کا دلآویز اور حشر انگیز جسم اتنا پرکشش ہو گیا تھا کہ کمشنر صاحب گوری میم کی نظریں بچا کر دیکھا کرتے تھے اور بار بار بہانے بہانے سے اسے اپنے کمرے میں بلایا کرتے تھے۔

اس کا چمکدار کالا سیاہ جسم اتنا خوب صورت تھا کہ جسم کی خوب صورتی کا اگر مقابلہ کرایا جائے تو وہی نمبر ون آئی۔ اس کے ساتھ اس کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں دہکتے گال اور ستواں ناک اور گداز ہونٹ یوں لگتا جیسی رس بھری، ذرا دبایا کہ رس ٹپ ٹپ ٹپکنے لگے گا۔

ایسا لگتا تھا جیسے اس کا جسم سیاہ چمکدار پتھر سے تراشا گیا ہے۔ ڈرائیور، بیرے سب کی اس پر نظر تھی، سب اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ صاحب بہادر خود اس کے دیوانے لگتے تھے۔ مگر وہ اس سے بے پرواہ اپنا کام کرتی، فرش پر بیٹھ کر جب وہ کپڑا پھرا رہی ہوتی تو اس وقت تو اس کے گرد پھرنے والوں کی ایک بھیڑ سی ہوتی اس کے ماتھے کے پسینے کو پوچھنے والے بہت آتے وہ جسم کے اوپر حصہ پر بلاؤز اور نیچے پیٹی کوٹ نما لہنگا پہنتی تھی۔ کام کے وقت وہ لہنگا پنڈلیوں سے اوپر ہو جاتا تھا۔ اس کی ستون نما کالی ٹانگیں اور ران پر کالا رواں لہراتا صاف نظر آتا تھا۔ اور اس نظارے کے لئے نہ جانے کتنے لوگ اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔

وہ بہت کم بات کرتی تھی اور جس سے کرتی ایسے کرتی کہ وہ دوبارہ اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی زبان بڑی کڑک تھی اردو اور پنجابی کی آمیزش سے وہ نئی زبان بولتی، مردوں کے ہر سوال کا جواب وہ غصے میں دیتی مگر اس کے اس سخت رویے کے باوجود اس کو سب برداشت کرتے تھے، وہ صرف دیکھنے

کی چیز تھی، اس کے کالے جسم میں بہت کرنٹ تھا، وہ اس کرنٹ کا اخراج زبان سے کرتی رہتی تھی۔

ڈرائیور گل خان کی اس پر بڑی نظر تھی وہ گیراج کی صفائی کے بہانے کئی بار اس کو بلا چکا تھا مگر روزی ایک بار بھی نہیں گئی، ہر بار مسکرا کر کہتی۔ "آؤں گی، تیری بھی صفائی کروں گی۔"

"ادھر کتنا گند ہے ابھی چلو میں صاحب کو بولیں گا۔" گل خان بولا۔

"گند تو تیرے اندر بھی بہت ہے، اس کو کون صاف کرے گا؟" وہ بولی۔

"ہم کیا بولتا ہے، تم جواب کیا دیتا ہے، موٹر میں پورے دلی کا سیر اکرائے گا تم آؤ تو۔" گل خام اپنے مطلب پر آ گیا۔

"سیر میں تجھے کراؤں گی وے آن دے میم صاحب نو اس نو بتا دیں گی۔" وہ بولی۔

"ارے اس کو نہ بولنا۔" میں مذاق کر رہا تھا۔

"تم سچ کہا مان لیا، اچھا اب ایسا مذاق نہیں کریں گا بس۔"

اکیلا گل خان ہی ٹرائی نہیں مار رہا تھا کمشنر صاحب کے سب ملازم چانس لے رہے تھے۔ وہ زمانہ پاکستان بننے کے بعد ابتدائی زمانہ تھا۔ کمشنر ڈیوڈ انگریز تھا۔ اس کا بنگلہ تریال کے قریب واقع تھا، ملازمین کے لئے بنگلے کے اندر سرونٹ کوارٹرز بنے تھے، زیادہ تر ملازمین ان کوارٹروں میں رہتے تھے ایک پانی کا حوض بنا ہوا تھا اس کے سامنے والا کوارٹر دھوبی غولو کا تھا، حوض پر جامن کے پیڑ کا سایہ تھا بنگلے کی حدود سے دور کونے کو ایک دیوار بنی ہوئی تھی اور سرونٹ کوارٹر کا دروازہ بھی الگ سے تھا، مین گیٹ پر ایک پولیس والے کی دن رات ڈیوٹی ہوتی تھی۔ روزی سرونٹ کوارٹر کے دروازے سے اندر آتی تھی اور کوارٹروں کے سامنے سے گزر کر چھوٹے دروازے سے بنگلے کی حدود میں داخل ہوتی تھی ان کوارٹروں میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ بچے روزی کو دیکھ کر شور کرتے۔ "کالی پری آ گئی۔" عورتیں دروازوں پر آ کر اس کو دیکھتیں اور منہ بنا کر اندر چلی جاتیں۔

روزی مسکراتی گزر جاتی، عورتیں اس سے نہ جانے بات کیوں نہیں کرتی تھیں، روزی کی مسکراہٹ ان کے سینوں میں اور نفرت بھر دیتی، مردوں میں اپنائیت اور عورتوں میں نفرت اس کی وجہ سے تھی۔

"یارا کیا کرے سمجھ نہیں آتا۔" بیرا شکور نے ڈرائیور گل خان سے کہا۔

"او چے کیا سمجھ نہیں آتی ہم کو بتاؤ۔" گل خان بولا۔

"یار یہ کلو ہے نا ذرا لفٹ نہیں کرواتی بات کرو تو کاٹنے کو آتی ہے کیسا عورت ہے۔" شکور بولا۔

"بڑا زور کا عورت ہے پر انسان کا بچی نہیں ہے پتھر کا مافک ہے۔" گل خان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"دھوبی غولو بولتا ہے اس کی شادی بچپن میں ہو گیا تھا اس کا گھر والا بہت بوڑھا تھا یہ جوان ہوئی تو وہ مر گیا۔ اس پر مرنے والے تو بہت ہیں پر شادی کرنے والے نہیں ہیں۔" شکور بولا۔

"ہم بتائیں گا شادی ہم کو بولو۔" گل خان نے کہا۔

"اے رہنے دے شادی بنائیں گا، غولو بتا رہا تھا یہ بہت خطرناک عورت ہے، اس سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔"

"ہم بھی پٹھان ہے پشاور کا عورت لوگ کو خوب جانتا ہے۔"

"تو پھر بات کر لے اور شادی کر لے۔" شکور بولا۔

"ہم کیا بات کرے گا تم ہماری طرف سے بات کرو۔" گل خان بولا۔

"اس سے بات کرنا تو میرا بھی مشکل ہے کاٹنے کو آتی ہے شام کو میرے ساتھ اس کے گھر چلتے ہیں اس کا باپ مائیکل سے بات کرتے ہیں۔" شکور نے رائے دی۔

”یہ بات تمہارا ٹھیک ہے۔“ گل خان بولا۔
دوسرے دن وہ دونوں مائیکل کے پاس چلے گئے۔ مائیکل بیمار تھا، اور ایک جھلنگی کھاٹ پر پڑا تھا۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا بولا۔ ”اج کھتوں آ پڑا ہے، ڈلیور صاحب۔“
”ایک کام سے آئے ہیں۔“ شکور بولا۔
مائیکل بولا۔ ”غولو کی گل ہے میں کام دے ورگا نہیں ہوں۔“
”بات یہ ہے کہ تم بیمار ہے تمہارا گھر والی نہیں ہے ابی تم مر گیا تو تمہارا چھوکری اکیلا ہو جائے گا۔ تم اس کی شادی کردو۔“ شکور نے کہا۔
”ارے کون اس کلوٹھی سے شادی کرے گا۔“ مائیکل بولا۔
اب گل خان کے بولنے کی باری تھی۔ فوراً بولا۔ ”ہم نے ابھی تک شادی نہیں بنایا۔ ہم تمہارا لڑکی سے شادی بنائیں گا......“
مائیکل نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا پھر لیٹ گیا اور بولا۔ ”ہم لوگ عیسائی ہے، تم مسلمان ہے کیسا شادی ہوگا......“
”لڑکی کو کلمہ پڑھائے گا مسلمان کرے گا پھر نکاح کرے گا۔“ گل خان بولا۔
”میں روزی نال گل بات کر کے بتادیں گا۔“ مائیکل بولا۔
”پھر ہم کب آئیں۔“ شکور بولا۔
”گل تو میں آج ہی کرلیں گا، تسی کل کسی ویلے آجاؤ۔“ مائیکل بولا۔
”دونوں واپس آگئے۔ ایک دن کا گیپ دے کر وہ دونوں پھر مائیکل کے پاس پہنچ گئے۔“ مائیکل بولا۔
”میری کڑی کیندی ہے شادی کے بعد وہ کام نہیں کرے گی اس دا اور میرا خرچا برداشت کرنا پے گا۔“
گل خان کی آنکھوں کے سامنے تو روزی کا کالا چمکدار بدن اس کو للچا رہا تھا۔ وہ فوراً بولا۔
”ہم کو منظور ہے پر تھوڑا ہمارا بھی بات ہے۔“
”دس کی گل ہے تیری گل بھی سننا پے گی۔“ مائیکل بولا۔
”ہم پٹھان ہے پشاور کا، ہمارا عورت پردے میں رہتا ہے باہر جاتا ہے تو برقع لیتا ہے۔ روزی ہمارا بیوی بنے گا تو اس کو پردے میں رہنا ہوگا، کام وہ نہیں کرے گا ہم اس کا پورا خرچ کرے گا۔ تم کو یہ منظور نہیں تو پھر شادی ہم نہیں کرے گا۔“
پتر تیری گل ٹھیک ہے، میں یہ بھی روزی نال پوچھیں گا تے وہ راضی ہوئی تو پھر ہور گل ہووے گی۔“ مائیکل بولا۔
بات آگے نہیں بڑھی، روزی نے گل خان کی شرط نہیں مانی۔
”تم بہت بڑا غلطی کیا ہے، ہم تم کو بہت آرام سے رکھتا ہم کو دن بھر محنت نہیں کرنا پڑتا۔
تم پردے میں رہتا دنیا کی بری نظروں سے بچتا ابھی وقت ہے سوچو غور کرو ہم تو ادھر ہے۔“ گل خان نے کہا۔
”اوتوں کی سمجھتا ہے خود کو اوئے میں محنت کرنی آں۔ آزاد پھردی آں تو میں نو پنجرے دے وچ بند کرنا ہے، تینوں شادی کرنا ہے تو گل سن میں کام تو نہیں کریں گی پردے مردے وچ میں نہیں رہ سکتی۔ چل ہٹ۔“
گل خان سوچ میں پڑ گیا بولا۔ ”اچھا چل تیری بات مانتا ہوں پر تو میرے ساتھ جائے گی جدھر جانا ہو اکیلی نہیں پھرے گی۔“
”گل تو وہی رہی ہے تیری غلامی میں تو شروع سے آزاد ہوں آزاد ہی رہوں گی۔“
”بہت مشکل بات ہے ایک پٹھان کے واسطے بہت مشکل۔“ گل خان بولا۔
”تو پھر موج کر میرے نال گل نہ کرنا۔“
گل خان ناامید ہوگیا۔ اور اس نے کمشنر کی نوکری چھوڑ دی اور بنگلے سے چلا گیا۔
روزی برابر آتی رہی، کمشنر صاحب کی میم لندن چلی گئی۔

کمشنر صاحب آزادی سے روزی کو پاس بلانے لگے اور روزی گھنٹوں ان کے کمرے میں رہنے لگی۔ کچھ دن میں لہنگے کی جگہ اسکرٹ نے لے لی۔ اور اس کے بناؤ سنگھار میں فرق آگیا۔
صاحب کے ساتھ گاڑی میں جانے لگی۔ اور پھر کمشنر ڈیوڈ نے ایک دن چرچ میں لے جاکر شادی کرلی۔ سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ گودے دار ہڈی گلے میں پھنس گئی۔ پہلے حکم چلا کر اس سے کام کرواتے تھے اب اس کے نوکر ہوگئے، کئی تو نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔
ڈیوڈ صاحب اس سے عمر میں بڑے تھے اور بہت بڑے انگریز آفیسر تھے ان کی بیگم بن کر روزی کا رتبہ بھی بلند ہوگیا اس کا باپ بھی کوٹھی میں رہنے لگا۔ پہلے اس کو دیسی نصیب نہیں تھی اب انگلش پر ہاتھ صاف کرنے لگا کسی کم ظرف کو مفت کی مل جائے تو اس کو پھر ہوکے میں اپنی بساط سے زیادہ پی لیتا ہے اور یہی مائیکل کے ساتھ ہوا اور کچھ دن میں ہی قبرستان چلا گیا۔ روزی نے ڈیوڈ کو ایسا راگ سنایا کہ ڈیوڈ کا ریڈیو ہر وقت آن رہنے لگا۔
جو چیز جتنی زیادہ استعمال ہوگی اتنی ہی جلدی اس میں نقص بھی پیدا ہوں گے۔ ڈیوڈ کی جوتنی ہوگی رسی تھی اس کو اور زیادہ کھینچا نہیں جاسکتا تھا وہ ٹوٹنے کی منزل پر تھی۔
ڈیوڈ بیمار ہوگیا بہت علاج کرایا گیا مگر ٹھیک نہ ہوا اور آخر اس نے لندن جانے کی تیاری کرلی۔ مگر روزی نے جانے سے انکار کردیا۔
اس کے جانے کے بعد ڈیوڈ کی ساری املاک کی اور بینک میں جو روپیہ تھا اس کے علاوہ سرکاری واجبات سب اس کے نام ہوگئے اور ڈیوڈ صاحب لندن چلے گئے۔
سرکاری بنگلہ تو خالی کرنا تھا، روزی نے ایک چار کمرے کا فلیٹ خریدا اور وہاں آگئی۔ اس پر ڈیوڈ کے جانے کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کا لباس بدل گیا تھا۔ مگر جسم ویسا ہی تھا اس کی کالی چمڑی پر آج بھی لوگ مرتے تھے۔ اس کی زبان کی کڑواہٹ کم ہوگئی تھی، انگریز کے ساتھ رہنے کا اثر تھا وہ کچھ کچھ انگریزی بھی بول لیا کرتی تھی۔
معیار زندگی اونچا ہوگیا تھا، کسی رشتہ دار سے اس کے تعلقات نہیں تھے۔ پھر ڈیوڈ کے مرنے کی خبر آئی وہ لندن نہیں گئی۔
اب جو آدمی اس کے قریب آیا وہ ایک بوڑھا پارسی تھا اس کی بہت بڑی دکان تھی عورت اس کی مرچکی تھی، پارسیوں میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی برادری سے باہر کی عورت سے تعلق پیدا کریں مگر شیوا جی روزی سے متاثر ہوگیا اور ایسا اس کا دیوانہ ہوا کہ اس کے فلیٹ پر ہی رہنے لگا۔ پارسیوں میں اولاد تو بہت کم ہوتی ہے شیوا جی کی تو تھی ہی نہیں۔ اس نے روزی سے شادی کا ارادہ کیا مگر اس کی برادری نے اتنی شدید مخالفت کی کہ وہ گھبرا گیا۔ مگر روزی کو اس نے چھوڑا نہیں دو بنگلے اور دو دکانیں اس کی تھیں، بنگلے بڑی ہوشیاری اور ہنرمندی سے روزی نے اپنے نام کرائے، شیوا جی کی برادری کو ذرا ہوا نہیں لگی۔ شیوا جی کے اخراجات بہت بڑھ گئے، روزی نے اس کو اس قدر مصروف کردیا کہ بیچارہ شیوا جی بہت جلد خرچ ہوگیا۔
روزی تو اپنا کام کرچکی تھی، اس کو مریل شیوا جی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ شیوا جی کے لاکھوں روپے کے بنگلے تو روزی کے نام ہیں......اب کیا ہوسکتا تھا۔
روزی کا یہ مشن بہت تیزی سے شروع ہوا اور جلدی ختم بھی ہوگیا۔
روزی نے ان بنگلوں کو کرائے پر چڑھا دیا۔ اور خود فلیٹ میں رہتی رہی۔
اس کے پرکشش جسم میں ذرا تبدیلی نہیں آئی تھی اس کی چال دیکھ کر بڑے بڑوں کی رال ٹپک پڑتی تھی اس کا کالا رنگ اور چمکدار ہوگیا تھا۔ آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی تھی۔ وہ مشروب نہیں پیتی تھی مگر اس کی نشیلی آنکھیں ہر وقت نشے میں رہتی تھیں۔ وہ زبان سے

اب بھی کم بات کرتی تھی اس کا بدن زیادہ باتیں کرتا تھا اس کے قریب جانے والا صرف اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ اس کی کالی شخصیت کا سحر مردوں پر بہت تیزی سے اثر کرتا تھا۔

شیواجی کے بعد روزی کے حصے میں دو مرد اور آئے۔ دونوں عمر رسیدہ اور دولت مند تھے۔ دونوں بہت جلد بھگت گئے اور ان سے بھی روزی کو ٹھیک ٹھاک فائدہ ہوا۔ دونوں شریف تھے۔ عزت دار تھے، دونوں اپنی معصومیت کا شکار ہو گئے۔ شکاری نے دو کانٹے تھیلے میں ڈالے اور دوسرے گھاٹ پر روانہ ہوا۔ اب روزی کے پاس بہت دولت تھی۔ شہر کی بہت ساری جائیداد اس کے نام پر تھی۔ وہ جس علاقے میں رہتی اس میں کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنی کھال میں مست ہے، خود غرضی اور مطلب پرستی یہاں پر عام ہے کسی عورت پر کسی مرد کا کنٹرول نہیں ہے۔ یہ دیسی ہیں۔ مگر ان کے اندر انگریز گھسا ہوا ہے۔

شام کو بن ٹھن کر باہر جاتا اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ واپس آنا فیشن ہے۔ جو خالی آئے تو ماں باپ کو فکر ہوتی ہے اسی ماحول میں روزی کی طرف کون نظر آتا ہے۔

وہ عورتوں سے دور رہا کرتی تھی مرد خود بخود اس کے قریب آجاتے تھے۔ پھر وہ ان میں سے انتخاب کرتی، کون کتنے پانی میں کھڑا ہے، عمر کے کس حصے میں ہے دنیا میں، کتنے دن اس کا رہنے کا ارادہ ہے۔ وہ کتنے دن میں اس کو ٹھکانے لگا سکتی ہے اور بھی بہت کچھ وہ دیکھتی تھی اس کا تجربہ اس کو سب بتا دیتا تھا۔ ذات پات عمر مذہب کالا گورا اس کا معیار نہیں تھا اس کا معیار اس کی جیب تھی اس میں وہ اتنی ہوشیار ہو گئی تھی کہ ایک دو ملاقاتوں میں ہی پرکھ لیتی تھی۔

اس طرح ریکارڈ پر سات بوڑھے روزی کے جال میں پھنسے، ان سب کی جمع شدہ پونجی روزی کے حصے میں آ گئی، قانونی طور پر روزی کے ہاتھ صاف تھے اس نے کسی کو قتل نہیں کیا، کسی کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ نہیں ہوئے اس نے اپنے شوہر کو خوش رکھا ہر شوہر نے اس کو جو کچھ دیا اپنی خوشی سے دیا۔ اس کا بنیادی انتخاب اتنا دیکھ بھال کر اور شوہر کے دوستوں عزیزوں یا اس کی سابقہ اولادوں سب پر اس کی نظر ہوتی تھی جہاں زیادہ الجھاؤ ہوتا وہاں پر ہاتھ ڈالتی ہی نہ تھی۔ وہ نہایت معصومیت سے اور پیار بھری عیاری سے کام کرتی تھی۔ اگر شکار زیادہ پھڑ پھڑاتا تو پہلے ہی اپنے نام کرا لیتی۔ اور اگر چالاکی کرتا تو دور کھڑی ہو جاتی۔ یہ کام وہ جب کرتی جب شکار کے دماغ میں وہ گھس جاتی۔ اب شکار ہوشیاری دکھاتا ضرور مگر کھوپڑی میں کالی کا تراشا ہوا چمکدار بدن اس کی نیندیں حرام کر دیتا اور وہ پھر کالی کی شرائط ماننے کو راضی ہو جاتا۔

کالی کے انداز نرالے تھے وہ ہر مرد کو ایک ہی طرح ڈیل نہیں کرتی تھی پہلے آدمی کی نفسیات کا مشاہدہ کرتی اس کی پسند پر غور کرتی اور خود کو اس کے عین مطابق ڈھال لیتی آدمی سمجھتا یہ میری پسند کے مطابق ہے اور جب تک اس کے مطالبات تسلیم نہ ہوتے اس وقت تک ''کیجئے نظارہ دور دور سے۔'' وہ خوب جانتی تھی کہ تجربہ کار اور عمر رسیدہ مرد کی خواہشات گو کہ آخری اسٹیج پر ہوتی ہیں مگر ان میں شدت بہت ہوتی ہے۔ وہ اپنے طور طریقوں اور انداز سے اس شدت میں اور اضافہ کرتی مگر دور دور سے اور شکار خود جال میں آنے کو بے چین ہو جاتا۔ اس کا طریقہ بڑا سادہ اور انسانی نفسیات کے عین مطابق تھا، جو چیز آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے اس کی قدر بھی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ جو محنت اور کوشش سے بھی نہ ملے تو ضد پیدا کرتی ہے اور چیلنج بن جاتی ہے التجا سے نہ ملے تو دولت اور زور بازو استعمال کرنا پڑتا ہے اس پر بھی کامیابی نہ ہو تو پھر قدموں میں سر ڈال دو سودائی اپنی روایت پر آ جاتا ہے۔

مگر روزی کے ساتھ اتنی لمبی کہانی نہیں ہوتی تھی دولت پر آ کر بات ٹھہر جاتی تھی اور وہ اپنی من مانی کر لیتی تھی۔ آج کل وہ آزاد تھی اس کا آخری شکار بھی داغ مفارقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ دے گیا تھا۔

ابھی وہ کچھ دن ریسٹ کرنا چاہتی تھی، ہر مسافر کی طرح وہ پڑاؤں پر آرام کر رہی تھی۔ اس کے ارد گرد کوئی نہ تھا اس نے کسی کو قریب نہیں رکھا تھا اس کے پاس گاڑی تھی مگر ڈرائیور نہیں تھا گھر تھا مگر کوئی ملازم نہ تھا وہ خود اپنے کام کرتی تھی اپنی ذرا سی بات بھی آؤٹ نہیں کرتی تھی۔ کسی عورت کو اس نے اپنا دوست نہیں بنایا تھا کسی کو وہ ملنے نہیں جاتی تھی اس کے راز اس کے پاس تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا خاندانی کام کیا ہے اس کی ماں کیا کرتی تھی باپ کیا کرتا تھا اور عزیز کیا کرتے تھے۔ اب وہ جس مقام پر تھی وہاں پر اس کو کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ مگر گل خان ڈرائیور نے بڑی آسانی سے پہچان لیا مگر وہ اس کے سامنے نہیں آیا۔

گل خان بھی اب پہلے والا گل خان نہیں تھا۔ وہ روزی کے ٹھاٹ اور گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور اس کو جستجو لگ گئی آخر صرف دس سال میں اس کے پاس اتنی دولت کیسے آ گئی؟ وہ بھی ضد کا پکا آدمی تھا اس نے ڈیوڑھے شروع کیا اور آگے بڑھتا گیا، ہر بار وہ سمجھا کہ یہ شاید آخری ہے مگر اس کی حیرت بڑھتی گئی ہر بار روزی کا شوہر مر گیا، قانونی طور پر وہ اپنی موت مرا، اس لئے روزی پر کسی نے کبھی شک نہیں کیا۔

گل خاں کا ایک دوست تھا وہ ایک وکیل کا منشی تھا اس کے پاس گل خان کا روز کا جانا آنا تھا۔ آخر گل خان نے اپنی جستجو کا ذکر ذاکر خان سے کر دیا۔ بولا۔ ''یار میں حیران ہوں روزی کا ہر شوہر مرتا چلا جا رہا ہے اور روزی پر اب تک کسی نے انگلی نہیں اٹھائی ہے۔ ہر شوہر کی جائیداد اس کو مل رہی ہے۔ اس کالی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، ایک زمانے میں وہ میرے سر پر بھی سوار تھی۔''

ذاکر خان بولا...... ''تجھے کیا اس کے شوہر مرتے گئے وہ اور کرتی گئی۔ ظاہر ہے شوہر کی جائیداد تو اس کو ہی ملے گی۔''

''بات اتنی ہوتی تو ٹھیک تھی مگر تو ذرا غور کر اس کا ہر مرنے والا شوہر بوڑھا تھا۔ وہ چن چن کر بوڑھے شوہر کرتی رہی اور بوڑھے ہو کے میں بدہضمی کر جاتے ہیں اور جلدی گزر جاتے ہیں۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ پلاننگ ہوتی ہے، تو نے اس عورت کو نہیں دیکھا آج بھی وہ مردوں کو بے وقوف بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس کے جسم میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی پتہ نہیں کیا چکر ہے۔'' گل خان بولا۔

''اچھا اس کے بچے کتنے ہیں؟'' ذاکر نے پوچھا۔

''یہ بھی حیرت کی بات ہے اس کے آخری شوہر تک ابھی تک نہیں پہنچا ہوں مگر مجھے یہ پتہ ہے اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔'' گل خان نے بتایا۔

''تو نے اب تک اس کے کتنے شوہر گنے ہیں۔'' ذاکر ہنس کر بولا۔

''ابے یار میں تو پانچ تک پہنچا ہوں۔'' گل خان بولا۔

''تو ایسا کر اس کے کسی قریب کے آدمی سے دوستی کر لے۔''

''اس نے تو کسی کو نوکر ہی نہیں رکھا گاڑی خود چلاتی ہے۔ کھانا وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھاتی ہے، اس کے قریب کوئی نہیں ہے، جائیداد کے کرائے خود وصول کرتی ہے۔ سارے دن گاڑی لئے پھرتی ہے، کسی پر اعتبار تو کرتی ہی نہیں۔ سارے کام خود کرتی ہے۔ آج کل لگتا ہے فری ہے کوئی دم چھلا اس کے ساتھ نہیں ہے۔'' گل خان نے بتایا۔

ذاکر بولا۔ ''ایک طریقہ میری سمجھ میں آیا ہے مگر ہے بڑا مشکل۔''

''تو بتا تو شاید اس کا کوئی حل نکل آئے۔'' گل خان نے کہا۔

روزی کے لئے کسی شکار کا بندوبست کیا جائے۔'' ذاکر بولا۔

''وہ کس طرح ذرا تفصیل تو بتا؟'' گل خان بولا۔

''کسی ایسے آدمی کا انتظام کیا جائے جو عمر رسیدہ ہو اور دولت بھی اس کے پاس ہو یعنی آنکھ کا اندھا اور

گانٹھ کا پورا، ذرا عاشق مزاج بھی ہو اور روزی پر پہلی نظر میں مر مٹے ایسا مرد روزی کے لئے بہت نرم چارہ ہوگا۔ اور وہ میرے خیال میں جلد از جلد نگل جانا چاہے گی۔“ ذاکر نے بتایا۔

”آئیڈیا تو اچھا ہے مگر ایسا آدمی کہاں ملے گا؟“ گل خان بولا۔

”ہاں یہ کام ذرا مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں ہے میں اور تم اس کے پشت پر رہیں گے، رابطے میں رہیں گے اور ہمارے وکیل صاحب بھی ہماری مدد کریں گے۔“ ذاکر بولا۔

”مگر یار ایسے آدمی کا حصول ہی ایک مسئلہ ہے۔“ گل خان بولا۔

”ہاں ایسا لگتا ہے کیوں نا وکیل صاحب سے مشورہ کریں۔“ ذاکر بولا۔

”تیری ان سے بے تکلفی ہے کہ تو ان سے یہ بات کر سکے گا۔“ گل خان بولا۔

”ارے یار وہ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔ دوستوں کی طرح ہیں۔“ ذاکر بولا۔

”تو ٹھیک ہے بول کب بات کرے گا۔“ گل خان بولا۔

”یہاں پر تو بات کرنا بے کار ہے کیونکہ لوگ آتے رہیں گے پوری بات نہیں ہو سکے گی ایسا کرتے ہیں میں ان سے کہہ دوں گا رات کو ان کے گھر چلیں گے وہیں پر تفصیل سے پورا کیس بتا دیں گے۔“ ذاکر نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کس وقت تیرے پاس آجاؤں۔“ گل خان بولا۔

”میں دفتر چھ بجے بند کرتا ہوں وکیل صاحب بھی اسی وقت گھر جاتے ہیں ان کا گھر شانتی نگر میں ہے، میں تیرے ہوٹل پر آجاؤں گا یہی کوئی آٹھ بجے۔“ ذاکر بولا۔

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔ کاؤنٹر پر کسی کو بیٹھا دوں گا۔“ گل خان بولا۔

وکیل صاحب پچاس سے اوپر کے تھے سٹی کورٹ کے پرانے وکیل تھے۔ ساری عمر شہر میں گزار دی۔ ان کا نام مرزا حیدر علی تھا مگر سب ان کو صرف حیدر کے نام سے جانتے تھے ان کی وکالت خوب چلتی تھی اکثر کیس وہ جیت جایا کرتے تھے۔

انہوں نے بڑے غور سے پوری تفصیل سنی پھر بولے۔

”یار یہ تو بڑی مرد مار عورت لگتی ہے۔“

”سر بات یہ ہے کہ ہمارے بس میں تو اس کا آنا مشکل ہے اس لئے آپ سے مشورہ کیا ہے۔“ گل خان بولا۔

”اس کے خلاف کوئی شکایت یا غیر قانونی کسی حرکت کی رپورٹ بھی نہیں ہے وہ شادی ہی بوڑھوں سے کرتی ہے اور پھر ان کو اتنا کھلاتی ہے کہ بدہضمی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج بھی کراتی ہوگی اور چونکہ مارنا ہی مقصود ہوتا ہے اس لئے بد پرہیزی بھی کراتی ہوگی ظاہر ہے اس صورت میں بوڑھے مریض کو مرنا ہی ہوتا ہے۔ موت ڈاکٹری نقطہ نظر سے بھی طبعی ہوتی ہے اس طرح اس پر کوئی الزام کیا آئے گا۔ نہایت چالاک مجرم ہے اس کو پکڑنا اور ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔“ وکیل صاحب بولے۔

پھر ذاکر نے اپنا آئیڈیا پیش کر دیا اور بولا۔ ”اس طرح اس کے طریقہ کار کے بارے میں پتہ چلے گا۔“ وکیل صاحب نے اس کے آئیڈیا کو پسند کیا مگر سوال پھر وہی سامنے آ گیا کہ ایسا آدمی کہاں ملے گا۔ وکیل صاحب نے کہا۔ ”تم لوگ ابھی جاؤ میں اس پر غور کرتا ہوں اور کوئی راستہ نکالتا ہوں۔“

دونوں چلے آئے اور وکیل صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ”سات شوہروں کو گھاٹ کنارے لگانے والی عورت کے پاس کیا کچھ ہوگا جبکہ اس نے ان سے شادی کی دولت کی خاطر کی ہو اس کا طریقہ واردات بھی نرالا تھا۔ شاید اندرونی طور پر بڑھاپے اور بیمار کے علاوہ بھی وہ کچھ اور طریقہ اس کے مارنے اختیار کا اختیار کرتی

ہو مگر یہ ضرور ہے کہ وہ طریقہ بھی ایسا ہوگا جو اس کو قانونی طور پر گرفت نہیں کرتا ہوگا اگر ایسا نہ ہوتا تو کہیں نا کہیں وہ غلطی کر جاتی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہو مگر وہ دنیا کے سامنے قانون کے سامنے نہیں آئی۔ اس عورت کے پاس بہت دولت ہے کروڑوں کی جائیداد اس کے نام پر ہے ہم نے زندگی بھر سٹی کورٹ کی سیڑھیاں گھسی ہیں اور ہمارے پاس یہ ایک فلیٹ ہے بچوں کے لئے کوئی ڈھنگ کا مکان تک نہیں بنا سکے۔ اور وہ کالی بھنگن جو کل تک گندگی صاف کرتی تھی چوہدرائن بن کر بیٹھی ہے، تف تم پر حیدر علی ایل ایل بی وکیل تم پر۔“ وہ ان ہی سوچوں کے ساتھ بستر پر لیٹ گئے اور سو گئے۔ ان کے خواب میں ایک کالی پری آگئی۔ جس کے پروں پر سونے چاندی کے پرت چڑھے تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھے وہ مسکراتی ان سے دور ہوتی گئی ہر بار ان کی کوشش ناکام ہوئی پھر ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پھر سوچوں میں گم ہو گئے۔ انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

سویرے سب سے پہلے انہوں نے منشی ذاکر خان کو بلایا اور کہا۔ ”میں نے کالی کا کیس لے لیا ہے۔ میں جانوں اور کالی جانے تم اپنے دوست کو بلالو اس کی شرائط طے کر لیتے ہیں۔ شام کو گھر آجاؤ وہیں پر بات ہوگی۔“

دونوں شام کو ان کے سامنے تھے۔ وکیل صاحب بولے۔ ”یہ تو تم جانتے ہو کہ معاملہ کتنا پیچیدہ اور خطرناک ہے، وہ عورت کوئی عام اور سیدھی سادی عورت نہیں ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو نظر آتی ہے اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہو اس نے جتنی ہوشیاری سے دولت جمع کی ہے قانونی طریقہ اگر اختیار کیا جائے اور اس کے بارے میں تحقیقات کروائی جائے تو معاملہ بہت طویل ہو جائے گا اور اس کے کامیاب ہونے کا یقین بھی نہیں ہے آدمی جب پاجامہ بناتا ہے تو ازار بند کی جگہ بھی بناتا ہے۔ اس نے بھی ہر سوراخ ضرور بند کر دیا ہوگا۔ کہیں پر خلا کہیں پر جھول نہیں چھوڑا ہوگا۔

اب اس کا صرف وہی طریقہ ہے جو کہ ذاکر نے پیش کیا ہے اس کے لئے قابل اعتماد اور دلیر آدمی کا انتخاب بھی آسان نہیں ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیر کے شکار کے لئے چارہ لگایا جاتا ہے اور شیر چارہ کھا کر چلا جاتا ہے شکاری کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس کام کے لئے میں کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا اور خود یہ کام کروں گا۔“ وکیل نے کہا۔

”آپ وکیل صاحب!“ ذاکر نے حیرت سے کہا۔

”ہاں میں خود! اس نے اب تک جو کیا ہے میں اس کا توڑ کر سکتا ہوں مگر اس کیس میں تین فریق ہیں میں، تم اور گل خان۔ میری فیس یہ ہوگی کہ جو ملے گا اس کا آدھا میرا ہوگا اور آدھے میں تم دونوں حصہ دار رہو گے۔“ وکیل نے بتایا۔

ذاکر بولا۔ ”مجھے اعتراض نہیں ہے۔“ گل خان نے بھی حامی بھر لی تو وکیل پھر بولا۔

”میں فرنٹ پر رہوں گا، تم دونوں میری مدد کرو گے اندر کے حالات اور اس کا طریقہ واردات میں نوٹ کروں گا تم اس کو ریکارڈ کرو گے اور میری مدد بھی کرو گے میں خود کو بہت بڑی جائیداد کا مالک ظاہر کروں گا اس کے کاغذات بھی پیش کر دوں گا اور ہر طرح اس کی یقین دہانی کرانے کے بعد شادی کی درخواست کروں گا اس کے بعد ظاہر ہے اس کے مطالبات ہوں گے تم ایک وکیل کا کردار کرو گے اور جائیداد کے کاغذات اس کے نام پر تیار کرو گے یہ سب کام بے شک جعلی ہوگا پھر اس سے اس کی شرائط پر میں شادی کروں گا اور خود کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ اور اس کی اصل صورت دیکھوں گا۔“ وکیل نے کہا۔

”جعلی کاغذات پر اس کو اگر یقین نہ آیا تو۔“ ذاکر نے کہا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو، مہریں سب اصل ہوں گی، فارم اصل ہوں گے صرف جو جائیداد تحریر ہوگی اس کا وجود نہیں ہوگا وہ دلی کے باہر کی زمین ہوگی اور ان پر

کاشت دکھائی جائے گی۔"
"اس مشن کا آغاز کب ہوگا؟" گل خان بولا۔
"تم دونوں اس پر نظر رکھو اس کے باہر جانے آنے اور یہ کہ کہاں جاتی ہے کس کس سے ملتی ہے یہ پتہ کرو، میں بھی اپنا روپ بدلتا ہوں، زمیندار بننا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔"

ذاکر اور گل خان اپنے کام میں لگ گئے، ان کو صرف یہ پتہ چلا کہ "وہ صبح کرائے داروں کے پاس جاتی ہے وصولی کرتی ہے پھر بینک میں رقم جمع کرتی ہے۔"

"اب تم ایسا کرو کسی طرح اس کی گاڑی میں خرابی کرو، وہ گاڑی اسٹارٹ کرے تو نہ اسٹارٹ ہو، میں پھر اس کے سامنے آؤں گا اور مدد کروں گا، یہ ایک فلمی سین والی بات ہے مگر یہی کرنا ہے۔"

ذاکر خان نے ایک لڑکے کا بندوبست کیا اور وہ بینک کے باہر کھڑا ہو گیا روزی نے گاڑی کھڑی کی تو وہ لڑکا حسب ہدایت دوڑ کر اس کے پاس گیا اور بولا۔

"میم صاحب گاڑی صاف کردوں فسٹ کلاس۔"

روزی لفظ میم صاحب سن کر مسکرائی اور اس نے لڑکے کو صفائی کا کہہ دیا۔

لڑکے نے کپڑا پکڑا اور صفائی کرنے لگا۔ اور صفائی کرتے کرتے وہ اسٹیئرنگ سیٹ تک چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اس نے بڑی مہارت سے سوئچ بورڈ کے کئی تار توڑ دیئے۔

اور ذاکر کو کام ہوجانے کا اشارہ کیا۔ اور چلا گیا۔ ذاکر نے وکیل کو اشارہ کیا اور وہ بینک کے سامنے گاڑی میں آ گیا، اور اتر کر بینک کے اندر چلا گیا۔ روزی کیشیئر کے پاس کھڑی تھی۔ پھر وہ واپس آئی اس کے دومنٹ کے بعد وکیل بھی باہر آ گیا۔ لباس کے تراش خراش سے زبردست لگ رہا تھا۔

روزی گاڑی اسٹارٹ کر رہی تھی مگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وکیل اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔ "کیا پریشانی ہے میم صاحب؟" روزی نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔"

"آپ میری گاڑی لے جاؤ کوئی فکر نہیں ہے میں آپ کی گاڑی ٹھیک کرا کر آپ کو پہنچا دوں گا۔"

"آپ اپنا پتہ میرے کو دے دو۔" وکیل بولا۔

"آپ کو تکلیف ہوگی، میرا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"میرے کو کیوں تکلیف ہوگی اور ہوگی تو آپ کے واسطے ہم کو منظور ہے۔" وہ بولا۔

روزی نے ایک بھرپور نظر وکیل پر ڈالی، اس کا جائزہ لیا ایک دل فریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اس کے لپ اسٹک سے سرخ کیئے ہوئے ہونٹ اور سرخ نظر آنے لگے اس نے دل میں سوچا۔ "آج کا دن اچھا ہے شکار خود پھندے کی طرف آ رہا ہے۔"

ادھر دوسرا شکاری بھی جال ڈالے بیٹھا تھا۔

روزی نے دروازہ کھولا اور بولی۔

"میں چرچ کے بعد پہلی چھ منزل بلڈنگ کے دوسرے مالے پر ہوں۔ میرے فلیٹ کا نمبر دو ہے۔"

"میں ایسا کرتا ہوں آپ کو ڈراپ کرتا ہوں، دیکھ بھی لوں گا۔"

"جال کی طرف مچھلی خود آ رہی تھی۔" وکیل نے سوچا۔

وکیل نے نیچے سے اس کا فلیٹ دیکھ لیا تھا اور آ گیا گاڑی میں کیا کام تھا اس کو پتہ تھا۔ گل خان نے وہ تار جوڑ دیئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ وکیل اس کی گاڑی لے گیا اور وہ روزی کی گاڑی لے کر اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

پہلی گھنٹی پر دروازہ کھل گیا۔ "آؤ صاحب اندر آ جاؤ۔" وہ بولی۔ وکیل اندر چلا گیا، روزی نے ایک گاؤن پہنا ہوا تھا۔ گاؤن اتنا باریک تھا کہ اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ یہی گاؤن اس کا پہلا جال ہوا کرتا تھا۔ اس کو اپنے ستم گر بدن کے بارے میں پتہ تھا کہ یہ کسی بھی مرد کی مت مارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اس

کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کا انداز بھی ایسا تھا کہ نظر لاکھ بچاؤ پھر بھی پورا نظارہ ہوتا ہی رہے۔

"آپ کیا کرتے ہیں صاحب؟" وہ بولی۔ اس نے پنجرے کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہم کو کیا کرنے کا ہے میڈم، سب نوکر لوگ کرتا ہے۔" وکیل بولا۔

"میرا مطلب ہے آپ کا کیا کاروبار ہے؟" روزی بولی۔

"ہمارا ادھر کافی زمین ہے ادھر سبزی ہوتا ہے بکتا ہوتا ہے۔ ٹرک میں روز ادھر آتا ہے۔" وکیل نے جال کی رسی پر تناؤ بڑھایا۔

"تو یوں بولیں نا کہ آپ زمین دار ہیں۔"

"ادھر تو ہم کم آتا ہے اپنے علاقے میں ہم کو بہت کام ہوتا ہے۔" وکیل بولا۔

"اب تو آپ کو آنا پڑے گا۔" پنجرے کا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔

"کیوں آنا پڑے گا، یہ تو بتاؤ؟" وکیل نے معصومیت سے کہا۔

"میرے پاس نہیں آؤ گے۔" گون ذرا سا سامنے سے خود بخود ہٹ گیا۔

وکیل کی آنکھیں اس نظارے کی تاب نہ لا کر بند ہوگئیں اس کالے پتھر کے جسم میں کیا تھا۔ اس کی لہریں اندر تک جاتی محسوس ہوتی تھیں، وہ پروگرام سے آیا تھا اس پر بھی کالا پتھر اثر کر رہا تھا اور وہ اس کے سحر میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور بولا۔

"تمہارا گاڑی نیچے کھڑا ہے پھر موقع ملا تو آئیں گے۔"

"اتنی جلدی صاحب کچھ دیر اور رکو۔" اس نے وکیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وکیل کے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی گون کے آگے کے بٹن بند نہیں تھے۔ اگر وکیل کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ضرور پوری طرح پنجرے کے اندر ہوتا مگر وہ تو خود جال لے کر آیا تھا۔ آج کی ٹکر میں ربی کا پلڑا بھاری تھا اس نے وکیل کی کھوپڑی میں بھونچال پیدا کر دیا تھا وہ جلد از جلد باہر جانا چاہتا تھا اور پھر وہ دروازے پر آ گیا بولا۔ "پھر آؤں گا ابھی جاتا ہوں۔" روزی نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ دروازے سے باہر تھا۔

باہر آ کر وکیل کو آزادی کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا۔ "کیا عورت ہے آدمی پر سحر کر دیتی ہے۔ اس کو صرف وہی نظر آتی ہے یہ کیا ہے۔ کہیں یہ کوئی اور چکر تو نہیں ہے کہ اس کے سامنے جاتے ہی آدمی بے بس ہو جاتا ہے اس کی مرضی پر چلتا ہے۔ یہ بہت مشکل کیس ہے۔ میری بیس سالہ وکالت کے ریکارڈ پر ایسا کیس نہیں آیا۔ مجھے ذرا سوچ سمجھ کر آگے جانا ہے۔

مگر پوری تیاری سے تو اب بھی گیا تھا کمرے میں جاتے ہی وہ بھاری پڑ گئی اس نے اپنی مرضی کرنا چاہی میں عام آدمی کی طرح ہوتا تو اس کے جال سے نکلنا آسان نہ ہوتا۔"

زندگی مجرموں کے درمیان گزری تھی۔ ہر نوعیت کے کیس لڑے تھے چور، ڈاکو، دادا گیر، جواری بازار حسن کے دلال اور پیشہ کرانے والی ایک سے ایک بگڑی عورت اور نہایت شریف گھرانوں کے درمیان رہنے والی خراب عورتوں کے بارے میں وکیل حیدر جانتا تھا مگر زندگی کا پہلا کیس تھا جس میں وہ وکیل کے کردار سے شامل نہیں تھا اور خود اس کیس کا اہم کردار بننے والا تھا۔

اس نے روزی سے ملنے سے پہلے جو تیاری کی تھی پہلی ملاقات میں ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ ناکافی تھی وہ ذرا سا اور رک جاتا تو روزی نے اس کا دھڑن تختہ کر دینا تھا۔

معاملہ طول پکڑنے والا تھا اس لئے اس نے اپنے ایک وکیل دوست کو راضی کیا اور جو کیس اس کے پاس تھے وہ اس کے حوالے کر دیئے۔ ذاکر نے اس کی پوری پوری مدد کی۔

اس کے بعد اس نے کسی ایسے آدمی کی تلاش شروع کر دی کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ کالی کے حسن و جوانی اور بانکپن کے علاوہ نادیدہ قوت بھی کوئی اس کے ساتھ

تھی اور اس کمرے میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا تھا کہ آدمی خود کو کمزور سمجھتا تھا۔ وکیل تجربہ کار تھا اس کا تجربہ اس کو دوبارہ بغیر تیاری کے غلطی کرنے سے روکتا تھا۔

وہ باہر باہر روزی سے ملتا تو رہا مگر اس کے گھر نہیں گیا۔ حالاں کہ روزی نے اس کو ہر دفعہ دعوت دی اس نے مصروفیت کا بہانہ بنادیا اور کسی ایسے کی تلاش میں پھرتا رہا جو اس حسین شکاری کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ وہ دلی سے باہر چلا گیا۔ اس کو کسی نے بتایا تھا کہ ایک آدمی ہے متھی کے قریب ایک گاؤں میں رہتا ہے اگر مل گیا تو تیرا کام ہو جائے گا۔

بڑی تلاش کے بعد وکیل اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کوئی ہندو تھا۔ دھوتی کرتے اور واسکٹ میں ملبوس تھا عام طور پر ایسا کام کرنے والے ایسا نظر نہیں آتے مگر وہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی تھا اس کی عمر کا اندازہ پچاس کے لگ بھگ تھا۔ وکیل نے اپنا تعارف کرایا۔ اور کہا۔ ”میں آپ کی تلاش میں دلی سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔“

اس نے پوری بات سننے کے بعد اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

”میں تمہارے کام کے بارے میں اندازے کرسکتا ہوں۔ میرے پاس جو آتا ہے وہ بے وجہ نہیں آتا۔ تم اپنا مقصد بیان کرو اگر کرسکا تو منع نہیں کروں گا مگر یاد رکھنا جو بتاؤ سچ بتانا مجھے تم سے کچھ لینا نہیں ہے میں کسی سائل سے کچھ نہیں لیتا۔“

وکیل نے کالی کے بارے میں سب کچھ جو اسے پتہ چلا تھا بیان کردیا۔ تو وہ بولا۔

”اس ساری کہانی میں تم کہاں ہو۔“ وہ بولا۔

”میں آخری آدمی ہوں جو اس کے قریب گیا ہوں۔“ وکیل نے کہا۔

”میرا نام یاد رکھنا میرا نام تلسی رام ہے، مجھے پتہ ہے تمہارے من میں وہ کالی عورت نہیں ہے تمہارے من میں اس کی کمائی دولت ہے، بے شک یہ درست ہے کہ اس نے غلط طریقہ پر دولت جمع کرلی ہے مگر تمہاری نظر بھی تو اسی پر ہے۔ اب بتاؤ تمہارا اور اس کا دونوں کا مقام تو ایک ہی ہوا ناں۔“ تلسی رام نے کہا۔

”آپ نے درست کہا گرو مگر اس نے انسانوں کو دولت کی خاطر مارا بھی ہے میں تو ایسا نہیں کرنا چاہتا۔“ وکیل نے جواب دیا۔

”تم مافوق الفطرت واقعات پر یقین کرتے ہو۔“ وہ بولا۔

”سامنے نظر آئے تو یقین تو کرنا ہی پڑے گا۔“ وکیل بولا۔

”پراسرار علوم ایک حقیقت ہے اس پر سائنس نے بھی تحقیق کی ہے مگر وہ بھی اب تک کوئی حتمی توجیہ پیش کرنے میں ناکام ہیں۔ میں ایک بہت ہی معمولی سا طالب علم ہوں شہروں سے دور یہاں پر اسی کی خاطر پڑا ہوں، یہ میرا شوق ہے پیشہ نہیں ہے تم نے سچائی سے بیان دیا ہے۔

تمہاری یہی سچائی مجھے مجبور کرتی ہے کہ تم کو کوئی راستہ دکھاؤں۔ تم کو یہاں رکنا ہوگا، زیادہ نہیں صرف ایک رات۔ تم یہاں رہو گے اور میں کالی کے پاس جاؤں گا۔“

”آنے جانے میں تو پوری رات گزر جائے گی گرو۔“ وکیل نے کہا۔

”تمہارا آنا جانا اور میرا آنا جانا دونوں الگ الگ ہیں۔ تم خوابوں کی طاقت سے واقف نہیں۔

خوابوں کی طاقت ذہنی طاقت سے بھی بڑی ہے انسان کے بس میں اگر خواب دیکھنا آجائے تو وہ کیا حاصل نہیں کرسکتا مگر کون ہے جو اپنی مرضی سے خواب دیکھتا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے خوابوں کو تابع کرنے کے لئے چاند کی مدد لینا ہوتی ہے۔ کسی ایسے مقام پر جہاں زندگی دور دور نہ ہو ریت کے میدان میں چاند پر نظریں گاڑنی پڑتی ہیں یہ عمل کتنے عرصہ کا ہے اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہوتا، میں نے بیس سال ایسے صحرا میں گزرے ہیں، بیس سال سے برابر یہ مشق کر رہا ہوں اب کچھ کچھ مجھے اندازہ ہوا ہے کہ میں اپنے من پسند

خواب اپنی مرضی سے دیکھ سکتا ہوں۔ میں رات کو اس کالی آفت کے گھر خواب میں جاؤں گا اور پھر تمہیں بتاؤں گا کہ وہاں پر کیا ہے۔ تم میرے پاس ہو گے مجھے جگانے کی ہرگز کوشش نہ کرنا اور مجھ سے دور رہنا۔ بتی بجھا دینا۔“

تلسی رام نے پوری تفصیل بتائی۔ وکیل نے زندگی میں پہلی بار ایسی انوکھی بات سنی تھی۔

تلسی رام پھر بولا۔ ”میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ رہا ہوں، مگر میری یہ بات یاد رکھنا کہ یہ سب کچھ انسانی ذہن میں چھپے ہوئے علوم ہیں جو اگر انسان اپنی دسترس میں لے آئے تو انسان اس سے عوامل حاصل کرلیتا ہے جو دوسروں کے لئے ممکن نہیں ہوتے۔ میں نے تمہیں یہ سب اس لئے بتادیا کہ تم ایک پڑھے لکھے آدمی مجھے نظر آئے ہو، میں کوئی جادوگر نہیں ہوں میرے پاس جادو ٹونے یا سفلی کا ہیر نہیں ہے، میں اس لائن کا آدمی ہوں ہی نہیں۔ تمہارا معاملہ بھی میں نے تجرباتی نقطہ نظر سے لیا ہے۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آرہی ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”آپ کی ہر بات میرے لئے نرالی ہے۔ میں نے زندگی بھر وکالت کی ہے۔ مجرموں کے درمیان رہا ہوں، مگر آپ کے پاس آکر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ مجھے از سر نو پڑھنا ہوگا۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ تلسی رام بات کاٹ کر بولا۔

”ڈاکٹر کا کام قانون پڑھنے والا بڑے سے بڑا وکیل نہیں کرسکتا۔ لوہار کا کام درزی نہیں کرسکتا، ہر کوئی اپنا کام کرتا ہے اس کو اسی کام میں مہارت ہوتی ہے۔ اب تم کسی بھی نئے کام کو ہوشیاری سے نہیں کر پاؤ گے تم وکیل ہو وہی رہو، میں نے جس کام میں وقت برباد کیا ہے میں بھی اسی کے لائق ہوں، انسان ایک وقت میں صرف ایک کام میں مہارت حاصل کرتا ہے، ہر کام کی طرف دوڑنے والا کسی کام کا نہیں رہتا۔“

میں نے گردن ہلا کر اس کی بات کو تسلیم کیا اور

کہا۔

”اس سادہ پرستی بد اعتمادی اور کم نگاہی کے زمانے میں ایسا نظر نہیں آتا جس سے کچھ امید ہو ہر کوئی اپنی اپنی میں لگا نظر آتا ہے۔“

”تم نے اپنا تجربہ بیان کیا۔ مگر ایسا نہیں ہے تلاش کرنے پر گوہر مقصود مل ہی جاتا ہے۔ تم مجھ تک آگئے اس لئے کہ تم نے تلاش کیا۔“ تلسی رام بولا۔

”آپ کے خیال میں کیا ایسا ہوسکتا ہے کسی خاص مقام پر کسی خاص آدمی کے سامنے جائے اور بے بس ہوجائے کیا کوئی ایسی طاقت ہے کہ آدمی کا دماغ اور جسم اس کے کنٹرول میں نہ رہے۔“ میں نے سوال کردیا۔

”سب کچھ انسان کے اندر ہے تمہاری نگاہوں کے سامنے جو کچھ ہے اس کو آنکھ دیکھتی ہے دل تسلیم کرتا ہے، دماغ گواہی دیتا ہے اور تم تسلیم کرتے ہو حواس خمسہ کے سارے عناصر جس بات پر متفق ہوتے ہیں وہ بات تسلیم کرلی جاتی ہے۔ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ آنکھ نہیں دل دیکھتا ہے۔ دماغ دیکھتا ہے اس کو دل کی بینائی کہا جاتا ہے اس میں آنکھ کا دیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ چشم تصور کیا ہے اس میں صدیاں آباد ہیں لمحے کا ہزارواں حصہ اس کے لئے کافی ہے۔ تصور کیا اور مشکل دماغ میں آجاتی ہے۔ تم اس رابطے سے گزرے وقت کے چہرے بھی دیکھ لیتے ہو یہ انسان کے اندرونی رابطے ہیں جن کے لئے آنکھ کی بینائی ضروری نہیں ہے۔“

”آپ کا تجربہ اور علم دونوں قابل تحسین ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس تمہارے کھانے کو اور خاطر کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ اگر بھوک لگی ہے تو باہر جاؤ شاید کچھ مل جائے مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری اتنی سی بھی مدد نہیں کرسکتا۔“ تلسی رام بولا۔

”آپ کے اخلاق نے مجھے متاثر کیا ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر لیٹ جاؤ میں بارہ کے بعد دلی جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

وکیل زمین پر پڑی ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ وہ بھی کچھ فاصلے پر ہی لیٹ گیا۔ وکیل تھکا ہوا تھا سو گیا۔ سویرے اس کی آواز پر وکیل کی آنکھ کھلی اس نے مسکرا کر وکیل کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں دیکھ آیا ہوں، اس عورت کے پاس کوئی سفلی یا کالا علم نہیں ہے اس کا باپ جو کر مر گیا ہے اس نے ایک چیز اس کو دی ہے، وہ ایک ریٹھا ہے جیسا کہ دھوبیوں کے پاس ہوتا ہے اس میں ایک سوراخ ہوتا ہے بس اتنا کہ سوئی اس کے اندر جاتی ہے اس میں قدرتی کالک ہوتی ہے دھوبی اس کالک کو نشان کے طور پر کپڑوں کو لگاتا ہے۔ وہ ریٹھا اس نے کسی دھوبی سے لیا جو کہ کالک سے پاک ہوچکا تھا اس کی کالک دھوبی خرچ کرچکا تھا۔ یا یوں سمجھ لو کہ اس کی کالک، کالی روزی کے بدن پر آگئی تھی۔ ریٹھے کے اندر کی کالک تو اس کے بدن پر چڑھ جانے میں دھوبی نے اس کے باپ کا ساتھ دیا تھا۔ ریٹھے کی کالک بڑی مضبوط ہوتی ہے کپڑا اپھٹ جاتا ہے مگر نشان نہیں جاتا۔ جب تک کالی روزی کے بدن پر یہ کالک ہے اس کا بدن ایسا ہی جوان رہے گا، میں نے اس سے خود پوچھا ہے اس نے خواب میں مجھے اپنی حقیقت بتائی ہے۔ اس کی کالک ختم ہونے کا طریقہ بھی اس نے بتایا ہے۔“

”وہ بھی بتادیں۔“ وکیل نے پوچھا۔

”اس کا باپ مرگیا ہے۔ مگر دھوبی زندہ ہے۔ وہ دھوبی جب تک زندہ ہے اس کا سحر کالی پر ہے اس کے سامنے بڑے بڑے طرم خان بھی موم کی طرح پگھل جائیں گے اور اس کے حشر برپا کرنے والے بدن پر اپنا سب کچھ مٹائیں گے، تم اگر اس دھوبی کو تلاش کرلو اور اس کا کام تمام کرسکو تو کالی خود بخود ایک عام عورت بن جائے گی۔“ تلسی رام نے بتایا۔

”آپ میری مدد اس سلسلے میں کریں گے کچھ۔“ وکیل نے پوچھا۔

”نہیں، میں نے تم کو بتادیا ہے کہ میرے پاس جادو ٹونا منتر کچھ نہیں ہے میں خوابوں کا راہی ہوں۔ اب

تمہارا میرے پاس کچھ کام نہیں رہا میں جو کرسکتا تھا میں نے کردیا ہے۔“ وکیل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دلی واپس آگیا۔

گل خان اور ذاکر اس کا انتظار کررہے تھے۔ اس نے دونوں کو پوری تفصیل بتائی تو گل خان بولا......

”کمشنر ڈیوڈ کے بنگلے میں ایک دھوبی بھی ہوتا تھا۔ اس کا بڑا عجیب نام تھا۔“ گل خان ماتھے ہاتھ مار کر یاد کرتا رہا، پھر بولا۔ ”ہاں یاد آیا اس کا نا غولو تھا۔

شاید یہ وہی آدمی ہو جس کی ہم کو تلاش ہے تم اب صرف یہ پتہ کرو کہ یہ غولو دھوبی کہاں ہے؟“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب پتہ کریں گا چھوڑے گا نہیں۔“ گل خان بولا۔

”روزانہ تم میرے گھر دونوں آؤ گے اور رپورٹ کروگے۔“ وکیل نے کہا۔

ذاکر کو تو دفتر کے کام بہت تھے مگر گل خان لگ گیا کھوج میں۔ پہلے وہ کمشنر کے اس بنگلے پر گیا جس میں وہ رہتا تھا اب وہاں پر ایک وزیر رہتا تھا ایک بیرے سے اس کی ملاقات ہوئی اس نے بتایا کہ ”کمشنر ڈیوڈ کے زمانے میں بھی اس کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے ادھر ایک ہمارا دوست ہوتا تھا بہت دن ہوئے ملاقات نہیں ہوا، اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔“

بیرے نے کہا۔ ”کون تھا وہ اس کا نام بتاؤ؟“

”اس کا نام غولو تھا۔ وہ دھوبی تھا۔“ گل خان بولا۔

”مشکل ہے سب نئے ملازم آگئے ہیں پرانے تو چلے گئے دھوبی تو ہے مگر اس کا نام مجید ہے۔“ بیرے نے بتایا۔ گل خان سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”تم ایسا کرو کہ میرے کو اس سے ملواؤ یہ برادری کا لوگ ایک دوسرے کو جانتا ہے شاید اس کو کچھ پتہ ہو۔“

بیرا بولا۔ ”اچھا آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے گیٹ پر کھڑے سنتری کو اشارہ کیا اور گل خان کو اندر لے گیا۔ وہی کمپاؤنڈ تھا اور وہی دھوبی کا حوض تھا اور اس پر جامن کا پیڑ کھڑا تھا۔ اور دھوبی کپڑوں کی ڈھیری کے پاس کھڑا ریٹھے میں سوئی ڈال ڈال کر نشان لگا رہا تھا۔ بیرے نے اس کے قریب جاکر کہا۔ ”اوئے مجیدے دیکھ یہ بندہ کسی کی کھوج میں پریشان ہے، تیرے کو کچھ پتہ ہے تو اس کی مدد کردے۔“

”مجیدا کام میں لگا رہا مگر بولا۔“ ہاں بول کیا بات ہے۔“

”بات یہ ہے ہمارا ایک دوست ادھر ہوتا تھا میں بھی اس بنگلے میں ڈرائیوری کرتا تھا۔ وہ تیرا کام کرتا تھا اس کا نام غولو تھا ابی ہم باہر سے آیا ہے۔ اس کا کچھ امانت ہمارے پاس ہے وہ ادھر نہیں ہے اس کا جگہ پر تم ہے اگر تم کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہے تو بتاؤ۔“

مجیدے نے کپڑا ایک طرف ڈال دیا، سوئی ریٹھے کے اندر ڈال دی اور سوچتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس علاقے کے دھوبیوں کا پنچ تھا اس کی بات سب مانتے تھے۔ میرے آنے سے پہلے ہی وہ یہ بنگلہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے کہ کہاں گیا ہے؟“

”تمہاری نظر میں کوئی ایسا آدمی ہو جو اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو، بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے لئے بہت ضروری سامان ہے ایک آدمی نے دیا ہے۔“

مجیدے نے ذرا غور کیا اور کپڑا اٹھا کر اس پر تین لائین سوئی سے لگائیں اور بولا۔ ”جاگیردار احمد کا بنگلہ ہے اس کا نمبر تو پتہ نہیں تم کینٹ اسٹیشن کی ریلوے کراسنگ سے گذری کی طرف آؤ گے تو وہ بنگلہ تم کو ملے گا۔ پرانے زمانے کا پتھر کا بنا ہوا ہے اس میں ایک دھوبی ہے شانتی لال وہ غولو کی ذات کا ہے اس کو تو پتہ ہوگا ضرور۔“

بیرے نے کہا۔ ”اچھا بھائی تم ابھی جاؤ میرے کو بھی بہت کام ہیں۔“

گل خان نے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ ریلوے کراسنگ کے اس نے سڑک دونوں طرف نظریں دوڑانا شروع کردیں۔ پہلے

پتھر کا جو بنگلہ اس کو نظر آیا اس نے اس کے بارے میں پتہ کیا کہ یہ جاگیردار احمد کا بنگلہ ہے اور پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ اسی اور چلتا گیا۔ آخری سرے پر اس کو وہ بنگلہ مل گیا۔ اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ ''یہی جاگیردار احمد کا بنگلہ ہے۔'' تو اس نے چوکیدار سے کہا۔

''ادھر ایک دھوبی ہے اس کا نام شانتی لال ہے مجھے اس سے ملنا ہے۔''

چوکیدار چونک کر بولا۔ ''اوئے تم کافر کو کیوں ملتا ہے۔''

گل خان نے مسکرا کر کہا۔ ''اس سے کسی کا پتہ لینا ہے۔''

''تو پھر ایسا بولو نا ہم سمجھا وہ کافر تمہارا دوست موست ہے۔'' چوکیدار بولا۔

''ابھی تم ادھر رکو میں اندر جاتا ہوں اس کو بلا کر ادھر لاتا ہوں اندر جانے کا آرڈر جاگیردار صاحب کا نہیں ہے۔'' اور چوکیدار اندر چلا گیا مگر اکیلا آ گیا اور بولا۔ ''وہ ادھر نہیں ہے کہیں گیا ہے کپڑا کے واسطے تم ایسا کرو کل سویرے آ جاؤ وہ ادھر ہوں گا تم ملاقات کرنا۔'' چوکیدار نے مشورہ دیا۔

گل خان بولا۔ ''ابھی انتظار کروں تو کیسا ہے۔''

''ابھی اس کا بھروسہ نہیں ہے وہ دو تین ہوٹل کا کام کرتا ہے ادھر سے سینٹرل ہوٹل جائے گا۔ پھر اور کدھر جائے گا تم کب تک انتظار کرے گا کل آ جاؤ یہ ٹھیک ہے۔'' چوکیدار بولا۔

''اچھا خان تمہارا بات ہمارا سمجھ میں آ گیا۔'' وہ پشتو میں بولا اور ہاتھ ملا کر واپس آ گیا۔

اور پوری رپورٹ وکیل صاحب کو دے دی۔

دوسرے دن نو بجے گل خان موجود تھا۔ چوکیدار بولا۔

''ابھی تم تھوڑا رکو جاگیردار صاحب جائے تو تم کو اندر لے کر جائے گا۔'' گل خان گیٹ کے پاس کھڑا ہو گیا، آدھے گھنٹے کے بعد ایک کار باہر گئی تو چوکیدار اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''ابھی تم میرے ساتھ اندر چلو صاحب گیا۔'' چوکیدار نے گل خان کو گیٹ کے اندر کیا اور گیٹ بند کر دیا۔ بولا۔ ''آؤ۔ اندر۔'' بنگلہ تو زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا مگر باغ بڑا تھا۔ ایک طرف سرونٹ کوارٹرز دو منزل بنے تھے، نیچے کاروں کے گیراج تھے۔ ایک طرف دھوبی کا حوض تھا، اور دھوبی اس پر کپڑے دھو رہا تھا۔ وہ حوض کے اندر کھڑا تھا اور ایک بڑے سے پتھر پر کپڑے پٹخ رہا تھا چوکیدار نے اس کے قریب جا کر کہا۔

''اوئے شانتی یہ آدمی تم کو پوچھتا ہے تم اس سے بات کرو ہم آتا ہے۔''

شانتی نے اجنبی نگاہوں سے گل خان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم کون ہو مجھے کیوں پوچھتے ہو؟''

''میرے کو ایک آدمی کا پتہ کرنا ہے۔'' گل خان بولا۔

''بولو کس کا پتہ کرنا ہے؟'' شانتی بولا۔

''کمشنر کے بنگلے میں ایک دھوبی ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام غولو تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟'' گل خان بولا۔

''تم کو اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟'' شانتی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''اس کے واسطے میں کچھ سامان لایا ہوں اس کے کسی دوست نے دیا ہے وہ دینا ہے۔'' گل خان نے وہی پرانی کہانی دہرائی۔

''اس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے بہت بوڑھا ہو گیا ہے اب وہ کسی بنگلے پر کام نہیں کرتا گھر پر پڑا رہتا ہے میں تم کو اس کے گھر کا پتہ دیتا ہوں تم ادھر چلے جاؤ۔''

گل خان بولا۔ ''بتاؤ۔''

''گاندھی گارڈن کے پاس سرکاری کوارٹر بنے ہیں ادھر سے ایک راستہ ندی کو جاتا ہے، تم اس پر چلے جانا، ندی میں دھوبی کپڑے دھو رہے ہوں گے ان لوگوں کے گھر بھی ندی پار کر دوسری طرف ہیں آگے کمہار پاڑہ ہے تم کسی دھوبی سے غولو کا مکان پوچھ لینا سب جانتے ہیں۔''

گل خان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر چوکیدار کا شکریہ ادا کیا اور گاندھی گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ گاندھی گارڈن آ کر سرکاری کوارٹر کے روڈ پر آ گیا، گارڈن کے مشرقی کونے پر آ کر اس کو ندی کی اترائی نظر آ گئی اور وہ ادھر مڑ گیا۔ ندی کی اترائی ختم ہوئی اور ایک سیمنٹ کا بارہ چودہ فٹ کا روڈ آ گیا۔ اس پر ذرا ہی چلا تھا کہ وہ دھوبیوں کے قریب آ گیا جو کہ کپڑے پٹخ پٹخ کر دھو رہے تھے اور منہ سے آوازیں بھی نکال رہے تھے ان کی عورتیں دھلے کپڑوں کو رسیوں پر پھیلا رہی تھیں کچھ گدھے بھی ندی میں چر رہے تھے اور بچے ندی کے پانی میں نہا رہے تھے۔ دھوبی اپنی دھوبنوں کے ساتھ بات چیت بھی کر رہے تھے وہ ایک دھوبی کے پاس کھڑا ہو گیا دھوبی کی نظر اس پر پڑی تو اس کا ہاتھ رک گیا پھر اس نے اس کے پاس کھڑی دھوبن کو دیکھا اور ذرا تیز آواز میں بولا۔

''کیوں کھڑا ہے کیا کپڑے لے کر بھاگے گا۔''

گل خان نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں پہلوان تم نے غلط سمجھا ہے۔''

''تو پھر تو ہی بتلا دے۔'' لفظ پہلوان نے اس کا لہجہ نرم کر دیا تھا کیونکہ وہ کسی طرف سے پہلوان نہیں تھا۔

''مجھے ایک پتہ کرنا ہے۔ تمہاری بستی میں غولو دھوبی رہتا ہے اس کا گھر پتہ کرنا ہے۔'' گل خان بولا۔

''ارے اس کا کیا کرے گا اس کا تو چل چلاؤ کا وقت ہے اب۔'' دھوبی بولا۔

''مجھے اس سے ملنا ضروری ہے۔ پہلوان۔'' گل بولا۔

لفظ پہلوان دھوبی کو اچھا لگ رہا تھا بولا۔ ''تو ایسا کر اسی روڈ پر چڑھائی چڑھ کر چلتا جا تھوڑی دور چلے گا تو ایک کمہار کا گھر آ جائے گا اس سے اور ذرا چلے گا تو تین چار گدھے ایک گھر کے سامنے کھڑے ہوں گے بس وہی گھر غولو کا ہے۔'' دھوبی نے بتایا۔

گل خان سیدھا چل دیا اس کی بتائی ساری

شاپنگ

ملازم نے باس سے کہا۔ ''سر! کیا مجھے کل کی چھٹی مل سکتی ہے؟ مجھے عید کی شاپنگ کے سلسلے میں بیوی کے ساتھ بازار جانا ہے''

''ہرگز نہیں!'' باس نے غصے سے کہا۔ ''دیکھ نہیں رہے ہو، دفتر میں کتنا کام باقی ہے۔''

''بہت بہت شکریہ سر!'' ملازم نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

(سعد پرویز۔ کراچی)

نشانیوں کے بعد ایک مکان کے سامنے اس کو گدھے نظر آ گئے وہ ادھر مڑ گیا۔ دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی اس نے پیلا بلاؤز اور نیلا لہنگا پہنا ہوا تھا۔ اور جوان عورت تھی گل خان اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔

''یہ غولو دھوبی کا گھر ہے؟''

عورت نے اس کو سر سے پیر تک دیکھا اور بولی۔ ''ہے تو تو ئے کیا کام ہے؟''

گل خان نے کہا۔ ''مجھے اس سے ملنا ہے میں اس کا پرانا ملنے والا ہوں سنا ہے وہ بیمار ہے۔''

''تو نے ٹھیک سنا ہے پر اب کیا ملے گا اوکی تو آواج ہی بند ہے بس آخری سمے آ گیا ہے۔'' عورت بولی۔

''مجھے اس کے پاس لے چلو زندگی میں دیدار تو کر لوں گا۔'' گل خان بولا۔

''اچھا آ جا میرے ساتھ۔'' وہ گل خان کو لے کر اندر چلی ایک نہایت نیچی چھت کا کمرہ تھا اندر اندھیرا ہو رہا تھا، مگر اتنا نہیں کہ کچھ نظر نہ آئے۔ گل خان نے ایک انسانی ڈھانچے کو ایک میلی سی چادر پر پڑے دیکھا اور پرانے غولو کے خدوخال ذہن میں لایا اور پھر دونوں کو ملایا مگر پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے عورت سے پوچھا۔ ''یہ تو بہت بدل گیا ہے یہ وہی غولو ہے جو کمشنر کے بنگلے میں کام کرتا تھا۔'' عورت نے ماتھے پر

ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں یہ وہی ہے پر اس کو تو بیماری نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب کیا رکھا ہے ہڈیوں کی مالا ہے۔ سانس کی ڈوری اب ٹوٹی کہ تب ٹوٹی۔"

گل خان دروازے کے باہر آ گیا اور واپس روانہ ہوا اور سیدھا وکیل صاحب کے گھر گیا۔

"اب کیا کروں وہ تو اس لائق تھا ہی نہیں کہ کچھ پتہ کرتا۔" گل خان بولا۔

"میں نے سنا ہے کہ ایسا کام کرنے والوں کی موت بڑی بھیانک ہوتی ہے تم نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے۔ تم اس پر نظر رکھنا اگر مر گیا تو اس کا اثر کالی پر سے ختم ہو جانا چاہئے۔ اس کے بعد پھر دیکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں کل پھر اس کی طرف جاؤں گا۔"

دوسرے دن گل خان ندی سے گزر کر غولو کے گھر کی طرف چلا تو اس نے دیکھا کہ کچھ آدمی مرگھٹ کی طرف ایک چارپائی لے کر جا رہے تھے وہ کھڑا ہو گیا اور ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔ "کون مر گیا ہے؟"

آدمی بولا۔ "غولو رات کو مر گیا کسی نے نہیں دیکھا لاش اکڑ گئی سیدھی نہیں ہو رہی، اس لئے چارپائی پر باندھا ہے اب تو چارپائی کے ساتھ ہی جلانا پڑے گا۔"

گل خان کھڑا ہو گیا وہ آدمی دوڑ کر لاش لے جانے والوں میں شامل ہو گیا اور گل خان واپس مڑ گیا۔

اس نے وکیل صاحب کو بتایا کہ "وہ تو مر گیا۔"

وکیل صاحب بولے۔ "ہاں اب نئے سرے سے جائزہ لینا ہوگا۔"

دو تین دن وہ بینک نہیں گئے اور پھر نئی تیاری سے بینک کے دروازے پر روزی کا انتظار کرنے لگے، روزی اپنے وقت پر بینک آ گئی اس نے کیش جمع کرایا، دروازے پر وکیل صاحب کھڑے تھے۔ "وکیل صاحب آپ کہاں تھے ملاقات ہی نہیں ہو رہی تھی؟" وہ بولی۔

وکیل نے مسکرا کر کہا۔ "ادھر گاؤں میں میرا آموں کا باغ ہے ادھر گیا تھا۔"

"آم کا باغ اور ہم کو آم بازار سے خریدنا پڑتے ہیں۔" روزی نے ایک ادا سے کہا۔

"ارے آپ آم کی بات کرتی ہیں سارا باغ آپ کو دینے کو تیار ہیں آپ بولو تو۔" وکیل نے اچھی اداکاری کرتے ہوئے ایک عاشق کی طرح کہا۔

"باتیں آپ خوب کرتے ہیں ایک دفعہ گھر آئے کسی کے جذبات کا خیال نہیں کیا اور بھاگ گئے۔" وہ بولی۔

"ارے آپ حکم کرو سر کے بل آئیں گے۔" وکیل نے جواب دیا۔

"ابھی آپ کو فرصت نہیں ہے کیا آؤ ایک کپ چائے میرے ساتھ پیو دو منٹ کا تو راستہ ہے۔" وہ بولی۔

وکیل نے گھڑی دیکھی اور کہا۔ "میرے کو دو بجے ایک کام ہے ابھی بارہ بجے ہیں میں آپ کو ایک گھنٹہ دے سکتا ہوں۔"

روزی زور سے ہنس پڑی۔ "واہ زمیندار صاحب ناپ تول کے وقت دیں گے آپ۔"

"ارے تمہارے لئے تو وقت ہی وقت ہے پر دن میں تو کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ سب کام نوکروں پر ڈالو تو نقصان اٹھانا پڑتا ہے تم کو پتہ نہیں زمینداری کرنا کتنا مشکل کام ہے۔" وکیل نے جواب دیا۔

"اچھا اب چلو گھر۔" روزی بولی۔

وہی کمرہ تھا کھڑکیاں کھلی تھیں گیلری کا دروازہ بھی کھلا تھا سامنے چرچ کا مینار نظر آ رہا تھا۔ کمرہ بڑا تھا۔ درمیان میں صوفے پڑے تھے روزی کچن میں چائے بنا رہی تھی اور وکیل بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا تھا کمرے میں کوئی تصویر نہیں لگی تھی دیواروں پر بڑا روشن کلر تھا آج وہ پہلے والی گھٹن اور حبس نہیں تھی چھت کا پنکھا بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا۔ آج ماحول میں کشیدگی نہیں تھی۔

روزی اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کولہے وکیل سے لگ رہے تھے۔ وہ ایک دہکتی ہوئی آگ کے قریب خود کو محسوس کر رہا تھا۔ وکیل کے جسم میں سنسناہٹ سی پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر اس کا دماغ اور اعضاء

اس کے کنٹرول میں تھے وہ پہلے والی کیفیت نہیں تھی۔

وکیل نے جھک کر چائے کا کپ اٹھا لیا اور بولا۔ "ابھی تک گرم ہے۔"

"تم برف ڈال لو ٹھنڈی ہو جائے گی۔" روزی نے دلفریب مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں چائے میں برف نہیں ڈالتا برف اپنی جگہ الگ مزا رکھتی ہے اور چائے اپنی جگہ۔" وکیل نے کہا۔

"آپ نے میرا شوق بڑھا دیا ہے کبھی اپنی زمینوں کی سیر تو کرائیں۔" وہ بولی۔

"شاید اس کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا سحر اتنا اثر پذیر نہیں تھا جتنا کہ وہ سمجھتی تھی اس کی ہر بات کا جواب وکیل کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ پہلے کی طرح دھواں سا نہیں بھرا تھا۔ دھند چھٹ گئی تھی سامنے کی چیز صاف نظر آتی تھی، روزی کے ناز و انداز کا بناوٹی پن بھی محسوس ہوتا تھا۔

وکیل نفسیاتی طور پر بھی بلندی پر تھا اس کو پتہ تھا جس سحر کی بدولت یہ آدمی کو اپنی مرضی پر چلاتی تھی وہ سحر ختم ہو چکا ہے، غولو کی لاش کو چتا کی آگ کھا چکی ہے اور ریچھے کی کالک اب ختم ہونے کو ہے روزی کی اصلیت سامنے آنے کو ہے۔

دو بج گئے وکیل روزی کے فلیٹ میں ہی رہا اور اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے وہ اس کے سحر میں سب کچھ بھول گیا ہے۔

روزی بولی۔ "تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے ہر طرف تم ہی تم نظر آتے ہو۔"

وکیل مسکرایا۔ اس کی اداکاری کو اس نے فوراً سمجھ لیا مگر کچھ بولا نہیں۔

"میری بات پر مسکراتے ہو، میری محبت پر تم کو اعتبار نہیں ہے کیا۔" وہ بولی۔

"اصل میں زمیندار ہوں کوئی بھی زمین خریدتے وقت یہ عادت پڑ گئی ہے کہ اس کی پیداواری صلاحیت یعنی جس زمین میں کنکر پتھر ہوں چونا ہو نمک ہو وہ زمین بنجر ہوتی ہے اس زمین پر کتنی محنت کرو بے کار ہے تم برا مت ماننا میں نے تم کو ایک عادت بتائی ہے آدمی جس پیشے سے واسطہ ہوتا ہے اس کے مطابق ہی سوچتا بھی ہے، ایک لوہار کسی لوہے کے ٹکڑے کو دیکھ کر سوچتا ہے اس کی کھرپی بن سکتی ہے یا چاقو، ہر آدمی کی سوچ اس کے روزمرہ کے کاموں کے مطابق ہو جاتی ہے میری بھی ہے۔" وکیل نے وضاحت کی تو روزی نے ذرا حیرت سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ "اتنی بات تو میرے کسی شکار نے نہیں کی آج یہ کیا نئی سنا رہا ہے۔"

اس نے پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ کا لیبل لگا لیا جسم کو ایک خاص ادا سے جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے سے اس کے بہت سے اوزار نمایاں ہوئے جن پر اس کو پورا بھروسہ تھا اور بولی۔

"تمہارے دل میں میرے لئے محبت نہیں ہے۔" پھر اس نے بدن کو ایک ادا سے اٹھا کر وکیل کے اور قریب کر لیا۔ اس کے بدن کی خوشبو کے ساتھ ایک ناگوار سی بدبو بھی آ رہی تھی جیسے کسی پرانے اور میلے کپڑے کو بھٹی پر رکھ کر پکایا جاتا ہے اس کا میل درمیان کے ٹب میں جمع ہو جاتا ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے وکیل کی سمجھ میں غولو دھوبی آ گیا۔

وہ اب تک یہی ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے اس کو وقت کا احساس نہیں ہے وہ اس کے سحر میں مبتلا تھا۔

"بتاؤ نا۔" روزی بولی۔ "مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"بہت زیادہ، تمہاری خاطر میں سب کو چھوڑ سکتا ہوں۔" وکیل بولا۔

"کون کون ہے تمہارا، بیوی ہوگی بچے ہوں گے؟" وہ بولی۔

"بیوی ہے نہیں بچے جوان ہیں، اب ان کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ تم بتاؤ تمہارے تو بچے ہیں۔ اگر ہیں تو کہاں ہیں؟" وکیل نے پوچھا۔

"میرے بچے نہیں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تو ٹھیک ہے تم بھی آزاد میں بھی آزاد خوب گزرے گی۔" وکیل نے ہنس کر کہا۔

"تو کب شادی کر رہے ہو، میں سخت بے

چین ہوں۔" روزی بولی۔

"شادی تو میں کروں گا ضرور مگر سوچتا ہوں میرے بعد میرے لڑکے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے دیں گے۔ کیوں ناں پہلے ہی تمہارے نام کردوں۔" وکیل نے پہلا تیر چلایا۔

روزی یہ سن کر اندر سے بہت خوش ہوئی مگر زبان سے بولی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے پاس بہت ہے یہ بھی تو شادی کے بعد تمہارا ہی ہوگا۔"

"تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔" وکیل اپنی اصلیت پر آ گیا آخر وکیل تھا۔

"سودا کیسا سودا؟" وہ تعجب سے بولی۔

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کیا پتہ شادی کے بعد کس کا بلاوا پہلے آ جائے اگر میں مرجاؤں تو میری تمام زمین جائیداد تمہاری ہوگی، میں یہ تحریر تم کو دوں گا اور ریکارڈ پر لاؤں گا۔ اور اگر میری زبان کالی کہ تم اس دنیا سے جاؤ گی تو تمہارے نام پر جو کچھ ہے وہ میرا ہوگا، دونوں پریمی ایک دوسرے کے لئے یہ قربانی دیں گے۔" وکیل نے کہا۔

روزی کے لئے یہ نئی بات تھی شکار شرطیں رکھ رہا تھا مگر اس کو پرانے تجربے اور اپنے جسم کی تباہ کاریوں پر بھروسہ تھا اس لئے اس نے کہا۔ "میں تمہاری بات تسلیم کرتی ہوں۔"

وکیل نے پنجرے کا دروازہ بند کردیا اور بولا۔ "واہ محبت ہو تو ایسی تو پھر کروں کاغذات کی تیاری۔"

روزی بولی۔ "کرو مگر تمہارا کام دیر کرتا ہے جلدی کرو۔"

"ارے میری جان فکر کیوں کرتی ہو پہلے اپنی زمین تمہارے نام پر کردوں پھر تمہاری جائیداد کا کام ہوگا۔" شام ہوگئی تھی وکیل نے چونک کر کہا۔ "ارے شام ہوگئی۔" اور کھڑا ہوگیا۔

آج کا میدان وکیل کے ہاتھ رہا اس لئے کہ اس کے دماغ میں دھند نہیں اتری اور جذبات میں آندھی نہیں آئی۔ اس کے پاس سارے فارم اور اسٹیمپ پڑے تھے، زمین کا وجود نہ تھا مگر کاغذات تھے اس کے منشی ذاکر نے وکیل کا پارٹ ادا کیا اور ایک دوست نے رجسٹرار کا کام انجام دیا اور اس کی ساری زمینیں جو کہ تھیں ہی نہیں روزی کے نام ہوگئیں۔

دوسرے مرحلے میں اس نے روزی کی ساری جائیداد کی تفصیل حاصل کر رکھی تھی ایک ایک بلڈنگ دکان بنگلے سب کچھ اس نے اپنے نام کرائے اور اصلی رجسٹرار کے سامنے روزی نے کاغذات پر دستخط کردیئے، سیانا کوا آخر مار کھا گیا۔ یہ کام بہت تیزی سے ہوا۔

"اب شادی کب کروگے؟" روزی نے پوچھا۔

"وہ بھی کریں گے فکر کیوں کرتی ہو، تم اپنے کرائے داروں، سے میرا تعارف تو کراؤ تا کہ تمہارا وزن کم ہو اور بینک میں میرا نام ڈلواؤ تا کہ میں تمہارا کام کرسکوں۔ اب میں تم کو کام نہیں کرنے دوں گا، ایک زمیندار کی بیگم یہ کام کرے، میرے لئے ڈوب مرنے کی بات ہوگی۔" وہ بولا۔

"یہ کام تو شادی کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔" وہ بولی۔

"شادی کے بعد تم میری حویلی میں رانی بن کر رہوگی اس لئے شادی سے پہلے یہ سب کرنا ہوگا۔" کالی روزی کی ہوشیاری نے اس کو ہوشیار کرنا چاہا وہ خاموش رہی تو وکیل بولا۔

"ہم زمیندار اپنی بیوی کو بہت چاہتے ہیں اس کے غلام بن جاتے ہیں، اس پر کسی کی نظر نہیں پڑنے دیتے اس کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ اس لئے سب کام شادی سے پہلے تم کرلو۔"

روزی نے دل میں کہا۔ "تو جان نہیں دیگا تو بھی میں لے لوں گی میں نے سات ہضم کرلئے تو کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے کل بینک چلیں گے۔"

اور بینک اکاؤنٹ میں وکیل حیدر کا نام شامل ہوگیا، روزی نے دستخط کردیئے۔ روزی کی غیر موجودگی میں وکیل حیدر اس کے اکاؤنٹ سے چیک کیش کرا سکتا تھا۔ کام پورا ہوا۔ اور شادی کی تیاری شروع ہوگئی۔

روزی کے لئے مذہب کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ کسی مذہب کی نہیں تھی اس کا مذہب صرف روپیہ تھا۔ وکیل

نے پندرہ دن کا وقت لیا اور کہا کہ "بابا یہ ہم لوگوں کا دستور ہے دلہن کے واسطے خاص قسم کا لباس اور زیور تیار ہوتا ہے ابھی تم کسی زمیندار کی بیوی بننے کو جارہا ہے۔ تم کو حویلی میں حکومت کرنے کا ہے اس کا تیاری تو ضروری ہے۔" وکیل نے اپنی وکالت کچھ اس انداز سے کی کہ روزی کو اس کی بات سچی لگنے لگی۔

چار دن کے بعد ایک آدمی روزی کے پاس آیا اور بولا۔

"میڈم ہم وکیل حیدر کے گاؤں سے آئے ہیں، ادھر وکیل بابو ساری تیاری کررہے ہیں آپ فکر نہ کرو، بس ہم تم کو یہ بتانے آیا تھا، اب میں چلتا ہوں۔"

روزی کو وکیل کی غیر حاضری کی وجہ پتہ چل گئی۔ اس نے اپنا جائزہ لیا خود پر غور کیا تو پتہ چلا کہ اس کے اوزار زنگ پکڑ رہے ہیں۔ جسم کا وہ تناؤ اور چمک کم ہورہی ہے چہرے پر عمر کی لکیریں نظر آنے لگی ہیں۔ اس کمی کو اس نے بہترین میک اپ سے دور کرنے کی کوشش کی، بڑی دکانوں پر مساج کرائے، میک اپ کرائے مگر یہ خوب صورتی کچھ دیر قائم رہی اور اس کے بعد پہلے سے بدتر ہوگئی۔ وہ بہت تیزی سے ڈھلان کی طرف جارہی تھی اس ڈھلان پر پھسلن بھی تھی اس نے کسی مقام پر سنبھلنا بھی چاہا مگر وہ نہ سنبھل سکی، تیرہ دن میں وہ پچاس سال کی نظر آنے لگی۔ چہرہ بے رنگ ہوگیا۔ جسم پر سفید دھبے نظر آنے لگے۔ جسمانی خوب صورتی صرف تیرہ دن میں ہوا ہوگئی۔ ریٹھے کا اثر ختم ہوا، غولو مر گیا ساری کمائی وکیل کے کھاتے میں چلی گئی۔

پندرہ دن کے بعد وکیل کی طرف سے پھر ایک آدمی آیا اور بولا۔

"وکیل بولا ہے۔ "تم ادھر گاؤں آ جاؤ شادی ادھر ہی ہوگا۔ بولو چلنا ہے تو بتاؤ۔"

روزی کا دماغ پندرہ دن میں آسمان سے زمین پر آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "وکیل صاحب کو کہنا تم یہاں آ جاؤ۔"

"ہمارا بات سمجھو وکیل صاحب ادھر نہیں آ سکتا، ادھر بہت جھگڑا ہوگیا ہے ان لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ صاحب نے زمین آپ کے حوالے کردیا ہے۔" وہ بولا۔

"پھر میں جا کر کیا کروں گی، میں گاؤں نہیں جاؤں گی صاحب کو بولو ادھر میرے سے ملے۔"

"آپ بولتا ہے تو ہم اس کو بولے گا، ابھی میں جاتا ہوں۔" وہ چلا گیا۔ یہ وکیل کا منشی ذاکر تھا۔

وکیل ادھر ہی تھا اور روزی کی پل پل کی خبر رکھ رہا تھا۔

ذاکر نے بتایا۔ "سر اس عورت کی تو کایا پلٹ ہوگئی ہے وہ تو بالکل بدصورت بڑھیا لگتی ہے۔"

گل خان بولا۔ "ہاں وکیل صاحب اس کا پلاسٹر چونا سب گر گیا کھڑکی دروازے ہل گئے ہیں، اب تو وہ کھنڈرات کی مافک لگتی ہے۔"

"مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی جلدی اس پر زوال کیسے آ گیا۔" وکیل بولا۔

گل خان بولا۔ "ہمارا خیال ہے اس کا جوانی اور خوب صورتی کا چابی غولو کے پاس تھا، غولو مر گیا روزی کی جوانی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب تم کو کچھ کرنے کا ضرورت نہیں ہے، تم ادھر اپنی جگہ پر آرام کرو، جتنا تیزی سے وہ جارہا ہے اب وہ رکے گا نہیں۔"

"گل خان، تمہاری بات میں وزن لگتا ہے۔" وکیل نے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں یہ سب گورکھ دھندہ نہیں آیا۔ ایسی جوان خوب صورت جسم کی مالک عورت اور ایک دم سے بوڑھی ہوگئی۔" ذاکر نے کہا۔

"اس کی جوانی اور خوب صورتی اس کی نہیں تھی، اس کو عارضی طور پر دی گئی تھی، اس کا وقت مقرر تھا، اور وہ وقت غولو کی زندگی تک تھا غولو کی موت کے بعد وقت ختم ہوا اور روزی کی خوب صورتی اور جوانی بھی ہوا ہوگئی اور اس کی اصلی رنگت اور عمر سامنے آ گئی۔

وکیل صاحب نے اس کو شروع سے دیکھا ہے اس کا عمر اتنا نہیں ہے جتنا وہ اب نظر آتا ہے۔" گل خان نے تعجب سے کہا۔

"گندے علوم گندگی سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی خرابی یہ ہے کہ وہ جاتے جاتے بھی اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، میرے خیال میں وہی علم جو روزی کو جوان بنائے رکھتا تھا وہی اس کے بڑھاپے کا سبب ہے اور شاید موت کا بھی سبب بن جائے۔"

روزی سے سیڑھیاں اترنا بھی دشوار تھا۔ وہ فلیٹ میں اکیلی رہتی، کھانے پینے کا بھی کچھ بندوبست نہ کر پاتی اس نے کسی سے تعلقات رکھے نہیں تھے۔ فلیٹ جو کبھی بہت خوب صورت تھا کچرے سے بھرا ہوا تھا، روزی کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اس کے لئے بستر سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔

دو مہینے تک وہ زندگی کی آخری اذیت برداشت کرتی رہی۔ فلیٹ میں جب بدبو پھیلی اور بلڈنگ کے لوگ پریشان ہوئے تو دروازہ توڑا گیا۔ فلیٹ میں سڑے ہوئے گوشت کی بدبو اس قدر ناگوار تھی کہ سب باہر بھاگ گئے۔

سڑا ہوا گوشت کالا تھا اور پانی کی طرح زمین پر بہہ رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس کی صفائی کروائی گئی، گھر کی ہر چیز میں بدبو بھری تھی، سب کو جلا دیا گیا اور روزی کے ڈھانچے کو بڑی ناگواری سے دفن کر دیا گیا۔

اس کے مرنے کے بعد وکیل نے تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ ذاکر اور گل خان کو بھی اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔

☆......☆......☆

حکیم وقار بولے رولو کا سے۔ "حکیم صاحب یہ روداد جو میں نے سنائی ہے، کل ایک وکیل صاحب آئے تھے اپنا نام حیدر علی بتا رہے تھے، بہت زیادہ گھبرائے ہوئے اور پریشان لگ رہے تھے، بدحواسی کی کیفیت اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ کسی اہم کام سے گئے ہوئے ہیں اور شاید بہت دیر ہو جائے مگر وہ بیٹھے آپ کا انتظار کرتے رہے۔ خیر اسی دوران انہوں نے یہ عجیب و غریب روداد سنائی۔ جسے سن کر میں تو اچنبھے میں پڑ گیا۔

اور خاص طور پر اس عورت کے بارے میں جس کا نام روزی تھا کہ اس نے کسی عمل کے ذریعہ اپنی جوانی برقرار رکھی تھی۔ اور پھر عمل کرنے والا جب مر گیا تو اس عمل کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

حکیم صاحب! یہ بات میرے سر سے گزر گئی اور کسی صورت مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے کہ ایسا ممکن ہے اگر آپ اس پر ذرا روشنی ڈالیں اور اس کی حقیقت بتائیں تو مجھے یقین آ جائے۔"

حکیم وقار کی بات سن کر رولو کا بولا۔ "حکیم صاحب یہ حقیقت ہے اور ایسا یقیناً ہوا ہوگا کہ عمل کرنے والے نے اپنے عمل سے اس عورت جس کا نام روزی تھا۔ اس کی جوانی برقرار رکھی۔ حالاں کہ وہ اپنی عمر سے کافی تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی اپنی عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ سامنے آیا کہ۔

عمل کی طاقت جیسے ہی ختم ہوئی تو وہ عورت چند دن میں ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ اگر عامل مزید کئی سال بھی زندہ رہتا تو اس عورت کی جوانی اور رنگ و روپ برقرار رہتا۔ دنیا میں بڑے بڑے عامل گزرے ہیں اور اس وقت بھی نہ جانے کتنے عامل ایسے ہوں گے جو کہ اپنے عمل سے لوگوں کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اور لوگ کسی صورت یقین نہیں کر سکتے مگر ایسا ممکن ہے۔

کسی بھی عمل کی پختگی اور مضبوطی اور طاقتور ہونے میں اس عامل کی اپنی ذہنی قوت کا مضبوط ہونا لازمی ہوتا ہے، جس شخص کی ذہنی قوت جتنی زیادہ طاقتور ہوگی وہ اسی حساب سے اپنے ذہن کی برقی رو سے عمل کو طاقتور بنا دیتا ہے۔

نادیدہ قوتوں کو مسخر کرنا، جادو ٹونا، ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور مراقبے تک کے لئے ذہنی مضبوطی کا طاقتور ہونا لازمی ہے، جس کی ذہنی قوت جتنی مضبوط ہوگی وہ اسی حساب سے اپنے ذہن سے کام لیتا ہے۔

ایک عامل یا جادوگر اپنی ذہنی قوت کو اس قدر اجاگر اور قوی کر لیتا ہے کہ اس کے دماغ سے برقی لہریں آگے کو بڑھنے لگتی ہیں اور پھر وہ عامل اپنے دماغ کی برقی لہروں کو مطلوبہ کام کے لئے مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیتا ہے۔

اب میں آپ کو ایک آسان مثال سے سمجھاتا ہوں۔" (جاری ہے)

رات کا سفر

ملک فہیم ارشاد۔ ڈجکوٹ فیصل آباد

اچانك هال میں دودهیا روشنی پهیل گئی اور ایك نسوانی هیوله نمودار هوا اور پهر دیکهتے هی دیکهتے ایك نوجوان هوا میں معلق نظر آیا، اس کی فلك شگاف چیخیں در و دیوار کو دهلانے لگیں که پهر......

ایک روح کی عجیب و غریب روداد جو کہ پڑھنے والوں کو دنگ کر کے رکھ دے گی

اسٹاپ پر بس رکی تو دو نوجوان بس سے نیچے اترے اور ایک طرف کھڑے تانگے کی طرف بڑھے، تانگے کا کوچوان ایک بوڑھا شخص تھا۔ "چاچا احمد پور چلو گے؟" ان میں سے ایک نوجوان نے پوچھا۔

"نہیں پتر۔ "آخری پھیرا ہے اور پھیرا میں اپنے گاؤں کا ہی لگاؤں گا۔" کوچوان نے نفی میں سر ہلایا۔

"کونسا گاؤں ہے تمہارا چاچا؟" دوسرے نوجوان نے پوچھا۔

"کمال پور......" کوچوان نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔

"وہ تو ہمارے گاؤں سے کافی پیچھے ہے چاچا۔" اس مرتبہ پہلا نوجوان بولا جو شکل سے کافی سمجھ دار لگتا تھا۔

"ہاں پتر دور تو ہے مگر اس وقت تم دونوں کو تانگہ ملنا نہیں۔ میں نے آج دور کا پھیرا لگایا تھا واپسی پر اس اسٹاپ کے قریب پہنچا تو بس کو رکتا دیکھ کر، میں رک گیا کہ شاید پنڈ کا کوئی بندہ مل جائے تو اسے بھی لیتا جاؤں۔" کوچوان بولا۔

"یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے چاچا۔ آج اس کمبخت شکیل کی وجہ سے فیکٹری سے دیر ہوگئی ورنہ اس وقت تو ہم گھر پر ہوتے۔" پہلا نوجوان دوسرے پر بھڑکتے ہوئے بولا۔

"چل عامر اب اس بات کو چھوڑ بھی دے پوری بس کے سفر میں تو نے میری تھوڑی بے عزتی کی ہے جو باقی کسر اب پوری کر رہا ہے، بتایا تو ہے کہ اپنی محبوبہ کے لئے پازیب لینے گیا تھا، اس وجہ سے دیر ہوگئی۔" دوسرا جس کا نام شکیل تھا اس نے کہا۔

"دیکھ لیا اپنی معشوقہ کی پازیبوں کا نتیجہ اب گاؤں کیسے جائیں گے، اگر پیدل نکلے تو تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے اور پیدل جانے والوں کے قصے تو، تو سنتا ہی رہتا ہے کہ آئے دن کوئی نہ کوئی انہیں لوٹ لیتا ہے، اب لوٹنا تو ایک طرف اوپر سے مارتا بھی ہے۔" عامر نے غصے سے شکیل پر برستے ہوئے کہا۔

"اگر ہم کمال پور تک چاچا کے ساتھ چلے جائیں تو ہمارا سفر کافی کم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے شاید کمال پور میں ہمیں کوئی تانگہ مل جائے جیسا یہاں ملا ہے حالانکہ اس وقت یہاں تانگہ ملتا نہیں ہے اور تانگہ کیوں ملا ہے اس کی وضاحت تو چاچا نے کر ہی دی ہے۔" شکیل نے کہا۔

"وہاں کیا تیرا تایا تانگہ لے کر کھڑا ہوگا۔" عامر کا پارہ فل چڑھا ہوا تھا۔

"شاید مل بھی جائے۔" بوڑھے کوچوان نے شکیل کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"چاچا اتفاق بار بار نہیں ہوتے، میں نے تو فیکٹری میں ہی سو جانا تھا، پر کل چھٹی ہے اس لئے میں گھر جا رہا ہوں اور مہوش سے بھی تو ملنا ہے۔" عامر نے آخری بات ذرا دھیمے لہجے میں کہی۔

"جیسی تم دونوں کی مرضی میں نے تو کمال پور تک ہی جانا ہے اگر تم دونوں نے جانا ہے تو چلو ورنہ میں تو چلا۔" بوڑھے کوچوان نے اپنا آخری فیصلہ سنایا، ساتھ ہی اس نے گھوڑے کی لگامیں بھی تھام لی تھیں۔

"چلو چاچا تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں، تمہارے جانے کے بعد تو ہم تانگے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔" آخر کار عامر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا ساتھ ہی وہ تانگے پر چڑھ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، شکیل بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا وہ بھی تیزی سے تانگے پر سوار ہو گیا تو کوچوان نے گھوڑے کو اشارہ دیا تو گھوڑا آگے کو بڑھنے لگا۔

"کمال پور سے تو احمد پور کافی دور ہے......" عامر اکتاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ارے بھائی اب تو مجھے معاف کر دے۔" شکیل بے زار لہجے میں بولا۔

"بات یہ نہیں شکیل...... آج میں بہت تھک گیا ہوں، تو تو جانتا ہے کہ آج فیکٹری میں کام بھی بہت تھا اور کمال پور سے ہمارا گاؤں کافی دور ہے، میری تو بس ہو جائے گی۔" عامر نے اپنی کیفیت بیان کی۔ "تو نے پرسوں چھٹی کیوں کی تھی؟"

"اماں بیمار تھی اس لئے......" شکیل نے وجہ بتائی۔

خیر تو نے جو پازیبیں خریدی ہیں وہ تو دیکھا مجھے۔" عامر نے کہا تو شکیل نے قمیض کی سائیڈ جیب سے دو سلور کلر کی پازیبیں نکال کر عامر کو پکڑا دیں آج چاندکی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

"پازیبیں تو کافی خوب صورت ہیں۔" عامر نے شکیل کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"کافی ٹائم اور پیسے خرچ کئے ہیں۔" شکیل نے کہا۔ "تو نے مہوش کے لئے کچھ نہیں لیا۔"

"میں نے کچھ اور لیا ہے، لیکن اب دل ان پازیبوں پر آ رہا ہے کہ یہ مہوش کو دے دوں۔" عامر نے

مسکراتے ہوئے کہا تو شکیل نے تیزی سے ہاتھ آگے بڑھا کر وہ پازیبیں عامر سے چھین لیں۔

"پتہ ہے تجھے ان پازیبوں کی وجہ سے ہی میں پچھلے دو گھنٹوں سے تجھ سے اپنی بے عزتی کروا رہا ہوں اور تو انہیں لینے کی بات کر رہا ہے......" شکیل نے پازیبیں جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تو نے بتایا نہیں کہ تو نے مہوش کے لئے کیا لیا ہے؟"

"میں نے، یہ دیکھ۔" اتنا کہہ عامر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا شاپر اپنی گود میں رکھا اور اس کی گانٹھ کھول کر اس میں سے اخبار میں لپٹی ہرے رنگ کی چوڑیاں نکال کر شکیل کو دکھائیں۔

"یہ بھی اچھا تحفہ ہے۔" شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا، اتنے میں کوچوان نے تانگے کو روک دیا تو عامر اور شکیل نے اپنا اپنا کرایہ کوچوان کو دیا اور تانگے سے نیچے اتر آئے، کمال پور اسٹاپ پر انہیں کوئی بھی تانگہ نظر نہ آیا۔ "اب کیا کریں۔" عامر پریشان کن لہجے میں بولا۔ کوچوان جا چکا تھا۔

"کل چھٹی ہے پیدل چلتے ہیں، کل دوپہر تک سوتے رہنا۔" شکیل نے مشورہ دیا۔

"بات یہ نہیں۔" عامر فکرمندانہ لہجے میں بولا۔

"تو کیا بات ہے؟" شکیل نے پوچھا......

"میں نے آج ندی کنارے مہوش سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔" عامر نے وجہ بتائی۔

"تیرا کیا مطلب ہے، وہ اب تک ندی کنارے بیٹھی ہوگی؟" شکیل نے عامر کا مذاق اڑایا۔

"نہیں یار...... ناراض تو ہوگئی ہوگی ناں......" عامر پریشانی سے بولا۔

"کل سارا دن ہے تیرے پاس اس سے ملتے رہنا ویسے بھی وہ تجھ سے بہت محبت کرتی ہے مان جائے گی، چل پیدل ہی چلتے ہیں۔" شکیل نے خوشامدی لہجے میں کہا......

"پھر چل۔" عامر رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

اب وہ دونوں پیدل ہی احمد پور کی طرف چل پڑے تھے۔ "تیری بات کہاں تک پہنچی؟" شکیل نے چلتے چلتے پوچھا۔

"کون سی بات؟" عامر نے حیرانگی سے پوچھا۔

"مہوش والی بات۔" شکیل نے یاد دلایا۔ "وہ......بس یار" عامر نے اداس لہجے میں گہری سانس کھینچی۔ "ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے اماں کو مہوش کے گھر بھیجا تو اس کی ماں باپ اور بھائی ہنسی خوشی مان گئے ......پھر......" عامر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"پھر کیا......؟" شکیل نے پوچھا...... "یار پچھلے کچھ دنوں سے مہوش کا بھائی میری طرف بڑے غصے سے گھورتا ہے، جب بھی میں اس کی دکان کے سامنے سے گزرتا ہوں تو بڑے غلط تیوروں سے مجھے گھورنے لگتا ہے، پہلے تو مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا لیکن اب نہ جانے اسے کیا ہوا ہے، غصے سے وہ لال بھبھوکا ہو جاتا ہے۔" عامر نے بتایا۔

"ہو سکتا ہے اس نے تم دونوں کو ندی کنارے دیکھ لیا ہو......" شکیل نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اگر ایسی بات ہوتی تو مہوش مجھے ضرور بتا دیتی......" عامر نے کہا۔ "اس نے تو آج بھی مجھ سے ندی کنارے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہوں...... کہیں وہ اس رشتے کے خلاف نہ ہو گیا ہو۔" شکیل نے ایک مرتبہ پھر خدشہ ظاہر کیا۔

"اگر وہ اس رشتے کے لئے راضی نہ ہوتا تو اس کے اماں ابا کبھی بھی اس رشتے کے لئے ہاں نہ کرتے کیونکہ مہوش نے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ اس کے بھائی کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے بھائی کی رضامندی سے ہی یہ رشتہ ہوا ہے۔" عامر نے بتایا۔

"پھر تو ......ابھی شکیل نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے سے ایک شخص ان کی طرف دوڑتا ہوا آیا، اس آدمی کی حالت کافی بدحواس لگ رہی تھی وہ ان دونوں

کے قریب آ کر رک گیا، عامر اور شکیل نے دیکھا اس آدمی کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور گال پر خون کی لکیریں تھیں جو یقیناً سر کے پھٹنے کی وجہ سے تھیں اس آدمی کا چہرہ کافی ستا ہوا تھا۔

''......وہ ......بھ...... بھائی صاحب...... آگے مت جانا۔'' وہ آدمی ہکلاتے ہوئے بولا، وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔

''ارے بھئی ہوا کیا ہے ......اور تمہاری یہ حالت کس نے کی ہے؟'' عامر نے پوچھا......''وہ پیچھے دو بندے ......'' وہ آدمی اپنا سر پکڑ کر سڑک پر بیٹھ گیا، عامر اور شکیل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ دونوں بھی اس کے قریب بیٹھ گئے۔

''مم......میں کمال پور کا رہنے والا ہوں، یہاں چک 62 میں اپنی بیوی کو اس کے ماں باپ کے گھر چھوڑنے آیا تھا، واپسی میں دیری ہوگئی تانگہ نہ ملنے پر پیدل ہی چل پڑا یہاں پاس ہی تو ہے کمال پور، میں اس طرف آرہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں سے دو آدمی نکلے اور انہوں نے مجھے مارنا شروع کردیا، میرے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سارے پیسے چھین لئے تم دونوں ادھر نہ جانا ورنہ وہ تم دونوں کو بھی ماریں گے، ان کے پاس پستول بھی ہے'' اتنا کہہ کر وہ شخص اٹھا اور ساتھ ہی وہ کمال پور جانے والے راستے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ گیا۔

اب عامر اور شکیل ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ''اب کیا کریں؟'' شکیل نے گھبرائی ہوئی آواز میں ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تو ہی بتا'' میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ پیدل خطرہ ہے لیکن تو نہیں مانا اوپر سے ہمارے پاس پیسے بھی ہیں۔'' عامر بھی پریشان کن لہجے میں بولا۔

'' ایسا کرتے ہیں کہ رات اس حویلی میں ٹھہرتے ہیں۔'' شکیل نے عامر سے سامنے کچھ دوری پر ایک کھنڈر نما حویلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اب عامر نے اس حویلی کی طرف دیکھا جو چاند کی روشنی میں بڑی پراسرار نظر آرہی تھی۔

''پر اس حویلی کے بارے میں تو بڑی عجیب باتیں مشہور ہیں۔'' عامر پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

''تو ان باتوں پر یقین کرتا ہے۔؟'' شکیل نے پوچھا۔

''میں تو اس بات پر یقین نہیں کرتا تھا کہ اس سڑک پر لوگوں کو لوٹا جاتا ہے، لیکن آج یقین ہوگیا۔'' عامر بولا۔

''تو اس کا مطلب! تجھے نادیدہ قوتوں پر یقین آگیا۔'' شکیل نے کہا۔

''نہیں! ایسی بات تو نہیں ہے......'' عامر بولا۔

''خیر چل آج اس حویلی میں ہی ٹھہرتے ہیں۔''

''لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے......'' شکیل نے اپنی کیفیت بیان کی۔

''تو بھی بڑا عجیب شخص ہے خود ہی کہہ رہا ہے کہ اس حویلی میں رات گزارتے ہیں اور اب کہہ رہا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' عامر غصے سے بولا۔

''میں نے سوالیہ انداز سے پوچھا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ اس حویلی میں ہی ٹھہریں گے اور اگر وہ چور اس حویلی میں آگئے تو؟'' شکیل نے ایک مرتبہ پھر عامر کے سامنے سوالیہ نشان چھوڑا۔

''نہیں ...... وہ حویلی میں تو نہیں آئیں گے کیوں کہ اس حویلی کا خوف اردگرد کے سارے گاؤں کے لوگوں پر چھایا ہوا ہے، ویسے ٹائم کیا ہوا ہے تیری گھڑی میں؟'' عامر نے پوچھا۔

''ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔'' شکیل نے اندازوں سے بالکل صحیح ٹائم بتایا۔

''ہوں!'' عامر نے گہری سانس کھینچی۔

''چل پھر اس حویلی میں ہی چلتے ہیں کیونکہ کمال پور میں تو ہمارا کوئی رشتہ دار ہے نہیں اور آگے تو دور دور تک......'' عامر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن اس حویلی کے بارے میں جو باتیں مشہور ہیں، وہ صحیح بھی ہیں کافی حد تک۔'' شکیل نے

گھبراتے ہوئے کہا۔

''چلو آج یہ بھی دیکھ لیتے ہیں، ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ انسان سے زیادہ کوئی خطرناک نہیں جوڈاکو، چور اچکے اور قاتل کے روپ میں موجود ہیں۔'' عامر نے کہا۔

وہ دونوں سڑک سے نیچے اتر آئے اور ایک طرف بنی پگڈنڈی پر چلنے لگے، پگڈنڈی کے اختتام پر حویلی تھی جو کافی پرانی تھی، حویلی کا گیٹ جو کہ بہت بڑا تھا جسے دونوں نے بمشکل کھولا، حویلی کے احاطے میں ایک طرف گھاس پھوس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اندرونی دروازے کے قریب پہنچے، دروازہ کھولا اور دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے، پوری حویلی میں سناٹے کا راج تھا۔

اچانک ہال میں بے شمار دیئے روشن ہوگئے، انہیں روشن کرنے والا کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ حویلی کے فرش پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی اور فرش کئی جگہوں سے اکھڑا ہوا تھا، چھت کی حالت بھی کافی خراب تھی جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے، ایک ٹوٹا پھوٹا فانوس بھی لٹک رہا تھا۔ ہال کے ایک طرف لمبی راہداری تھی جس کے اردگرد کافی کمرے تھے اوپر جانے کے لئے دو کشادہ سیڑھیاں تھیں، وہ دونوں آگے بڑھے اور ایک کمرے میں داخل ہوئے اور فرش پر پھونک مارنے کے بعد وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''حویلی تو کافی بڑی ہے شکیل اور یہ اپنے دور کی شاندار حویلی ہوگی؟'' عامر نے شکیل کی طرف دیکھا۔

''ویسے تیرے لئے تو یہ فائدہ مند جگہ ہے۔'' شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟'' عامر نے ماتھے کو سکوڑا۔

''کل اگر کسی طرح مہوش کا بھائی نہ مانا تو مہوش کو بھگا کر اس حویلی میں لے آنا کیونکہ یہاں ڈر کی وجہ سے کوئی نہیں آئے گا۔'' شکیل نے کہا تو عامر ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

اور پھر وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگائے بے سدھ ہوگئے۔

''رات کا نجانے وہ کونسا پہر تھا جب اچانک عامر کی آنکھ کھل گئی، وہ اردگرد دیکھنے لگا، اس نے دیکھا شکیل اس کے قریب نہیں تھا۔'' ارے شکیل کہاں چلا گیا؟'' حیرت کے باعث عامر خود سے ہمکلام ہوا۔

اچانک عامر کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز پڑی تو اس نے جیب سے ماچس نکالی اور تیلی روشن کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا، وہ آواز کی سمت میں جارہا تھا، آواز ایسی تھی جیسے کوئی زمین کھود رہا ہو، عامر نے محسوس کیا کہ زمین کھودنے کی یہ آواز حویلی کے باہر موجود احاطے سے آرہی تھی، جیسے جیسے ماچس کی تیلی ختم ہوتی ویسے ویسے عامر نئی تیلی جلا لیتا تھا وہ حویلی کے باہر موجود احاطے میں پہنچا تو اس نے چاند کی روشنی میں ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔

سامنے ایک آدمی کدال سے زمین کھود رہا تھا، زمین کھودتے کھودتے اچانک وہ آدمی رکا اور اس نے عامر کی طرف دیکھا، عامر کو اپنے پاؤں سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اور خوف کے باعث اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں اس آدمی کی آنکھوں کی جگہ دو دہکتے ہوئے انگارے نظر آئے۔ عامر نے تیزی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس طرف دیکھا تو حیران رہ گیا، وہاں اب کدال والا آدمی موجود نہیں تھا۔ ''شش......شاید میرا وہم تھا......'' عامر بڑبڑایا۔

اسی وقت حویلی کے اندر سے ایک نسوانی چیخ ابھری تو عامر تیزی سے گھوما، اس کا دل اب تیزی سے دھڑک رہا تھا، وہ حویلی کے اندر داخل ہوا تو حیرت ایک مرتبہ پھر اس کی منتظر تھی۔

حویلی میں اب چکا چوند روشنی تھی وہ حیرت سے اردگرد دیکھنے لگا کچھ دیر پہلے حویلی کی حالت ایسی تھی جیسے ویران کھنڈر ہو لیکن اب حویلی کی حالت بہت شاندار تھی، پہلے جو چھت پر ٹوٹا پھوٹا فانوس لٹک رہا تھا اب وہ بالکل ٹھیک ٹھک روشن تھا ایک مرتبہ پھر اسی نسوانی

چیخ نے عامر کو اپنی طرف متوجہ کیا، وہ نسوانی چیخیں حویلی کی چھت پر موجود کمرے سے آرہی تھیں۔ عامر ڈرتے ڈرتے سیڑھیوں کی طرف بڑھا، چھت پر بھی کافی کمرے تھے۔

ایک مرتبہ پھر وہی نسوانی چیخ ابھری اور عامر اس کی طرف بڑھا جس کمرے سے نسوانی چیخ آرہی تھی وہ اس کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ عامر حیرانگی سے اردگرد دیکھنے لگا۔ ''یااللہ یہ کیا چکر ہے۔؟'' عامر نے اوپر کی طرف سر اٹھاتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکلا تو اسے ساتھ والے کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں وہ اس کمرے کے دروازے کے قریب ہوا۔ ''ن......ن......نہیں......مم......میں ایسا نہیں کرسکتی۔'' عامر کو اندر سے ایک عورت کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

''اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں رمیش......'' اس مرتبہ عامر کو غصے سے بھری مردانہ آواز سنائی دی، ساتھ ہی وہی نسوانی چیخ گونجی جو عامر کئی دفعہ سن چکا تھا۔

عامر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ''اوہ اللہ، یہ کیا چکر ہے؟'' عامر پریشان کن لہجے میں اپنا سر پکڑتے ہوئے بولا، وہ چکرا سا گیا تھا۔

اچانک عامر کے کانوں میں نسوانی خوب صورت آواز پڑی تو عامر نے چونک کر دیکھا۔

''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟'' وہ خوب صورت لڑکی اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی، ساتھ ہی وہ حیران کھڑے عامر کی طرف بڑھی۔ ''میں نے تمہارے بھوجن کا پربندھ بھی کرنا ہے اور تم ہو کہ'' وہ لڑکی بولتے ہوئے عامر کے کافی قریب آگئی تھی اور عامر کو پکا یقین تھا کہ اس لڑکی کے اس سے ٹکرانے کے ارادے تھے۔ ٹکرانے کے ڈر سے عامر نے آنکھیں بند کرلیں لیکن حیرت انگیز طور پر وہ لڑکی عامر کے جسم سے یوں گزر گئی جیسے اس لڑکی کا وجود ہی نہ ہو، عامر نے آنکھیں کھولیں تو اسے وہ لڑکی نظر نہ آئی۔

''چھوڑو مجھے تمہارا تو روز کا یہی کام ہے۔''

اچانک عامر کو اپنی پشت پر اس لڑکی کی آواز سنائی دی تو عامر تیزی سے پشت کی جانب مڑا، اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کیونکہ پیچھے ہوبہو اس جیسا ایک نوجوان اس خوب صورت لڑکی کو اپنی بانہوں میں تھامے کھڑا تھا۔

''میری سندر پتنی! تیار ہونے کا تو ایک بہانہ ہے، میں تو صرف تم سے چھیڑ چھاڑ کے لئے لیٹ تیار ہوتا ہوں۔ تاکہ تم بھوجن کے لئے مجھے لینے آؤ اور میں تم سے پریم کروں''

اس لڑکے نے اپنا چہرہ لڑکی کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ لڑکی کافی کسمسائی لیکن وہ نوجوان اپنی پیش رفت میں کامیاب رہا۔

اچانک کسی نے عامر کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ تیزی سے گھوما تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا، وہ دوبارہ پلٹا تو اس نے دیکھا اس کا ہمشکل نوجوان اور وہ خوب صورت لڑکی غائب تھے۔

''یہ آخر کیا چکر ہے؟ یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟'' عامر ایک مرتبہ پھر پریشانی سے بڑبڑایا اسی وقت عامر کو باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی، وہ تیزی سے اس کمرے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا ایک لمبا تڑنگا نوجوان، دوسری طرف بنے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے ہاتھوں پر ایک شخص تھا جس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔

''اوئے سنو...... کک...... کون ہو تم؟'' عامر نے اس لمبے تڑنگے آدمی کو آواز دی لیکن اس لمبے تڑنگے آدمی نے عامر کی آواز کو ان سنی کرتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگا......

''بھائی صاحب میں آپ سے مخاطب ہوں۔''

عامر نے اس آدمی کو پھر آواز دی، ساتھ ہی وہ بھی سیڑھیاں اترنے لگا، سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ آدمی حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا، عامر اسے آوازیں دیتا رہا مگر اس آدمی نے عامر کی ایک نہ سنی

اور حویلی سے باہر نکل گیا، عامر باہر آیا تو حویلی کے احاطے میں اسے وہ لمبا تڑنگا نوجوان کہیں نظر نہ آیا، عامر پریشانی سے اردگرد دیکھنے لگا۔

''ع......عا...... عامر۔'' اچانک عامر کے کانوں میں شکیل کی آواز گونجی جو حویلی کے اندر سے آرہی تھی، عامر حویلی کے اندر داخل ہوا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا حویلی کا ماحول اب کی بار عجیب تھا حویلی کا ہال کسی بادشاہ کے دربار سے کم نہیں لگ رہا تھا اوپر جاتی دونوں سیڑھیوں کے درمیانی جگہ پر ایک خوبصورت تخت پر وہی خوب صورت لڑکی شہزادی کے لباس میں بیٹھی ہوئی تھی جو چھت والے کمرے میں عامر کے ہمشکل کی بانہوں میں تھی، اس وقت وہ کسی پری سے کم نہیں لگ رہی تھی تخت سے تھوڑی دور قطار کی شکل میں پانچ چھ لڑکیاں کھڑی تھیں جن کے ہاتھوں میں چاندی کے تھال اور تھالوں میں گلاب کے پھولوں کی پتیاں تھیں۔

عامر نے حیرت کے عالم میں آگے بڑھا تو وہاں قطار میں کھڑی لڑکیاں اس پر پھول نچھاور کرنے لگیں۔ ''پدھاریے راج کمار رمیش۔ شہزادی ریکھا کافی دیر سے آپ کا انتظار کررہی ہیں۔'' قطار میں کھڑی لڑکیاں یک زبان ہوکر بولیں۔

عامر ان لڑکیوں کی طرف ہراساں نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، کوئی ان دیکھی طاقت جو اسے آگے بڑھنے پر مجبور کررہی تھی، تخت کے قریب پہنچ کر اس ان دیکھی طاقت کا احساس ختم ہوگیا اور عامر رک گیا شاید اس ان دیکھی طاقت کا کام ہی عامر کو تخت تک پہنچانا تھا۔

شہزادی ریکھا تخت سے اٹھی اور عامر کے قریب آگئی۔

''میرے راج کمار، میرے من کے چین، میری برسوں کی تپسیا۔'' شہزادی ریکھا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

عامر نے مقناطیسی انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا، اس ان دیکھی طاقت کا احساس ایک مرتبہ پھر عامر کو ہونے لگا۔

پھر شہزادی نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب تخت پر بیٹھا لیا۔ ''تم نے بہت انتظار کروایا راج کمار، میں کئی صدی سے تمہارا انتظار کررہی ہوں، یاد ہے تم نے مجھے وچن دیا تھا۔'' اتنا کہہ کر شہزادی نے عامر کو گلے سے لگالیا اور عامر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے برف کے تودے کو گلے سے لگالیا ہو۔

''کون سا وچن......؟'' عامر نے شہزادی کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ تم میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گے، ہر جنم میں میرے جیون ساتھی بنو گے۔'' شہزادی ریکھا نے بظاہر یاد کروایا۔

''مم...... مجھے تو یاد نہیں۔'' عامر نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم سب باتیں بھول گئے ہو، تم تو اس حویلی کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے، میں تمہیں یہاں سے روزانہ دن اور رات کے سمے گزرتے دیکھا کرتی تھی، جب تم تانگے پر بیٹھے یہاں سے گزرتے تھے۔ تم تو اس شاندار حویلی کے مالک ہو...... کیوں تم نے اپنی زندگی کو اتنا مشکل بنایا ہوا ہے۔'' شہزادی ریکھا نے دکھی لہجے میں کہا۔

''میں اور اس حویلی کا مالک؟'' عامر حیران ہوا۔ ''میں تو ایک غریب کسان کا بیٹا ہوں اور یہ مشکلات میرا مقدر ہیں۔''

''نہیں میری جان تم اچھوت نہیں ہو بلکہ ایک راج کمار ہو یہ حویلی تمہاری ہے۔ میں تمہاری ہوں، اس حویلی کے عیش و آرام تمہارے ہیں۔'' شہزادی ریکھا اپنی ہی روانی میں بولے جارہی تھی۔

''یہ حویلی میری نہیں ہے شہزادی اور نہ ہی میں تمہارا ہوں، مم...... میں تو مہوش سے محبت کرتا ہوں۔'' عامر نے کہا۔ ''نہیں!'' شہزادی ریکھا چلائی۔ ''یہ نہیں ہوسکتا...... تم صرف میرے ہو...... صرف میرے......

میرا اور تمہارا بیاہ ہو چکا ہے، ہم دونوں اس بیاہ سے کافی خوش تھے، پرنتو ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی، وہ ......وہ دشٹ دیشو ہماری خوشیوں کا دشمن بن گیا، اسی نے ہماری زندگی نرکھ بنادی وہ اچانک ہماری ہنستی بستی دنیا میں آیا اور ہماری دنیا کو نرکھ بنا کر چلا گیا۔" شہزادی نفرت سے بولی۔

"کون دیشو؟ ہم...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" عامر نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں شروع سے ساری بات بتاتی ہوں، میرا اور تمہارا بیاہ بڑی دھوم دھام سے ہوا، تم اور میں بہت خوش تھے کہ ایک دن تم اس پاپی دیشو کے ساتھ حویلی میں آئے اور تم نے مجھے بتایا کہ دیشو اس گاؤں میں ایک خوب صورت ہوٹل بنانا چاہتا ہے اور یہ کسی سرائے وغیرہ میں نہیں رہے گا بلکہ ہمارے پاس حویلی میں رہے گا پرنتو میں نے دیشو کی آنکھوں میں اپنے لئے ہوس کی پرچھائیں صاف دیکھ لی تھی۔

تم کام سے جاتے تو وہ حرام زدہ اپنا کام کاج چھوڑ کر حویلی آجاتا اور مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔

ایک رات تم کام کے سلسلے میں دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے تو اس نے اپنے ارادوں سے مجھے آگاہ کیا کہ "وہ مجھ سے پریم کرتا ہے اور مجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں۔"

دیشو نے کہا "تو کیا ہوا پریم کوئی دیوار نہیں دیکھتا۔"

پر میں نے انکار کیا تو اس نے مجھے اور تمہیں قتل کرنے کی دھمکیاں دیں اور میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسری رات سوتے سے تمہاری گردن پر خنجر سے وار کیا، تمہاری چیخ پر میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تمہاری حالت دیکھ کر میری بھی چیخ نکل گئی، ہماری چیخوں کی آواز سن کر ہمارا بوڑھا نوکر نارائین کمرے میں آگیا، دیشو نے خنجر کے وار سے اس کی بھی ہتھیا کردی، میں تمہاری طرف بڑھی تم نے مجھے وچن دیا کہ تم ہر جنم میں مجھے ہی ملو گے پھر تمہاری مرتیو ہوگئی۔

میں تمہاری لاش پر آنسو بہا رہی تھی اور دیشو کہہ رہا تھا کہ "اب تو ہم دونوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے۔"

میں نے یکدم اس کے ہاتھ سے خنجر چھینا اور اس پر وار کرنا چاہا پرنتو وہ پیچھے ہٹ گیا اور خنجر میں نے اپنے سینے میں اتار لیا۔ دیشو کو مجھ سے ایسی توقع بالکل بھی نہ تھی، وہ آگے بڑھا اور میری لاش دیکھ کر غم کرنے لگا پھر اس نے ہم تینوں کی لاشوں کو حویلی کے احاطے میں گڑھا کھود کر دبا دیا۔" یہاں تک کہہ کر شہزادی ریکھا خاموش ہوگئی۔

"تو کیا تم ایک شہزادی تھی۔" عامر نے پوچھا۔

"میں تو تمہاری کنیز ہوں۔" ریکھا نے ایک مرتبہ پھر عامر کو گلے لگاتے ہوئے کہا، پھر وہ اس سے علیحدہ ہوئی۔ "یہ سب میری شکتیوں کا کمال ہے رمیش، یہ سب میں نے تمہارے لئے کیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" عامر کا انداز چلانے والا تھا۔

"صرف تمہارے لئے میری جان۔" ریکھا پیار سے بولی۔

"تا کہ ہم دونوں ایک ہوسکیں۔"

"لیکن میں تو ایک مسلمان ہوں اور مسلمان کی شادی کسی غیر مذہب سے نہیں ہوسکتی۔" عامر نے کہا۔

"پریم کے بیچ کوئی دیوار نہیں ہوتی ہے وہ دیوار دھرم کی ہی کیوں نہ ہو۔" ریکھا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ہمارا ملاپ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم ایک روح ہو جبکہ میں ایک زندہ انسان ہوں۔" عامر نے کہا۔

"اس کا اپائے بھی ہے میرے پاس۔"

"پھر اس سے پہلے میں دیشو سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔" ریکھا کی آنکھوں میں یکدم انگارے سے دہکنے لگے۔

"د......د......دیشو...... کک کہاں ہے؟" عامر نے ہکلاتے ہوئے حیرانگی سے پوچھا۔

"یہ رہا......" اتنا کہہ کر ریکھا نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تو عامر نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ اچانک ہوا میں ایک آدمی نمودار ہوا جو ہوا میں الٹا لٹکا ہوا تھا کس طرح سے الٹا لٹکا ہوا تھا وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ عامر نے اس الٹے لٹکے آدمی کا چہرہ دیکھا تو حیران رہ گیا کیونکہ وہ آدمی کوئی اور نہیں بلکہ شکیل تھا۔

"یہی ہے وہ دشٹ جس نے اس رات ہم سب کی ہتھیا کی تھی۔" ریکھا نفرت سے بولی۔

"یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... یہ تو میرا دوست ہے شکیل۔" عامر نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"نہیں یہ دیشو ہی ہے اور اسی کے کارن ہماری یہ حالت ہوئی ہے کہ میں ایک آتما بن گئی اور تم نے دوبارہ جنم لیا ہے، یہ حرامی اس جنم میں بھی دشٹ ہی نکلا جیسا پہلے جنم میں تھا، اس جنم میں بھی اس کا ذہن پاپی ہے۔" ریکھا شکیل کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ت...... تت...... تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم......م...... مم...... مجھے چھوڑ دوگی...... پھر...... پھر......" شکیل ہکلاتے ہوئے بولا۔

"کیسا وعدہ؟" عامر حیران ہوا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ اس جنم میں بھی پاپی ہی نکلا۔ اس نے میرے ساتھ تمہاری جان کا سودا کیا تھا۔" ریکھا نے عجیب بات کہی۔

"کک...... کیا مطلب......؟" عامر بولا۔

"ہاں میرے راج کمار پچھلے جنم میں بھی یہ تمہارا دوست تھا اور پھر ہماری زندگی نرکھ سے بھی بدتر بنادی اور اس جنم میں بھی یہ تمہارا دوست ہے اور ایسا ہی وار اس نے تم پر اس جنم میں بھی کیا۔

ایک رات اسی طرح یہ فیکٹری سے لیٹ ہوگیا اس نے اس رات اوور ٹائم لگایا تھا تا کہ یہ اپنی پریمیکا کے لئے پازیبیں خرید سکے تم اس رات جلدی گھر چلے گئے، یہ لیٹ ہوگیا تانگہ نہ ملنے پر یہ پیدل ہی چل پڑا حویلی کے پاس سے گزرا تو میں نے اپنی شکتیوں کے کارن اسے اپنی حویلی کی طرف بلایا، اپنا پرانا انتقام لینا چاہا، پرنتو پھر اس سے کہا کہ اگر یہ تمہیں حویلی میں لے آئے تو میں اسے چھوڑ دوں گی، یہ فوراً مان گیا پرنتو اس نے یہ شرط رکھی کہ میں تمہاری ہتھیا کردوں، میں بھی مان گئی۔" ریکھا اتنا کہہ کر رکی۔

"یہ...... یہ......نہیں ہوسکتا۔" شاید عامر کو ریکھا کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے یہ تمہیں مجھ سے کیوں مروانا چاہتا ہے۔" اتنا کہہ کر ریکھا رکی۔

"ک...... کیوں؟" بے اختیار عامر کے منہ سے نکلا وہ بغیر کسی سہارے کے ہوا میں لٹکے شکیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیوں کہ موجودہ جنم میں تم جس لڑکی سے پریم کرتے ہو یہ بھی اسی کا پریمی ہے۔" ریکھا نے بظاہر عامر پر بم پھینکا...... "یہ پازیبیں بھی اسی مہوش کے لئے خریدنے گیا تھا اس نے جان بوجھ کر وہاں دیر کی تا کہ تم دونوں لیٹ ہوجاؤ اور گاؤں کے لئے تم دونوں کو سواری نہ ملے اور مجبوراً تمہیں اس حویلی میں آنا پڑے، اب میں اس دیشو کی ہتھیا کردوں گی تا کہ میں اس سے اپنا انتقام لے سکوں۔"

اتنا کہہ کر ریکھا نے اپنا ہاتھ ہوا میں الٹے لٹکے شکیل کی طرف کیا تو شکیل کے بدن سے قمیض غائب ہو گئی، شکیل نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔

"ٹھہرو......" عامر نے با آواز بلند کہا۔ "ٹھیک ہے تم جو کہوگی میں وہ کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن پہلے تمہیں شکیل کو چھوڑنا پڑے گا۔" عامر نے ریکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ریکھا حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی اور یہی حال الٹا لٹکے شکیل کا تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" ریکھا حیرانگی سے بولی۔

"ہاں بالکل...... تم جو کہوگی میں وہ کروں گا، پر تمہیں پہلے میرے دوست کو چھوڑنا پڑے گا۔" عامر نے شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم مجھے پہلے بتا دیتے کہ تم مہوش سے محبت کرتے ہو تو میں کبھی بھی تم دونوں کے بیچ نہ آتا، لیکن افسوس کہ تم نے مجھ سے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا، وہ اس لئے کہ تم مجھے اپنا دوست ہی نہیں سمجھتے۔" شکیل بولا۔

ریکھا نے اب شکیل کو نیچے اتار دیا تھا۔

"م...... م...... مجھے معاف کر دو، میرے دوست، تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو...... اور میں تم سے کیا کرنے والا تھا، مجھے معاف کر دو۔ مہوش سے صرف محبت میں کرتا ہوں مگر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن آج میں سمجھتا ہوں کہ مہوش کا انتخاب بہت اچھا ہے، وہ بہت خوش نصیب ہے جسے تم جیسا ساتھی ملے گا۔" شکیل شرمندہ لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ریکھا میں یہ جنموں کے چکر کو نہیں مانتا کیونکہ میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان کو زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے لیکن اگر میں واقعی تمہارا قصوروار ہوں تو مجھے ختم کر ڈالو لیکن میرے دوست کو زندہ چھوڑ دو۔"

ساتھ ہی شکیل رونے لگا، عامر تخت سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور سیڑھیاں اترنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر شکیل کو گلے لگا لیا اور پھر اسے علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں شکیل یہاں سے اگر کوئی جائے گا تو وہ تم ہو کیونکہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، میں نے ریکھا سے وعدہ کیا تھا...... مہوش تمہیں مبارک ہو، اور مہوش کو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔" عامر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"رمیش تم واقعی ایک دیوتا سمان انسان ہو، تمہاری وجہ سے ایک بھٹکا ہوا دشٹ اور پاپی سیدھی راہ پر آ گیا ہے، تمہارے اس عمل نے شکیل میں موجود دیشو کی ہتھیا کر دی ہے، شکیل کی بات بالکل ٹھیک ہے، مہوش واقعی خوش نصیب لڑکی ہے جسے تم جیسا جیون ساتھی ملے گا، میں پہلے بھی تمہارا انتظار کر رہی تھی اور اب بھی کروں گی، ہمارا ملاپ تمہاری مرتیو کے بعد ہوگا لیکن میں اتنی خود غرض نہیں ہوں کہ اپنے پریم کے لئے تمہاری بلی لوں...... تمہیں تمہاری مہوش مبارک ہوں۔" ریکھا بھی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"لیکن تم......" عامر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ریکھا نے اسے ٹوکا۔

"میں ایک آتما ہوں تمہارا اور میرا ملاپ تبھی ہوگا جب تم بھی آتما کے روپ میں آؤ گے، میں نے پہلے بھی تمہارا انتظار کیا تھا اور اب بھی کروں گی۔ پرنتو مجھے خوشی ہے کہ میں نے دیشو کو ختم کر دیا، شریر کے طور پر نہیں بلکہ ذہنی طور پر، اب میں چلتی ہوں۔" ریکھا نے کہا اور وہاں سے پلک جھپکتے غائب ہو گئی۔

اب حویلی کی حالت پہلے جیسی ہو گئی تھی، نہ کوئی روشنی نہ تخت نہ کنیزیں، حویلی کی حالت اب خستہ حال تھی۔

"ایک بات اور تم سے کہوں۔" شکیل نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کہو دیشو۔" عامر نے ہنستے ہوئے کہا تو شکیل بھی بے اختیار ہنس پڑا۔

"مہوش کے بھائی کو میں نے ہی تمہارے خلاف بھڑکایا تھا کہ تمہارا شہر میں کسی لڑکی کے ساتھ چکر چل رہا ہے، اسی لئے وہ تمہیں غصے سے گھورتا تھا۔" شکیل نے حیران کن بات بتائی۔

"یعنی میری راہ میں تو نے صرف اور صرف کانٹے ہی بچھائے ہیں۔" عامر نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"لیکن تیری سچی دوستی نے ان کانٹوں کو ہمیشہ کے لئے پھولوں میں بدل دیا ہے۔" شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا تو عامر بھی مسکرا دیا۔

"یہ تو بھابھی کو میری طرف سے دے دینا۔" شکیل نے وہ پازیبیں عامر کو دیتے ہوئے کہا اور عامر نے مسکراتے ہوئے وہ پازیبیں پکڑ لیں۔ وہ دونوں جب حویلی سے باہر نکلے تو دن کا اجالا ہر طرف پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔

☠

خوفناک ٹرپ

ساجدہ راجہ- ہنڈواں سرگودھا

اچانک آسمان پر غضبناک کالی گھٹائیں چھاگئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتی ہوائیں چنگھاڑنے لگیں اور پھر اسی اثنا میں بارش نے بھی زور پکڑلیا، بڑے بڑے پیڑ اکھڑنے لگے کہ اچانک......

سامان سو برس کا ہے اور پل کی خبر نہیں، انہی الفاظ کو احاطہ کرتی ایک سبق آموز کہانی

"یار میں تو بہت پرجوش ہوں، جب سے یونیورسٹی ٹرپ کا سنا ہے۔ شمالی علاقہ جات...... اوہ! مائی گاڈ...... کہیں میں خوشی سے پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔" مائدہ نے جوش مسرت سے جیسے چیختے ہوئے کہا، اس کی بات پر سارے گروپ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"او غریب کی اولاد...... بس بھی کرو، کیوں سب کے سامنے ہمارا تماشہ بنوا رہی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اس لڑکی نے کبھی گھر کے باہر کی فضا نہیں دیکھی اس لئے اتنی خوش ہو رہی ہے۔" ثومان نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تو جواباً وہ اسے صرف آنکھیں دکھا کر رہ گئی۔

"اچھا...... بس بس...... یہ نظروں کے تیر سے یوں دل بے ایمان کو چھلنی تو مت کرو۔" اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر بھرپور ایکٹنگ کی لیکن آگے سے بھی مائدہ ایسی تھی جو بولنے پر آتی تو سب کو خاموش کروا دیتی تھی۔

"تمہارا بے ایمان دل تو آئے روز نہ جانے کتنوں کے تیر سے چھلنی ہوتا ہے کوئی نئی بات کرو۔"

"او خدا کے بندو! اب اپنا ناٹک بند کرو اور ٹرپ کے بارے میں کوئی بات کرو کہ کیا کیا تیاری کرنی ہے؟" عامر نے کنگ سائز برگر تقریباً آدھا منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ تو سب نے چونک کر ادھر توجہ کی۔

"ہم نے کیا خاک تیاری کرنی ہے...... تیاری تو تمہیں کرنی چاہیے بلکہ لسٹ بنانی چاہئے کہ راستے میں کھانے کے لئے کیا کیا لے کر جانا ہے...... وہاں جا کر کیا کھانا ہے......؟ اور واپسی پہ کیا کچھ کھانے کے لئے لے کر آنا ہے۔" شہریار نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سب کے لبوں پر ہنسی دوڑ گئی جبکہ عامر منہ بنا کر رہ گیا، اس کے زیادہ کھانے کی عادت سے سب ہی تنگ تھے اور اس کے دن بدن بڑھتے ہوئے وزن کی وجہ سے پریشان "اوئے عامر...... خدا کو مان اور اپنی حالت پر رحم کر...... تھوڑا کھایا کر، دیکھ تیرا وزن جنگلی بھینسے جتنا ہوتا جا رہا ہے۔" ثومان نے سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں کی شرارت کسی سے مخفی نہیں تھی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے یہ۔" شہریار نے بھی ثومان کی تائید کی۔ "مانا کہ تیرا باپ بہت امیر و کبیر آدمی ہے تیری یہ ہر وقت چگنے رہنے کی عادت کو وہ بخوشی پورا کرسکتا ہے لیکن یار زندگی اور پیٹ تو انسان کا اپنا ہوتا ہے ناں...... تو خود پر رحم کھا، ورنہ کسی دن ہارٹ اٹیک سے تو نے پیارا ہو جانا ہے اور ہماری ہنستی بستی زندگی میں بھی تیرے جانے کا دکھ...... اور ابھی میں دکھی ہونا نہیں چاہتا۔"

"ارے کتنا بولتے ہو تم لوگ...... کہاں کی بات کو کہاں لے گئے......؟" صوفیہ جو کب سے خاموش بیٹھی تھی ان کی فضول باتوں سے اکتا کر بولی تو مائدہ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی جبکہ شہریار نے کچھ ایسی محبت لٹاتی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ گڑبڑا کر رہ گئی اور شہریار کے لبوں پر محبت پاش مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اوروں نے بھی ان کی اس حرکت کو ملاحظہ کیا اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، صوفیہ نے بھی کن انکھیوں سے ان کے ذومعنی اشاروں کو دیکھا تو اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور شہریار کی تو گویا جان پر بن گئی۔

ان کے دیکھے سے جو چہرے پہ آ جاتی ہے رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شہریار نے لگے ہاتھوں یہ شعر بھی داغا جو موقع محل کے لحاظ سے بالکل ناموزوں تھا جبکہ ثومان نے اس کے کندھے پر ایک مکا جڑا تو وہ بلبلا کر رہ گیا۔ "غضب خدا کا شہریار، کبھی تو موقع کے لحاظ سے کوئی شعر کہہ لیا کرو۔ شاعر بے چارے اپنے شعروں کی اس ناقدری پر تڑپ تڑپ جاتے ہوں گے۔ یا اگر وہ ملک عدم میں ہیں تو ان کی روحیں قبروں میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتی ہوں گی۔" ثومان کی اس بات پر سب کے لبوں پر بے ساختہ ہنسی دوڑ گئی جبکہ صوفیہ تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شہریار نے اسے خفگی سے گھورا تو وہ فوراً خاموش ہو گئی۔ ان دونوں کی خاموش محبت کے بھی گواہ تھے ان دونوں کے درمیان باقاعدہ اظہار تو نہیں ہوا تھا لیکن آنکھوں کے ذریعے وہ ان کی باتوں کو جان چکے تھے، ویسے بھی دل کے معاملات آنکھوں سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ان سب کا تعلق اپر کلاس فیملیز سے تھا سوائے صوفیہ کے جو ایک مڈل گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس گھرانے سے جہاں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا رواج تھا اور چادر بھی اتنی چھوٹی کہ سر ڈھکیں تو پاؤں کھل جائیں اور پاؤں ڈھکیں تو سر...... صوفیہ کو جنون کی حد تک پڑھائی کا شوق تھا اور اسی شوق کی وجہ سے اس کے والد نے جیسے تیسے اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا تھا حالانکہ ان کی سبزی کی دکان تھی جہاں سے بس اتنی ہی آمدن ہوتی کہ وہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھ سکیں لیکن صوفیہ کے شوق کو مدنظر رکھ کر اس کے والد نے روزمرہ کے اخراجات میں ممکنہ حد تک کمی کردی اور وہ پیسے صوفیہ کی تعلیم کے کام آنے لگے۔

صوفیہ نے بھی یونیورسٹی میں اپنا بھرم رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ کینٹین جا کر کولڈ ڈرنک ہی لے سکے لیکن اپنا بھرم اس نے کبھی نہیں

توڑا بلکہ سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتی کہ کینٹین کی چیزیں اسے ہضم نہیں ہوتیں۔

پھر ثومان عامر شہریار اور مائدہ سمیت وہ پانچوں ایک گروپ بن گئے۔ وہ سارے ہنس مکھ اور شرارتی تھے۔ صوفیہ تھوڑی ریزرو طبیعت کی مالک تھی لیکن ان چاروں کے ساتھ مل کر وہ بھی کافی شوخ ہو گئی تھی اور پھر کب وہ شہریار ملک کو پسند کرنے لگی اسے معلوم ہی نہ ہوا۔ شہریار کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی اسے یہ لڑکی بہت پسند آئی تھی سانولی پرکشش۔ اس نے اتنا معصوم حسن کہاں دیکھا تھا، آہستہ آہستہ سارے گروپ کو ہی ان کی خاموش محبت کا پتہ چل گیا۔ ان کے درمیان باقاعدہ اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی۔

صوفیہ کتنی ہی بار منتظر رہی کہ وہ یعنی شہریار اظہار کرے لیکن اس کی طرف سے ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ وہ اس سے اقرار کرتا۔ شاید ذومعنی بات میں جو مزہ ہے وہ مکمل بات میں نہیں، شہریار شاید خاموش لیکن نظروں کی زبان کو انجوائے کرنا چاہتا تھا......!

"خدا کے لئے سیریس ہو جاؤ۔" مائدہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔ "بس کرو بے تکی ہانکنے کی ہر وقت چونچیں لڑاتے رہتے ہو۔ برائلر مرغے......!" اس کی تشبیہ پر صوفیہ مسکرانے لگی جبکہ وہ تینوں تڑپ کر سیدھے ہوئے۔

"کیا کہا...... تم نے بے ادب لڑکی...... برائلر مرغے...... او مائی گاڈ......"

"نہیں...... اگر تم لوگوں کو برائلر پر اعتراض ہے تو میں دیسی مرغے کہہ لیتی ہوں۔" مائدہ نے اس کی بات اچکی۔

"دیکھو دیکھو...... تم جانتی نہیں کہ تم کن کے سپوتوں سے مخاطب ہو۔ اگر ہمارے گھر والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے ہونہار، لائق فائق، ہینڈسم اسمارٹ صاحبزادوں کو تم نے مرغوں سے تشبیہ دی ہے تو وہ صدمے سے ہی اللہ کو پیارے ہو جائیں۔" عامر نے اسے ڈرانے کی ناکام کوشش کی جبکہ اس کی بات پر مائدہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"دیکھو ذرا...... ہینڈسم اسمارٹ کو۔" اس نے عامر کے بڑھتے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو سب ہنسنے لگے۔ جبکہ عامر تلملا کر رہ گیا۔

"اے...... اے یہ بے ایمانی ہے۔ سراسر...... تم دونوں نے اتنی جلدی پارٹی تبدیل کرلی۔ اس نے ثومان اور شہریار کو گھورا جواب میں ان دونوں نے کندھے اچکا دیئے...... بہت زیادہ ہنسنے کے بعد جب وہ خاموش ہوئے تب تک پیریڈ کی بیل ہو گئی تو وہ کتابیں اٹھا کر کلاس روم کی جانب چل دیئے......!

ایک ہفتہ بعد ٹرپ کی روانگی تھی ان سب کی تیاری مکمل تھی سوائے صوفیہ کے کیونکہ اس کے پاس اس ٹرپ کے لئے اخراجات نہیں تھے لیکن وہ اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہے اگر جان بھی جائے تو انہیں کوئی فرق نہ پڑے کیونکہ وہ سب کھلے ذہن کے مالک تھے انہیں صوفیہ کے درمیانے طبقے سے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن صوفیہ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ اسے چھوڑ نہ دیں، خاص کر شہریار۔

صوفیہ نے دوسرے دن سب کو ٹرپ کے ساتھ نہ جانے کا بتا کر پریشان کر دیا۔

"کیوں کیا وجہ ہے تمہارے ساتھ نہ جانے کی۔" مائدہ خراب موڈ کے ساتھ بولی۔

"کوئی وجہ نہیں...... بس میں جانا نہیں چاہتی......"

"یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں محترمہ کیا وجہ ہے......؟" شہریار نے خاصا تپ کر پوچھا کیونکہ صوفیہ کے ساتھ نہ جانے کا سب سے زیادہ دکھ اسے ہی پہنچا تھا۔

"ایک تو تم لوگ بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتے ہو...... جب میں نے کہہ دیا کہ میں نے نہیں جانا......" وہ چلا کر بولی ساتھ میں اس کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل آئے، ان سب نے حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ وہ بہت کول مائنڈ لڑکی تھی انہوں نے کبھی اسے یوں چلاتے نہیں دیکھا تھا۔

"کول ڈاؤن صوفیہ......" مائدہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا...... "ایسا کیا ہوگیا کہ تم یوں ہی ہیو کررہی ہو۔ ہم نے تو بس وجہ ہی پوچھی ہے کہ تم ساتھ کیوں نہیں جارہی اور تم اتنی ہائپر ہوگئی۔" وہ سب تاسف سے اسے روتا دیکھ رہے تھے، شہریار کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس روتی بلکتی معصوم لڑکی کو کیسے چپ کروائے اس کے آنسو شہریار کو سیدھا دل پر گرتے محسوس ہورہے تھے۔

"خدا کے لئے صوفیہ اب بس بھی کرو۔ یوں رو کر کیوں خود کو ہلکان کررہی ہو۔" عامر جو اپنا برگر کھانا بھول چکا تھا تاسف سے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"بالکل ٹھیک......" ثومان بولا۔ "اب دیکھو صوفیہ تمہارے رونے نے ایک کارنامہ تو سرانجام دے دیا۔ موصوف کھانا بھول گئے۔" اس نے کچھ اس انداز سے عامر کی طرف اشارہ کیا کہ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ عجیب دھوپ چھاؤں کا منظر تھا جسے شہریار نے دل کے نہاں خانوں میں بسالیا۔

"شکر ہے محترمہ ہنسیں تو...... میں تو سمجھا آج رونے کا عالمی دن ہے۔" عامر نے کہا اور اپنا آدھ کھایا برگر دوبارہ کھانے لگا۔ ثومان نے تاسف سے اسے دیکھا "تیرا کچھ نہیں ہوسکتا......" اور پھر صوفیہ کی طرف متوجہ ہوگیا جو اب خاصی حد تک سنبھل چکی بلکہ یوں رونے پر کچھ شرمندہ بھی تھی۔

"اگر رونے کا شغل پورا کرلیا تو اب وجہ بھی بتادو، آخر ہم تمہارے دوست ہیں کوئی غیر نہیں۔ دوستوں سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہئے۔" مائدہ نے نرمی سے اسے اکسایا۔

"وہ دراصل۔" وہ اٹکی۔

"ہاں ہاں بولو......" سب نے اس کی ہمت بندھائی تو اس نے ساری بات انہیں بتادی کہ "اس کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے ہے اور یہ کہ وہ ٹرپ پر جانے کے اخراجات افورڈ نہیں کرسکتی۔" اس کی بات سن کر سب حیران رہ گئے کیونکہ انہیں کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کا تعلق کہاں سے بلکہ ان کے درمیان کبھی اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں گیا اور صوفیہ کی ظاہری حالت سے بھی انہیں کبھی محسوس نہیں ہوا بلکہ اس کا لباس تو بہت عمدہ ہوتا تھا جیسے کسی ماہر ڈیزائنر سے بنوایا گیا ہو۔ جب اس بات کا ذکر مائدہ نے صوفیہ سے کیا تو اس نے جواباً کہا۔

"دراصل میری امی بہت اچھی ٹیلر ہیں، میں سستے سے کپڑے خریدتی ہوں لیکن امی کی ماہرانہ سلائی انہیں نہایت عمدہ بنادیتی ہے۔"

اور مائدہ اسی روز مچل گئی کہ وہ بھی صوفیہ کی امی سے اپنے کپڑے سلائی کروائے گی، اس کی بات پر صوفیہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھا اب سنجیدہ بات...... تم ہر حال میں ہمارے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف جارہی ہو۔ تمہارے اخراجات میرے ذمے......"

"آں...... آں...... اس نے ہاتھ اٹھا کر صوفیہ کو روک دیا جو اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے والی تھی۔

"ہم آپس میں دوست ہیں اور دوستوں کا ایک دوسرے پر بہت حق ہوتا ہے تم تیاری کرو میں کچھ نہیں سنوں گی۔" اور صوفیہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مائدہ اب انکار نہیں سنے گی۔

☆......☆......☆

مقررہ وقت پر یونیورسٹی کی بس انہیں لے کر روانہ ہوئی، سب بہت پرجوش تھے۔ ہنستے گاتے سفر کٹ رہا تھا۔ پھر دوپہر کو بس ایک ہوٹل پر رکی سب پیٹ پوجا کے لئے اتر گئے، صوفیہ بیٹھی رہی اس نے مائدہ کو اپنے لئے کچھ لانے کا کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلیں...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہو...... اس نے جلدی سے آنکھیں کھولیں تو سامنے شہریار کھڑا تھا مسلسل اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آپ کھانے کے لئے نہیں گئے......" وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ شہریار نے کوئی جواب نہ دیا اور سیٹ پر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ آج اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جسے دیکھ کر صوفیہ نظریں جھکا گئی۔

"ادھر دیکھو صوفیہ...... میری طرف......" شہریار کی بے قراری لہجے سے ظاہر تھی۔ "کیا کبھی تمہیں ان میں کچھ نظر نہیں آیا۔" اس کا اشارہ اپنی آنکھوں کی طرف تھا۔ "بہت روکا خود کو۔ کہ یار یہ عشق و محبت کچھ نہیں۔ لیکن ہائے یہ دل...... کم بخت مانتا ہی نہیں۔" وہ خود ہی بولتا رہا...... "بس بہت ہوگئی نظروں کی زبان۔ آج میں واضح اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ شہریار ملک کو صوفیہ سکندر سے والہانہ عشق ہوگیا ہے۔ صوفیہ میں تم سے محبت کرتا ہوں جنوں کی حد تک، میں تمہاری نظروں کے مفہوم کو سمجھتا ہوں، لیکن تمہارے منہ سے اس محبت کا اظہار سننا چاہتا ہوں، جو تمہاری آنکھیں کب کا مجھے سنا چکی ہیں۔ مجھے بتاؤ صوفیہ کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو...... بتاؤ ناں" وہ اونچا لمبا خوب صورت شخص محبوب کے آگے گھٹنے ٹیک رہا تھا۔ محبوب کی منت کررہا تھا۔

اور صوفیہ...... اگر آج بھی خاموش رہتی تو اپنا بہت بڑا نقصان کرلیتی۔ سو اس نے وہ لفظ ادا کرہی دیئے جن کو سننے کا شہریار متمنی تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ صوفیہ خود کو بہت خوش قسمت لڑکی سمجھ رہی تھی۔

سب لوگ کھانا کھا کر واپس آگئے تو بس پھر سے چل پڑی۔ شہریار کی پرشوخ نگاہیں سارے راستے صوفیہ پر جمی رہیں ان میں موجود والہانہ پن صوفیہ کو ہواؤں میں اڑائے دے رہا تھا۔

شہریار کی ایک بات بہت ہی عجیب تھی کہ مکمل چیز پسند کرتا تھا۔ چاہے وہ انسان ہو یا کوئی ڈیکوریشن پیس...... اسے کسی بھی چیز میں نامکمل پن اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی پسندیدہ ترین چیز میں بھی کوئی ایسا عیب نکل آتا جو حقیقتاً بہت معمولی ہوتا تب بھی وہ اس چیز کو پھینک دیتا تھا۔ اسے ہر چیز بے عیب پسند تھی حتیٰ کہ انسان بھی۔ اس کے گھر والوں کے علاوہ گروپ فرینڈز کو بھی اس کی اس عادت کا علم تھا اور وہ سب اس کو اس بات پر سرزنش بھی کرتے تھے لیکن اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہوچکی تھی کہ اب شاید ہی وہ اس پر قابو پاسکتا۔

مائدہ نے شہریار اور صوفیہ کی چوری پکڑلی اور اب صوفیہ سے استفسار کیا تو جواباً اس نے مائدہ کو شہریار کے اظہار کے متعلق بتادیا۔ مائدہ بہت خوش تھی کیونکہ اس کی نظر میں شہریار بہت اچھا انسان تھا سوائے اس عادت کے کہ وہ ہر چیز کو بے عیب پسند کرتا ہے۔

"یار مائدہ...... شہریار کو مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ مجھ سے محبت کر بیٹھا اسے تو بے عیب چیزیں پسند ہیں پھر میں تو اتنی خوب صورت بھی نہیں دوسرا میرا رنگ بھی سانولا ہے۔ آج کل کے لڑکے گورے رنگ کو ترجیح دیتے ہیں اور پھر شہریار کو میری رنگت کا عیب کیوں نظر نہیں آیا......؟"

"کچھ خدا کا خوف کرو ناشکری لڑکی...... کہاں سے سانولی ہوگئی تم۔ گندمی رنگت ہے تمہاری اس کے علاوہ تم میں ایسی کشش ہے کہ بندے کو لوہے کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔" مائدہ نے اس کے پرکشش چہرے پر نظریں جما کر کہا تو اپنی تعریف پر صوفیہ کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور مائدہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اسے دل سے خوشیوں کی دعا دی۔

☆......☆......☆

پہاڑی علاقہ شروع ہوچکا تھا۔ اردگرد بکھرے خوب صورت مناظر کو وہ سب بہت انجوائے کررہے تھے۔ ایک طرف پہاڑ تھے اور صنوبر چیڑ دیودار کے خوب صورت اور دوسری طرف گہری کھائی...... نیچے بہت نیچے دریا اپنی پوری تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ وہ سب کھائی کی طرف نیچے دیکھتے ہوئے ڈر رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ انجوائے بھی کررہے تھے لڑکے، لڑکیاں گانا گا کر ماحول کو بہت پرلطف بنارہے تھے، جب گانا ختم ہوا تو سب نے شہریار سے ضد شروع کردی کہ وہ گانا سنائے کیونکہ اس کی آواز بہت خوب صورت تھی۔ شہریار نے اک بھرپور نظر صوفیہ پر ڈالی اور گانا شروع کردیا۔

اے جاتے ہوئے لمحوں، ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو
میں بھی تو چلتا ہوں، ذرا ان سے ملتا ہوں
جو اک بات دل میں ہے ان سے کہوں
تو چلوں تو چلوں تو چلوں

ابھی اس نے تھوڑا سا ہی گایا تھا کہ سب نے بے اختیار تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ اس نے آگے گانا شروع کیا۔

ان کے چہرے کی یہ نرمیاں
ان کی زلفوں کی یہ بدلیاں
ان کی آنکھوں کے روشن دیے
ان کے ہونٹوں کی یہ سرخیاں
سب ان کے ہیں جلوے، میں چلنے سے پہلے
آنکھوں میں، سانسوں میں
خوابوں میں، یادوں میں
اور اس دل میں ان کو چھپا کے رکھوں
تو چلوں تو چلوں تو چلوں

"واؤ...... امیزنگ شہریار ملک......" تالیاں دوبارہ بجیں۔

میں کہیں بھی رہوں اے صنم
مجھ کو ہے زندگی کی قسم
فاصلے آتے جاتے ہیں
پیار لیکن نہیں ہوگا کم
جنہیں چاہوں، جنہیں پوجوں
انہیں دیکھوں، انہیں چھولوں
ذرا باتیں تو کرلوں، ذرا بانہوں میں بھرلوں
میں اس چاند سے ماتھے کو چوم لوں
تو چلوں تو چلوں تو چلوں

شہریار کی والہانہ نظریں صوفیہ پر جمی تھیں اور وہ شرم سے سرخ ہو رہی تھی، اس کی اس بے اختیاری کو سب نے نوٹ کیا اور اس پر ہوٹنگ شروع کردی تو صوفیہ نے شرما کر مائدہ کے پیچھے منہ چھپالیا تو سب اور بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔

تم کیا ملے جانِ جاں، پیار زندگی سے ہوگیا
اجی عزت افزائی کا شکریہ شکریہ
اس ناچیز کو آپ نے قابل تو سمجھا

یہ پھٹے ڈھول جیسی آواز عامر کی تھی سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھنا شروع کردیا تو وہ بے چارا خوامخواہ شرمندہ ہوگیا۔

"او گینڈا...... کیوں ہمارے ٹرپ کا ستیاناس کرنا چاہتا ہے اپنی اس بھیانک آواز کو اپنے اندر دبا کے بیٹھ اور وہ کر جو تیرے کرنے کا ہے۔" ثومان کا اشارہ اس چکن رول کی جانب تھا جو عامر کے ہاتھوں میں موجود تھا۔ سب نے اس کی اس بات پر بے تحاشہ قہقہے لگائے اور عامر منہ بنا کے بیٹھ گیا۔

"روٹھے ہو تم تم کو کیسے مناؤں پیا بولو نا...... بولو نا......" کسی اور اسٹوڈنٹ نے بس میں سے آواز لگائی تو ایک بار پھر سب ہنسنے لگے۔ "اچھا بس کر شیر جواناں...... بس کر......" شہریار نے عامر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس کے ہونٹوں پر دبی دبی ہنسی تھی۔ مائدہ سے برداشت نہ ہوا تو وہ بولی۔ "بس کرو یار کیوں اسے تنگ کر رہے ہو......" مائدہ کی حمایت ملنے پر عامر کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ سب کے ساتھ ہلے گلے میں شامل ہوگیا۔

تین گھنٹے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک خوب صورت سا ریسٹ ہاؤس تھا جو، ان کے لئے پہلے سے ہی بک ہو چکا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے بالکل پیچھے کا پہاڑی ڈھلوان سے شور مچاتا چشمہ بہہ رہا تھا جس کی آواز یہاں واضح سنائی دے رہی تھی۔ ان سب نے اس خوب صورت منظر کو انجوائے کیا۔ وڈیوز، تصویریں بھی بناتے جا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ تبصرے بھی جاری تھے۔ صوفیہ اور شہریار سب سے زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ دل خوش ہو تو ہر منظر حسین دکھائی دیتا ہے۔ ان کی دل کی مراد اسی سفر کے دوران پوری ہوئی تھی۔ اس لئے یہ سفر ان کے لئے یادگار تھا۔ ان دونوں نے مل کر بہت سی تصویریں بنائیں۔ مائدہ، ثومان اور عامر نے انہیں دانستہ زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کے مواقع فراہم کئے اور وہ دل سے ان تینوں کے مشکور تھے حالانکہ زبان سے اقرار نہیں کیا تھا۔ شہریار نے صوفیہ کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا اور صوفیہ سمیت سب کو آگاہ کردیا، وہ تینوں بہت خوش تھے لیکن صوفیہ پریشان تھی کیونکہ وہ اپنی حیثیت جانتی تھی لیکن اس نے اس بات کا اظہار کسی سے بھی نہ کیا۔ ہاں چپکے

چپکے خوب صورت خواب اس کی آنکھوں نے بننے شروع کردیئے...... "ہاں بے چاری خوش فہم لڑکیاں......!!"

دوسرے دن انہیں دور تک پہاڑوں پر جانا تھا۔ جو جنگلات سے بھرے پڑے تھے سب نے اپنے اپنے طور پر ضرورت کا سامان لیا اور روانہ ہوگئے۔ بس اونچے نیچے راستوں سے خراماں خراماں چلتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ آس پاس اتنے خوب صورت مناظر بکھرے پڑے تھے کہ وہ سب مبہوت ہو کر انہیں تکے جا رہے تھے لیکن شہریار کے لئے صوفیہ کے چہرے سے بڑھ کر کچھ بھی حسین نہیں تھا۔ وہ سب مناظر سے بے گانہ صرف اسے ہی تکے جا رہا تھا۔ صوفیہ نے کئی بار آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سرزنش کی لیکن وہ ہٹ دھرمی سے لبوں پر مسکراہٹ سجائے اسے ہی تکے جا رہا تھا۔ صوفیہ اس کی نظروں سے خائف تھی اور لجائی لجائی سی بیٹھی تھی!!!

"او مائی گاڈ! صوفیہ ذرا آسمان کی طرف دیکھو کیسے کالی گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی ہیں۔" مائدہ نے چونکتے ہوئے صوفیہ کو کہنی ماری تو اس نے بھی جلدی سے کھڑکی کے پار آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں...... واقعی کالی گھٹاؤں نے آسمان کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ ابھی تو دن کا پہلا پہر تھا لیکن گھٹا کی وجہ سے اندھیرا سا چھاتا جا رہا تھا حالانکہ جس وقت وہ چلے تھے اس وقت کہیں کہیں بادل موجود تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ موسم اچانک یوں ہوجائے گا تو وہ سب کبھی بھی نہ آتے۔

بجلی چمکنا شروع ہو چکی تھی اور بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ دلوں کو سہائے دے رہی تھی وہ سب دل میں سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اچانک گائیڈ نے ڈرائیور کو گاڑی کسی محفوظ جگہ پر روکنے کا حکم دیا، سب کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ "بادل بہت گہرے ہوگئے ہیں جس کا مطلب ہے شدید آندھی اور بارش بھی ہو سکتی ہے ایسی صورتحال میں بس کا سفر کرتے رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

ڈرائیور نے ایک سائیڈ پر بس روک دی، گائیڈ نے سب کو بس سے جلد از جلد نیچے اترنے کا کہا، وہ سب دل میں خوف لئے نیچے اتر آئے، سڑک کے ساتھ ہی گھنا جنگل شروع ہو رہا تھا۔ گوکہ محفوظ تو وہ بھی نہیں تھا لیکن یوں بس کا سفر کرنے سے کئی گنا بہتر تھا کہ وہ جنگل میں پناہ لے لیں۔ آندھی کا کیا، وہ تو بس کو تنکے کی طرح اڑا کر بھی لے جا سکتی تھی۔ گائیڈ نے سب کو ساتھ رہنے کی تاکید کی کہ مشکل حالت میں وہ کہیں بھٹک نہ جائیں اس لئے سب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جنگل میں داخل ہو رہے تھے مائدہ، صوفیہ خوف زدہ تھیں لیکن وہ خود کو کسی حد تک قابو میں کیے ہوئے تھیں، باقی لڑکیوں کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو چکی تھی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ کافی دور چلنے کے بعد نسبتاً گھنے درختوں کے نیچے گائیڈ نے انہیں ٹھہرنے کو کہا۔ وہ سب زمین پر بیٹھ گئے اور کبھی کبھی آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھ لیتے۔ جو سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا اور ان سب کے دل آنے والے وقت سے لرزیدہ تھے۔ گوکہ گھنے درختوں کی وجہ سے آسمان مکمل طور پر نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن جتنا بھی نظر آ رہا تھا خوف زدہ کرنے کو کافی تھا۔ یہاں آتے ہوئے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی صورتحال بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

وہ سب اس طرح کی صورتحال سے پہلی دفعہ نبرد آزما تھے۔ یونیورسٹی کے دو پروفیسرز بھی ان کے ہمراہ تھے اور وہ سب کو مطمئن کرنے میں مصروف تھے حالانکہ انہیں خود بھی بخوبی اس بات کا احساس تھا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے، انسان تو کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔

شہریار صوفیہ کے پاس کھڑا تھا، وہ سب بار بار بادلوں کی گرج سے سراسیمہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے اور پھر خاموش بیٹھنے کے شغل میں مصروف ہوجاتے۔ اچانک تیز ہوا چلنا شروع ہوگئی اور ساتھ میں بارش بھی جو لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی، ہوائیں طوفانی صورت اختیار کرنے لگی تھیں، بارش کے تھپیڑے ان میں شامل ہو کر عجیب سا شور برپا کر رہے تھے۔ وہ درخت جو پہلے انہیں گھنے محسوس ہو رہے تھے آندھی اور بارش کی وجہ سے سکڑ کر کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہوجاتے اس وجہ سے بارش اور

ہوائیں براہ راست ان سب تک پہنچ رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے انہیں دور تک کچھ نظر نہیں آرہا تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ دور تک دیکھ بھی نہیں پارہے تھے کیونکہ تیز ہوا اور بارش کے چھینٹوں کی وجہ سے انہیں آنکھیں کھولنا مشکل ہورہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ان کے قریب ہی تیز ہوا کی وجہ سے ایک درخت کڑاک کی زوردار آواز کے ساتھ گرا، کچھ کمزور دل لڑکیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں صوفیہ نے بھی گھبرا کر شہریار کا ہاتھ پکڑلیا، یہ بالکل غیر اختیاری حرکت تھی۔ شہریار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں واضح دیکھی جاسکتی تھیں اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا کیا ہے لیکن شہریار کی پوری توجہ اسی کی جانب تھی اس نے اس لمس کو پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس نے پوری شدت سے صوفیہ کا ہاتھ پکڑلیا۔

صوفیہ نے گھبرا کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن شہریار نے ہلکی سی مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ خوف مائدہ کے چہرے سے بھی ظاہر تھا لیکن وہ کافی حد تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اسٹوڈنٹ لڑکے، لڑکیوں کو تسلی دے رہے تھے لیکن یہ تسلی سوائے ”تسلی“ کے کچھ نہیں تھی۔ تیز آندھی بدستور تیز ہورہی تھی۔ بجلی کی کڑک رہے سہے اوسان خطا کررہی تھی۔

”شہریار میں نے سنا ہے آسمانی بجلی زیادہ تر سبزے یعنی درختوں پر گرتی ہے اور ہم تو کھڑے بھی درختوں کے نیچے ہیں۔“ صوفیہ نے لرزتی آواز میں اسے مخاطب کیا تو جواباً شہریار نے کہا۔

”یار میں تمہارے ساتھ ہوں پھر ڈر کس چیز کا...... لوگ ساتھ زندہ رہنے کی آرزو کرتے ہیں اور ہم اکٹھے مر بھی گئے تو سوچو کتنی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ مجھے تو اتنا خوف محسوس نہیں ہورہا۔ بس تم ہمت نہ ہارو۔“

شہریار کی بات سے اس کا خوف کسی حد تک کم تو ہوگیا لیکن ختم نہیں ہوا۔ وہ نامحسوس طریقے سے شہریار کے قریب ہوتی جارہی تھی اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا وہ یہ سب خوف کی وجہ سے کررہی تھی۔

کڑاک...... کی دہشت ناک آواز سے آسمانی بجلی ان سے کچھ فاصلے پر موجود ایک درخت پر گری اور پورا درخت آن واحد میں جل گیا۔ اسٹوڈنٹ لڑکوں اور پروفیسر سمیت سب کے چہرے خوف کی لپیٹ میں آگئے۔ لڑکیاں ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگیں...... بارش تیز ہوتی گئی۔ آندھی خوفناک حد تک خطرناک صورت اختیار کرگئی۔ تیز ہوا کی وجہ سے درخت جڑوں سے اکھڑ رہے تھے، خشک نہ ہونے کے باوجود ٹہنیاں اور شاخیں درختوں سے ٹوٹ کر کٹے پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتی پھر رہی تھیں۔ تیز ہوا اور بارش کی بوچھاڑ کی بدولت جب کوئی شاخ پوری قوت سے کسی سے ٹکراتی تو لڑکیوں کی چیخیں نکلنے لگتیں۔ وہ سب اتنے سراسیمہ ہوئے کہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے جس کا جدھر منہ لگا بھاگ نکلا۔

پروفیسر سب کو چیخ چیخ کر اکٹھا رہنے کا کہہ رہے تھے لیکن اتنے شور میں ان کی آواز کون سنتا...... وہ پانچوں دوست اکٹھے تھے، شہریار نے صوفیہ کا جبکہ ثومان نے مائدہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ بغیر سمت کا تعین کیے بھاگ رہے تھے۔ تیز ہوا ان کے قدم اکھاڑ رہی تھی۔ بارش کے چھینٹے آنکھوں میں پڑنے کی وجہ سے سامنے نظر بھی مشکل آرہا تھا۔ درختوں کی ٹوٹی شاخیں ان کے چہروں اور جسموں سے ٹکرا رہی تھیں لیکن وہ بھاگے جارہے تھے۔ بجلی رہ رہ کے کڑکتی اور کسی نہ کسی درخت کو اپنا نوالہ بناتی رہی۔

وہ بھاگ تو رہے تھے لیکن ان کی کوئی منزل نہ تھی، میلوں تک پھیلا گھنا جنگل اور پہاڑیاں...... وہ بھلا کہاں پناہ لیتے۔ لیکن اس کے باوجود زندہ رہنے کی آرزو انہیں بھگائے لے جارہی تھی۔ اتنا خوفناک طوفان انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی یہ سوچ سکتے تھے کہ یہ سب ان کے ساتھ پیش آئے گا۔

وہ دونوں اور عامر آگے بھاگے جارہے تھے جبکہ ثومان اور مائدہ ان سے کچھ پیچھے تھے۔ وہ تینوں دہل کر رکے جب انہوں نے بجلی کی زوردار کڑک کے ساتھ ثومان

اور مائدہ کی چیخ کی آواز سنی۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ساکت ہوگئے۔ تھوڑی دیر پہلے زندگی بچانے کی جدوجہد میں اور زندہ رہنے کی خواہش میں وہ دونوں بھاگے آرہے تھے، اب وہ دونوں گرے پڑے تھے اور آسمانی بجلی گرنے کی وجہ سے ان کے خوب صورت بدن سیاہ کوئلے میں تبدیل ہوچکے تھے۔

صوفیہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کردیا جبکہ عامر اور شہریار بھی سکتے کی حالت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مائدہ اور ثومان کے جلے ہوئے مردہ جسموں کو دیکھ رہے تھے، نہ جانے وہ کب تک یونہی کھڑے رہتے جب بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ نے انہیں ہوش کی دنیا میں لا پٹخا۔

وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا وہ دونوں اس دنیا سے منہ موڑ چکے تھے...... صوفیہ ہسٹریائی انداز میں روئے جارہی تھی۔ شہریار نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہی حالت عامر کی بھی تھی......! وہ اپنے دوستوں کے لئے اب کچھ نہیں کرسکتے تھے، ہاں ان کی یادیں ہمیشہ اپنے دل میں بسا کر رکھ سکتے تھے......!

موسم اپنے بھیانک پنجے یونہی کھولے کھڑا تھا جب عامر نے انہیں چلنے کو کہا...... صوفیہ مچل گئی۔ ”ہم انہیں یوں لاوارث چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں شہریار......؟ میں نہیں جاؤں گی۔“

”پاگل مت بنو صوفیہ۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، انہیں یوں چھوڑنے کو دل تو نہیں مان رہا لیکن ہم جب خود منزل کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں تو ان کو کہاں اور کیسے لے جائیں گے؟ موسم کے تیور دیکھ رہی ہو، اگر ہم یونہی بیٹھے رہے تو موت کو ہمیں دبوچنے میں کیا تامل ہوسکتا ہے۔ چلو اٹھو جلدی کرو۔“ شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ تینوں دکھی دل اور برستی آنکھوں سے وہاں سے اٹھ آئے۔ ”پتہ نہیں باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا اور وہ کہاں ہوں گے......؟“ ان تینوں کے دل میں یہی سوال تھا لیکن وہ زبان پر لانے سے ہچکچارہے تھے۔

وہ تینوں تیزی سے بھاگتے جارہے تھے نہ جانے کتنا وقت ہوا تھا انہیں بھاگتے ہوئے، جب بھاگتے بھاگتے صوفیہ کا ہاتھ شہریار کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ منہ کے بل گر پڑی شہریار اور عامر اپنی ہی جھونک میں آگے بھاگتے چلے گئے۔ کچھ آگے جاکر وہ رکے اور صوفیہ کی طرف آنے لگے۔ وہ منہ کے بل گری تھی اور اب آہستہ سے اٹھنے کی کوشش کررہی تھی کہ اک لرزہ خیز واقعہ ہوا، قریبی موٹے تنے والا ایک درخت زوردار چرچراہٹ سے جڑ سے اکھڑا اور صوفیہ کی ٹانگوں کے اوپر آگرا۔

صوفیہ کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ موٹے تنے والا درخت پوری قوت سے صوفیہ کی ٹانگوں پر گرا تھا۔ وہ درد و اذیت سے چیخے جارہی تھی اور ساتھ ہی درخت کے نیچے سے اپنی ٹانگیں نکالنے کے لئے زور لگا رہی تھی لیکن بے سود......

شہریار تڑپ کر آگے بڑھا۔ بارش کا پانی اس کی آنکھوں میں پڑنے سے ایک لمحے کو تو اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے آنکھوں کو میچ کر پانی کو باہر نکالا اور صوفیہ کے پاس پہنچا۔ عامر صوفیہ کو کسی بھی حرکت سے منع کررہا تھا کیونکہ اس طرح اسے نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ وہ اذیت سے مسلسل روئے جارہی تھی، شہریار اس کی اذیت اپنے دل پر محسوس کررہا تھا، ان دونوں نے مل کر تنا ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ بہت بھاری تھا، اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ سے ہٹا نہیں پارہے تھے، تھک کر گر گئے، ہانپنے لگے، صوفیہ بے بسی سے سر ادھر ادھر پٹخ رہی تھی۔ ان دونوں کو انتھک کوشش کرتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں التجا نما بے بسی اتر آئی۔ ”شہریار......“ اس نے بے بسی اور حسرت سے اسے پکارا...... اور سر ایک طرف ڈال دیا۔ وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

”شہریار تڑپ کر اٹھا اور پوری قوت سے تنا اٹھانے کی کوشش کرنے لگا، عامر بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ان کے چہرے زور لگانے کی وجہ سے سرخ ہوگئے تھے، آخر کار ان کی کوشش رنگ لائی اور وہ تنے کو ہٹانے

میں کامیاب ہوگئے تھے، تنے کو ایک طرف لڑھکا کو وہ گر کر ہانپنے لگے، ان کی سانس ان کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔

"نہ جانے یہ بارش اور آندھی کب تھمے گی؟"

عامر نے بے بسی سے آسمان کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے کہا لیکن مسلسل بارش کی بدولت وہ مکمل آنکھیں کھول کر اوپر دیکھ بھی نہ سکا اور پھر سے سر جھکا لیا۔

شہر یار نے صوفیہ کو سیدھا کیا وہ گہری بے ہوشی میں تھی، تیز بارش اس کو بھگو رہی تھی۔ ورنہ اب تک تو اسے ہوش میں آجانا چاہئے تھا۔ شہر یار نے اس کے چہرے کو تھپکا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

"یار مجھے صوفیہ کی پریشانی ہے یہ ہوش میں بھی نہیں آرہی۔ ہم اسے لے کر کہاں جائیں......؟" شہر یار کو صوفیہ کی حالت بہت پریشان کر رہی تھی۔ ثومان اور مائدہ کے بچھڑنے کا غم اپنی جگہ مگر موسم کی ہولناکی بدستور موجود تھی۔ عامر بھی خاموش ہوگیا کیونکہ اس کے پاس بھی کسی بات کا جواب نہیں تھا، نہ جانے کتنی دیر گزر گئی جب انہیں لگا کہ ہوا اور بارش کا زور کچھ ٹوٹ رہا ہے اور پھر آدھے گھنٹے تک بارش رک چکی تھی اور ہوائیں بھی اپنے پیچھے ہولناک تباہی چھوڑ کر رک چکی تھیں۔ شہر یار نے بے ہوش صوفیہ کو اٹھایا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ کسی نہ کسی طرح وہ بس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

وہاں چند تباہ حال لٹے پٹے حلیوں میں اسٹوڈنٹس موجود تھے، آدھے سے زیادہ اس طوفان کی نذر ہوگئے تھے اور جو بچے تھے وہ مردوں سے بھی بدتر تھے۔ پھر وہ بس میں بیٹھے، بس کی کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہوچکے تھے، بس بھی شاید الٹ چکی ہوتی، ایک درخت کے ٹائروں کے قریب گر کر گویا اسے سہارا فراہم کر رکھا تھا، شاید خدا اسے یونہی محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ پھر کس طرح سارا سفر طے ہوا کب وہ ریسٹ ہاؤس اور وہاں سے اسپتال پہنچے انہیں نہیں معلوم...... مگر شہر یار اس کی ساری توجہ صرف صوفیہ کی طرف تھی جو کبھی ہوش میں آکر کراہنے لگتی اور پھر بے ہوش ہوجاتی۔

اور پھر ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ "صوفیہ ٹانگوں سے معذور ہوچکی ہے اور وہ زندگی میں کبھی چل نہیں سکے گی۔"

تو کتنی دیر تک شہر یار بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتا رہا، ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ بے دم ہو کر فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

صوفیہ وہیل چیئر پر بیٹھی خلا، میں نہ جانے کیا کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جب آہٹ پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے ہی شہر یار ملک کھڑا تھا۔ بڑھے ہوئے شیو اور رف سے حلیے میں وہ بہت تھکا تھکا سا اداس لگ رہا تھا۔ اس کی سپاٹ آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ صوفیہ کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ کسی انہونی کے احساس اس سے قوت گویائی چھین لی تھی۔

"صوفیہ......" شہر یار نے عجیب سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"خدا کے لئے شہر یار کچھ ایسا مت بولنا کہ میں زندہ نہ رہ پاؤں۔" صوفیہ نے دل میں سوچا لیکن زبان سے خاموش رہی۔

"میں نے بہت سوچا خود کو بہت سمجھایا لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں...... تم جانتی ہو ناں کہ شہر یار ملک نے کبھی کسی عیب دار چیز کو پسند نہیں کیا......؟ کجا عیب دار انسان؟ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا صوفیہ...... لیکن میں تمہیں اپنا جیون ساتھی نہیں بنا سکتا، لوگ کیا کہیں گے کہ اتنا نفاست پسند، بے عیب چیزوں اور انسانوں کو پسند کرنے والا شہر یار ملک اور جیون ساتھی......؟ دونوں ٹانگوں سے معذور...... مجھے معاف کردینا صوفیہ، یہ میرے اختیار میں نہیں۔ میں آج ہی یہ ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جارہا ہوں۔" شہر یار نے اپنے آنسو پونچھے اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

صوفیہ کچھ دیر آنکھیں پھاڑے بے یقینی کی حالت میں بیٹھی رہی پھر اس کی آنکھوں سے آنسو گرے اور گرتے ہی چلے گئے۔

موت کا خط

عثمان غنی۔ پشاور

غیض و غضب کی حالت میں بپھرا ہوا ایک نوجوان ہر کسی کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوسروں کو موت سے ہمکنار کرنے لگا اسے بالکل بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور پھر موت سے اس کا سامنا ہوگیا۔

حقیقت سے چشم پوشی انسان کو کبھی کبھار نشان عبرت بنا دیتی ہے۔ ایک حقیقی روداد

احمر میز پر کہنیاں ٹکائے سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل تنہا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ میز پر ٹیبل لیپ روشن تھا۔ روشنی کے زرد دائرے میں احمر کے قریب ہی وہسکی کی ایک بوتل اور گلاس نظر آرہا تھا۔ گلاس میں وہسکی موجود تھی۔ دیوار گیر کلاک کے علاوہ کمرے میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

دفعتاً احمر کے عقب میں دروازہ نہایت آہستگی سے کھلا۔ اور ایک شخص سائے کی طرح بے آواز اندر داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا۔

"کیا حال ہے احمر حسین؟" اچانک نووارد کی آواز ابھری! اس کے لہجے میں غصہ اور تلخی عیاں تھی۔ کمرے کی فضا مرتعش ہو کر رہ گئی۔

احمر بری طرح سے چونکا۔ اور تیزی سے اٹھ

کھڑا ہوا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ جس سے شدید حیرت اور خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

”جہانگیر خان.......! تم یہاں.......“ احمر کی آواز گویا حلق میں اٹکنے لگی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نووارد کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر شدید غصے اور نفرت کے آثار تھے۔

جہانگیر نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ شعلہ بار نظروں سے احمر کو گھور رہا تھا۔ یہی وہ چہرہ تھا۔ جسے برسوں تصور میں رکھ کر اپنی نفرت کے زہر کو ایک نقطے پر مرتکز کرتا رہا تھا۔ اور یہی وہ شخص تھا جسے کبھی وہ اپنا دوست سمجھتا تھا۔

”ہاں میں ہوں جہانگیر خان۔“ جہانگیر خان پھنکارا۔ اس کے چہرے کی زردی بتا رہی تھی کہ وہ ایک طویل عرصہ قید میں گزار کر آیا ہے۔

احمر کے لئے اس کی آمد یقیناً غیر متوقع تھی۔ حیرت کے شدید جھٹکے سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہونا چاہا۔ تو لڑکھڑا گیا۔ تاہم لڑکھڑاتے ہوئے میز کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔ میز کو اس نے اتنی مضبوطی سے تھاما تھا کہ اس کا پورا ہاتھ سفید پڑ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بے شک انڈے کی زردی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک بے عنوان سی چمک عود کر آئی تھی۔

جہانگیر خان سفاکی سے مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت نمایاں تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں نفرت کا زہر کچھ اور بڑھ چکا تھا۔

”آج مجھے تم جیسے عظیم ڈاکٹر سے ملاقات کا شرف بڑے طویل عرصے بعد حاصل ہو رہا ہے۔ جس کی قابلیت کے چرچے بڑی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ عظیم ڈاکٹر میں اخلاقی جرات کی بڑی کمی تھی۔ اور ڈاکٹر کی خاموشی کی وجہ سے ایک بے گناہ آدمی جیل چلا گیا۔“ جہانگیر خان غرایا۔

احمر حسین خاموش کھڑا تھا۔ درحقیقت اس کا ذہن پندرہ برس پیچھے چلا گیا۔ وہ دن اس کی نظروں میں گھومنے لگے۔ جب اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایک پرجوش نوجوان ڈاکٹر تھا۔ مگر پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز میں ہی اس سے ایک سنگین غلطی ہوگئی۔ بلکہ یا یوں کہہ لیں کہ دوہری غلطی۔

زرینہ نامی ایک لڑکی سے اس کے مراسم تھے، جب ان مراسم کا پھل اس لڑکی کی کوکھ میں نمودار ہوا۔ تو احمر نے اس کے آپریشن کرنے کی ٹھانی۔ مراسم میں بے پروائی کر کے اس نے ایک غلطی تو کی تھی۔ آپریشن کا فیصلہ کر کے اس نے اس سے بھی بڑی سنگین غلطی کی۔ وہ اناڑی تھا۔ آپریشن میں غلطی کر گیا۔ اور یوں بیچاری زرینہ موت کے منہ میں چلی گئی۔

زرینہ کی موت کے وقت اس کا بھائی آپریشن روم میں آدھمکا۔ اس کے بھائی کا نام ثمر خان تھا۔ ثمر خان نے اسی وقت احمر کو دھمکی دی اور بلاتمہید یہ بات بتائی کہ وہ ساری حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اور اگر احمر اس کا منہ بند رکھنا چاہتا ہے تو اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔

اس طرح گویا ایک بھیانک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بلیک میلنگ کا یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ ثمر خان کے مطالبات مسلسل بڑھتے چلے گئے اور بالآخر اس کا انجام وہی ہوا جو عموماً بلیک میلنگ کے معاملات کا ہوتا ہے۔ یعنی ایک مقام وہ بھی آیا جب ثمر خان کے مطالبات پورے کرنا احمر حسین کے لئے ناممکن ہو گیا۔

احمر حسین نے ثمر خان کے آگے منتیں اور التجائیں کیں۔ رحم کی بھیک مانگی۔ مگر ثمر خان حقارت سے اس پر ہنستا رہا۔ ثمر خان اس سے بہت بڑی رقم مانگ رہا تھا جو احمر کے بس سے باہر تھی۔

تب ثمر خان پر احمر نے مجنونانہ حملہ کر دیا۔ احمر کی بدقسمتی تھی کہ ثمر خان جیسے موت کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہی مہلک وار سے وہ دارفانی سے کوچ کر گیا۔

ثمر خان کی موت سے احمر حسین بدحواس ہو گیا

اور وہ ثمر خان کے گھر سے بھاگ نکلا۔ کسی نے بھی اسے ثمر خان کے گھر میں آتے یا جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ باہر نکلتے وقت ارد گرد سے بیگانہ ہو کر تیزی سے بھاگ گیا۔

جہانگیر خان کی آواز اسے خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔ وہ کرخت اور کھردرے لہجے میں بولا۔

”تم نے شاید سوچا تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی مجھ سے سامنا نہیں ہوگا اور اگر کبھی ہوا بھی تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ یہ بھول جاؤں گا کہ تمہاری وجہ سے مجھے پندرہ سال جیل کے جہنم میں گزارنے پڑے۔ تمہاری جرائم کی سزا مجھے کاٹنی پڑی۔ اگر تم اس وقت خاموش نہ رہتے تو میں جیل جانے سے بچ جاتا۔ مگر تم نے تو اپنے ہونٹ سی لئے تھے۔ میں اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا اور حالات و شواہد نے مجھے مجرم ثابت کر دیا۔ کیونکہ میں نے چند ہی دن پہلے ثمر خان کو دھمکی آمیز خط لکھ بیٹھا تھا۔ اس کم بخت نے میری بہن نجمہ کو دھوکہ دیا تھا۔ مجھے اس بدبخت پر سخت غصہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے چند لوگوں کے سامنے اس کو دھمکی دی تھی اور قتل کرنے کا دھمکی بھرا خط لکھا تھا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس دوران وہ سچ مچ قتل ہو جائے گا اور رسی کا پھندا میرے گلے میں آ پڑے گا۔ مجھے جیل جانے کے بعد معلوم ہوا کہ قاتل درحقیقت کون ہے.......؟“

جہانگیر خان غصے سے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ ریوالور پر اس کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

”اس وقت میں نے قسم کھائی تھی کہ میں تمہیں تلاش کروں گا اور تمہاری جان لے کر ان اذیتوں کا حساب بے باق کر دوں گا۔ جو میں نے پندرہ سالوں میں اٹھائی ہیں۔“

اس نے ریوالور سیدھا کیا۔

شادی

ایک بے وقوف کسی شادی میں گیا۔ جب کھانے کا دور چلا تو سب کھانے پر ٹوٹ پڑے مگر جب وہ بیوقوف ٹیبل تک پہنچتا ہے تو اسے پلیٹ ہی نہیں ملتی کھانا ختم ہونے کے ڈر سے وہ بے وقوف اپنی جھولی میں ہی بھرنے لگتا ہے آخر ایک شخص اسے بول ہی دیتا ہے۔ ”بھائی صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

بے وقوف بولا: ”داغ تو چلا جائے گا یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔“

(ظفر بلوچ۔کراچی)

احمر کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی اور اضطراب تھا۔

وہ بے تابی سے بولا۔ ”خدا کے لئے جہانگیر چند لمحے ٹھہرو....... میری ذرا سی بات سن لو....... مجھے وضاحت کرنے دو....... مجھے صفائی پیش کرنے کا ایک موقع تو دو.......“

اس نے کانپتے ہاتھ سے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس دراز میں ایک خط ہے جو.......“

”بکواس بند کرو بزدل کہیں کے!“ جہانگیر نے چلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب وضاحت اور صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں رہا۔ بہت ڈھیٹ ہو تم جواب بھی وضاحتوں کی مہلت مانگ رہے ہو۔“ غصے سے جہانگیر کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے ریوالور پر گرفت مضبوط کر لی۔

”دیکھو خدا کے لئے مجھے مت مارو۔ مجھے صرف ایک موقع دو۔ میں نے.......“

”خاموش، اپنی بکواس بند کرو۔ کیونکہ آج حساب کا دن ہے اور میں اجل کا فرشتہ بن کر آیا ہوں۔“ اس کے الفاظ میں واضح درندگی محسوس کی جا سکتی تھی۔

جہانگیر خان کے دھمکی آمیز الفاظ سن کر احمر حسین کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ جیسے اسے شدید سردی لگ رہی ہو۔ وہ کپکپاہٹ کی وجہ سے اب واضح طور پر بول بھی نہیں سکتا تھا۔

"دیکھو...... جہانگیر خان میں نے اس میز کی دراز میں تمہارے لئے ایک خط......"

جہانگیر نے نفی میں گردن ہلائی۔ اور احمر کی کسی بھی بات پر کان نہیں دھرے۔ اس کے چہرے پر نفرت آخری حد تک چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ہلکا سا دھماکہ ہوا اور احمر سینے پر ہاتھ رکھے اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔

جہانگیر نے ریوالور جھکا لیا۔ اور چند لمحے تک اپنے قدموں میں پڑے ہوئے بے جان جسم کو تکتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کے اعصاب پرسکون ہو رہے تھے۔ وحشت رخصت ہو رہی تھی اور اس کے جھلسے ہوئے دل میں ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ اس نے ریوالور جیب میں رکھ کر کمرے کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ اس کی نظر وہسکی کی گلاس پر آ کر ٹھہر گئی۔

"بہت خوب میرے لئے تو یہاں ڈرنک بھی موجود ہے۔" اس نے باآواز بلند کہا اور گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ "یہ جام تمہارے نام کا تھا۔ آنجہانی احمر حسین۔" وہ لاش کی طرف دیکھ کر استہزائیہ لہجے میں بولا۔ اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے اپنے لئے بوتل سے مزید وہسکی انڈیلنے کا ارادہ کیا۔

مگر پھر اس کو یاد آیا کہ احمر نے کسی خط کا ذکر کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ خط کو ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔

خط اسے اوپر والی دراز میں ہی مل گیا۔ وہ خط احمر کے وکیل کے نام تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور پرتجسس انداز میں خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھتے پڑھتے وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔ وہ خط کی آخری سطریں نہیں پڑھ سکا۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا گئے۔

اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی۔ وہ فرش پر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ اس کے جسم کو شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ نزع کا عالم تھا۔ بالآخر اس کا جسم ساکت ہوگیا۔ اور بے نور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

خط اس کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس کا مضمون تھا۔

وکیل صاحب یہ خط آپ سے آخری بار رابطے کا ذریعہ بنے گا۔ اس کے بعد میں کبھی بھی آپ کو کسی کام کی زحمت نہیں دوں گا۔ آج میرے دوست ڈاکٹر، پروفیسر جواد نے میرے بدترین خدشات کی تصدیق کردی ہے۔ میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔ کینسر نے اپنی مہلک اور موت کی جڑیں میرے پورے جسم میں پھیلا دی ہیں۔ میری زندگی کے اب تھوڑے دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔ شاید زیادہ سے زیادہ چند ہفتے ہی زندہ رہ سکوں۔ زندگی کے چند دنوں میں مجھے جو شدید تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ اسے برداشت کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سسک سسک کر مرنے کے بجائے ایک سریع الاثر زہر کے ذریعے یکدم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا خاتمہ کرلیا جائے۔

میں نے سنا ہے کہ جہانگیر خان جیل سے رہا ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ میں نے اپنی تمام جائیداد اور دولت جہانگیر خان کے نام کردی ہے اور جو وصیت آپ کے پاس ہے۔ وہ جہانگیر خان کو پہنچا دی جائے۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح ان تمام اذیتوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوجائے گی۔ جو میری اخلاقی کمزوری، بزدلی اور خاموشی کی وجہ سے جہانگیر خان کو گزشتہ برسوں میں برداشت کرنا پڑی ہوں گی۔ میں نے اپنی وہسکی کے آخری گلاس میں وہ زہر ملا لیا ہے جو چند لمحوں میں مجھے موت کے منہ میں پہنچا دے گا۔

ہیلووین

ایس حبیب خان۔ کراچی

ملگجے اندھیرے میں خوبرو حسینہ شربت کا پورا گلاس پی گئی، شربت بہت مزیدار تھا، اس نے شربت کی بہت تعریف کی اور ساتھ ہی ایک اور گلاس کی فرمائش کردی مگر جب اسے پتہ چلا کہ وہ شربت دراصل انسانی خون تھا تو......

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی خوفناک کہانی

جولی اور سینڈرا صوفے پر بیٹھی تھیں۔ سینڈرا اسنیکس اور سافٹ ڈرنک لئے مووی دیکھ رہی تھی۔ جبکہ جولی اپنے ہاتھوں میں نیل پالش لگا رہی تھی۔

"یار مجھے تو اس روٹین سے بوریت ہو رہی ہے۔ کب ختم ہوں گی یہ چھٹیاں!" جولی نے سینڈرا کو مخاطب کیا۔

"یو آر رائٹ!" سینڈرا نے گلاس منہ سے ہٹا کر جولی کی تائید کی۔

جولی اور سینڈرا فرینڈز ہونے کے ساتھ، ساتھ رہتی بھی ایک ہی گھر میں تھیں۔ دونوں پڑھنے کے لئے ٹیکساس آئی ہوئی تھیں۔ ایگزامز ختم ہوچکے تھے اور دونوں کی چھٹیاں تھیں۔ "کیوں ناں ہم کوئی جاب کرلیں۔" سینڈرا نے سوچ کر کہا۔

"سینڈی جاب اور میں؟" جولی نے غرور سے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ جولی ایک انتہائی مغرور لڑکی تھی اور

غصہ تو اس کا ایسا ہوتا تھا کہ اسے کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ نوکری تو بہت دور کی بات ہے۔ میں تو کسی کی رائے لینے کی زحمت نہیں کرتی۔ جولی نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے یار تم سیریس ہوگئیں، یہ تو ٹائم پاس کی بات ہے۔ ہم نے کونسی آفس جاب کرنی ہے جو ہمیں باس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔ ہم اپنے ٹائپ کی جاب تلاش کریں گے۔" سینڈرا نے تفصیل سے کہا تو جولی نرم پڑ گئی۔

جولی! جولی! سینڈرا آوازیں دیتی جولی کے روم میں آئی۔ اسی وقت باتھ روم کا دروازہ کھلا اور جولی تولئے میں بال لپیٹے باہر آئی۔ "کیا بات ہے؟" سینڈی ڈیئر!" جولی نے مسکرا کر پوچھا۔

جولی کی ساری خوش اخلاقی صرف سینڈرا کے لئے تھی وہ سینڈرا کی بہت سی باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی مان لیتی تھی کیونکہ سینڈرا میں اس کی جان بستی تھی۔ دونوں بچپن کی فرینڈز تھیں۔ "جولی ایک جاب ہے جو ہم دونوں ایک ساتھ کر سکتے ہیں، کل ہمیں چلنا ہے۔" سینڈرا نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

"جاب ہے کیا؟" جولی نے تولیہ ایک طرف ڈالا اور ہیئر ڈرائیر سے بال خشک کرنے لگی۔

"آر۔ جے کی جاب ہے۔ فن کا فن، ساتھ پیسے بھی۔" سینڈرا نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔

"تم کہتی ہو تو دیکھ لیں گے۔" جولی نے لاپروائی سے شانے اچکا کر کہا۔

"بس کل آڈیشن میں پاس ہوجائیں تو مزہ آجائے۔" سینڈرا نے خیالی انداز سے کہا۔

"کس میں دم ہے جو جولی کو ریجیکٹ کرے۔" جولی نے بھنویں چڑھا کر کہا۔

"ہوں!" آئی لائیک یور کونفیڈنس" سینڈرا نے کہا تو دونوں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔

☆......☆......☆

اگلے روز جولی اور سینڈرا ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئیں وہاں اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ مگر جولی کا اعتماد ہی کچھ اور تھا اور وہ تھی بھی خوب صورت، سب وہاں اس کی شخصیت سے متاثر ہوتے نظر آئے۔ جسے خود جولی نے بھی محسوس کرلیا اور غرور سے اس کی گردن اور تن گئی۔ پھر جولی اور سینڈرا کی باری آگئی۔ پہلے انٹرویو تھا پھر آڈیشن۔ دونوں ینگ تھیں۔ تعلیم یافتہ تھیں، انرجیٹک تھیں اور سب سے اہم یہ کہ دونوں باتوں کی تو ماہر تھیں۔ اگر ان کی کسی سے بحث ہوجاتی تو سامنے والا ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگتا۔ دونوں آڈیشن میں پاس ہوگئیں۔ پھر اسٹیشن ہیڈ نے ان کے ساتھ سارے معاملات طے کرلئے۔ انہیں نائٹ شو سے کام اسٹارٹ کرنا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں ان کا شو ینگسٹرز میں مشہور ہونے لگا۔ وہ "راک شو" کرتی تھیں جو کہ نوجوانوں میں بہت مقبول ہوگیا۔ دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کچھ ہی دنوں میں مشہور ہوجائیں گی۔ ان کے شو کی ریٹنگ اوپر جاتی رہی تھی کسی کو سینڈرا کا مذاق پسند تھا تو کوئی جولی کے جدا انداز کا دیوانہ تھا۔ لوگوں کی فرمائش پر ان کے شو کا دورانیہ بھی بڑھا دیا گیا۔ دونوں کو گھر پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہوجاتی تھی۔

"اور یہ ہے آج کے شو کا لاسٹ سانگ بائے۔ "لنکن پارک" اس کے ساتھ ہی مجھے سینڈرا اور جولی کو اجازت دیں، کل پھر ملاقات ہوگی سیم ٹائم، سیم چینل اونلی اون یور فیورٹ شو "دی راک شو" گڈ نائٹ اینڈ ٹیک کیئر" شو ختم کرکے دونوں پروگرام ہیڈ کے روم کی طرف جانے لگیں۔ پروگرام ہیڈ نے شو کے بعد انہیں کچھ بات کرنے کے لئے اپنے روم میں بلایا تھا۔

"یار سینڈی جاتے وقت کچھ لے کر چلنا مجھے بھوک لگ رہی ہے، گھر پہنچنے کا میں ویٹ نہیں کرسکتی۔" جولی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔ دونوں باتیں کرتیں پروگرام ہیڈ کے روم کے سامنے پہنچ گئیں۔ جولی نے دروازہ ناک کیا۔ "یس!" اندر سے مسٹر مائیکل کی آواز آئی تو دونوں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ "کم

ان!" مسٹر مائیکل نے مسکرا کر کہا۔ دونوں اندر آگئیں۔

"پلیز سٹ!" مسٹر مائیکل نے خوش اخلاقی سے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ لوگوں کو اس لئے بلایا ہے کہ دو دن بعد "ہیلووین ڈے" سیلیبریٹ کیا جارہا ہے۔ اور ہمارا چینل پورا دن خاص ٹرانسمیشن نشر کرے گا۔ ویسے تو آپ لوگ "راک شو" کرتی ہیں، مگر اس روز آپ اسپیشل شو کریں گی۔"

"اوکے سر!" سینڈرا نے مسکرا کر کہا۔ جبکہ جولی خاموش رہی، پھر دونوں مسٹر مائیکل سے اجازت لے کر باہر آگئیں اور پارکنگ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگیں۔ "یار سینڈ! یہ کیا بکواس ہے؟" جولی نے گاڑی کا دروازہ سیٹ پر بیٹھ کر زور سے مارتے ہوئے کہا۔

"کیا چیز؟" سینڈرا نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیلووین شو اور کیا۔" جولی نے منہ پھلا کر کہا۔

"تو اس میں کیا ہے، بھئی جب ہیلووین ہر سال سب سیلیبریٹ کرتے ہیں تو اس دن اسی حوالے سے شو ہوگا ناں!" سینڈرا نے گاڑی روکتے ہوئے کہا اور پھر گیٹ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔ جولی نے میوزک پلیئر آن کردیا اور "ہیلو" کو سننے لگی۔ تھوڑی دیر میں سینڈرا گاڑی میں آکر بیٹھ گئی، اس نے برگر جولی کی جانب بڑھایا اور خود ہاتھ میں موجود ڈرنک کین کھول کر گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

گھر پہنچ کر دونوں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ "یار میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔" جولی نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرو تم فریش ہوجاؤ میں تمہارے لئے اچھی سی کافی بنا کر لاتی ہوں۔" سینڈرا نے پیار سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ چند منٹ میں جولی فریش ہو کر بستر پر بیٹھ گئی۔ سینڈرا کافی کا مگ لئے اس کے پاس آئی اور اسے کافی دے کر وہیں بیٹھ گئی۔

"سینڈی یار! وہ بکواس شو تم اکیلے ہی کرلینا اور میرے نہ آنے کا بہانہ بنا دینا جس چیز پر میں یقین نہیں کرتی اس کے بارے میں لوگوں کو کیا بولوں گی، مجھے تو یہ سب انتہائی فضول لگتا ہے! بھوت، چڑیل، ویمپائر اور ڈیمن وغیرہ بھلا ان کا وجود بھی ہے، ان سب کے روپ بنا کر لوگوں سے بے ہودہ مذاق کرو، ڈراؤ۔ "ٹرک اور ٹریٹ" جولی نے بےزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کم آن! جولی تم ابھی تک اسی میں اٹکی ہو؟ یار یہ صرف ایک ٹریڈیشن ہے جو لوگ سیلیبریٹ کرکے انجوائے کرتے ہیں۔" سینڈرا نے کہا۔

"کرتے ہوں گے، مگر میں اس پر یقین نہیں کرتی۔ ایسی کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا جسے لوگ "سپر نیچرل" کہتے ہیں۔" جولی نے اپنی بھڑاس نکالی۔

"نہیں کرتی یقین تو تم نہ کرو، مگر جو لوگ کرتے ہیں ان پر تم کیوں غصہ نکال رہی ہو۔ ہر شخص آزاد ہوتا ہے اپنی مرضی کرنے کے لئے۔" سینڈرا نے اسے سمجھایا۔

"اچھا! تم کرتی ہو ان سب پر یقین؟" جولی نے بےساختہ سوال کرلیا۔

"آئی ڈونٹ نو! کچھ سچ ہوتا ہے کچھ حقیقت مگر مجھے ان سب کے وجود سے انکار نہیں ہے۔" سینڈرا نے جواب دیا۔

"اچھا اب بہت دیر ہوگئی ہے میں سونے جارہی ہوں مجھے نیند آرہی ہے گڈ نائٹ!" سینڈرا جولی کے روم سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

"اسٹوپڈ ہو تم بھی باقی لوگوں کی طرح۔" جولی نے مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بستر سے کود کر نکل آئی اور برش کرنے چلی گئی۔

جولی اپنے روم سے باہر آکر ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ نہ دیکھ کر حیران ہوگئی۔ روز سینڈرا جولی کے آنے سے پہلے سب تیار کرکے رکھتی تھی۔ مگر آج ٹیبل خالی تھی جولی فوراً سینڈرا کے روم کے پاس آئی اور دروازہ ناک کرکے سینڈرا کو آواز دی۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں

آیا۔ جولی نے ہینڈل گھمایا اور اندر جا کر آواز دی ”سینڈی!“ مگر سینڈرا بستر سے نہ اٹھی تو جولی نے قریب جا کر سینڈرا کو ہلایا۔ جیسے ہی جولی کا ہاتھ سینڈرا کے ہاتھ سے ٹکرایا وہ چونک گئی۔ سینڈرا بخار میں تپ رہی تھی۔

”اوہ! سینڈی۔“ جولی نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سینڈرا کو آواز دی۔ سینڈرا نے اپنی بوجھل آنکھیں مشکل سے کھولیں اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ جولی نے جلدی سے ڈاکٹر کو کال کر کے بلایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دوا کھا کر ایک دن ریسٹ کریں ٹھیک ہو جائیں گی۔“

جولی نے سینڈرا کو ہلکا پھلکا ناشتہ دے کر دوا دے دی اور خود اپنا لیپ ٹاپ لے کر اس کے برابر میں ہی بیٹھ گئی۔ دوپہر کو سینڈرا کو چھینکیں بھی آنے لگیں۔

”لگتا ہے یہ چھینکیں مجھے پاگل کر دیں گی۔“ سینڈرا نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

جولی نے ڈاکٹر کو کال کر کے سینڈرا کے لئے نئی دوا لے لی۔

”آآآ چھیں!! سینڈرا کو زوردار چھینک آئی تو اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور تکیہ اونچا کر کے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

شام ہوتے ہوتے سینڈرا کا نزلہ بڑھ گیا تھا۔

”لو سینڈی! یہ گرم گرم سوپ پی لو۔ پھر دوا کھا لینا۔“ جولی ٹرے میں سوپ کا بھاپ اڑتا پیالہ لئے سینڈرا کے پاس آ گئی۔ اور پیالہ سینڈرا کی جانب بڑھا دیا۔ ”یو نو، سینڈی تمہاری وجہ سے آج کا یہ بورنگ شو مجھے اکیلے کرنا پڑے گا۔“ جولی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم ریئلی سوری!“ سینڈرا نے سوپ پیتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں جا رہی ہوں۔ دروازہ میں لاک کر جاؤں گی۔ تم یہ سوپ پورا ختم کرنا اور پھر آرام کرنا اوکے؟“ جولی نے کہا تو سینڈرا نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

”ہیلو! اینڈ ویری وارم ویلکم ٹو آل مائی لسنرز، آج تھرز ڈے تھرٹی فرسٹ اکتوبر ہے، آج کا ہمارا شو نارمل سے ہٹ کر ہے جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ تھرٹی فرسٹ اکتوبر کو ”ہیلووین ڈے“ منایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے آپ لوگوں نے سارا دن مختلف شوز انجوائے کئے ہوں گے۔ ہمارا شو بھی اسی کا حصہ ہے۔ آج کا شو نارمل شو نہیں ہوگا بلکہ آج آپ کالز کر کے مجھے بتائیں گے کہ ”آپ نے کبھی سچ مچ کا بھوت دیکھا ہے؟“ آج آپ کے ساتھ صرف میں ہوں سینڈرا نہیں آ سکیں۔ آپ مجھے کالز کریں اور اپنے اپنے ایکسپیرینس شیئر کر کے بتائیں نمبر آپ کا جانا پہچانا ہے۔“ جولی نے نمبر دہرایا اور سانگ پلے کر دیا۔

اور پھر آف ایئر جا کر خوب بکا۔ ”دل تو چاہ رہا ہے یہ بکواس چھوڑ کر ابھی بھاگ جاؤں، اس سے اچھا تو سینڈی کی جگہ میں بیمار ہو جاتی کم از کم یہ شو تو نہیں کرنا پڑتا۔“

سانگ ختم ہو گیا تو جولی آن ایئر چلی گئی۔ آج کا سوال میں ایک بار پھر دہرا دیتی ہوں۔ ”آپ نے کبھی سچ مچ کا بھوت دیکھا ہے؟“ اس کے ساتھ ہی دیکھتے ہیں آج کے شو کے پہلے یا پہلی کالر کون ہیں؟ ہیلو! جولی نے کہا۔

”ہیلو جولی آئی ایم نتاشا!“ دوسری طرف سے لڑکی بولی۔

”جی نتاشا کیا کہنا چاہیں گی آپ۔“

”ہمارے پرانے گھر میں عجیب وغریب چیزیں ہوتی تھیں۔“ نتاشا نے بتایا۔

”کیسی چیزیں؟“ جولی نے پوچھا۔

”رات کو ہمارے گھر کی کھڑکیاں بجنے لگتی تھیں۔“ نتاشا بولی۔

”یہ تو کوئی عجیب چیز نہیں ہوئی یہ تو ہوا سے بھی ہو سکتا ہے۔“ جولی نے کہا۔

”رات کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے چھت پر کوئی بھاگ رہا ہو۔“ نتاشا نے مزید بتایا۔

”یہ بھی کوئی عجیب چیز نہیں۔ کوئی بلی وغیرہ

ہو گی۔ یہ سب وہم ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ اینی ویز نتاشا اور کچھ کہنا چاہیں گی آپ؟“

”سینڈرا کدھر ہیں؟“ نتاشا نے پوچھا۔

”سینڈرا کو بخار ہے اس لئے وہ نہیں آ سکی۔ اوکے بائے!“ جولی نے کال کے بعد سانگ پلے کرا اور سکون کا سانس لیا۔ سانگ کے بعد کمرشل بریک تھا۔ جولی نے اپنے بیگ سے چپس کا پیکٹ نکالا اور کھانے لگی۔ بریک ختم ہونے سے پہلے وہ ریڈی ہو کر مائیک کے سامنے آ گئی۔ ”چلتے ہیں اپنے اگلے کالر کی طرف ہیلو۔!“ جولی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”ہیلو جی! کیسی ہیں آپ؟“ ایک لڑکا بولا۔

”میں ٹھیک ہوں، پہلے آپ سننے والوں کو اپنا نام تو بتا دیں۔“ جولی نے کہا۔ ”اوہ میں لوئس!“

”اوکے! لوئس آپ کیا بتائیں گے؟“ جولی نے پوچھا۔

”ہمارے آفس کے پارکنگ ایریا میں ایک روح رہتی ہے۔“ لوئس نے بتایا۔

”روح اور وہ بھی پارکنگ ایریا میں؟“ جولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا، میرے علاوہ آفس کے کئی لوگوں نے اس روح کو دیکھا ہے۔“ لوئس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”مگر روح کو پارکنگ ایریا میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ سوتی کہاں ہو گی؟ وہاں تو بستر بھی نہیں ہوگا؟ ہاہاہا!!“ جولی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ لوئس نے ناراض ہو کر فون رکھ دیا۔ ”لوئس صاحب تو چلے گئے ہم چلتے ہیں نیکسٹ کال کی طرف ہیلو!“ جولی نے کہا۔

”ہیلو جولی! مائی نیم از روجر۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کہیں روجر فیڈرر تو نہیں؟“ جولی نے مذاق کرتے ہوئے سوال کیا۔

”نو! صرف روجر۔“ لڑکے نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

”اوکے روجر! آپ سے کسی بھوت کی ملاقات ہوئی؟“ جولی نے کہا۔

”بھوت! مجھ سے خود سارے بھوت گھبرا جائیں گے، میں بھوتوں پر یقین نہیں کرتا۔“ روجر نے کہا تو جولی میں جیسے جان پڑ گئی۔

”آئی لائیک اٹ!“ پھر جولی نے روجر سے اچھی طرح بات کر کے سانگ پلے کر دیا۔ ایک کے بعد ایک کال نے جولی کا موڈ آف کر دیا۔ اور پھر مذاق اڑاتے اڑاتے وہ روڈ ہوتی چلی گئی، کسی کی بات کاٹی، کسی سے غصے میں بات کی، یہاں تک کہ ایک لڑکی کا اتنا مذاق اڑایا کہ اسے رلا دیا، شو ختم ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تو جولی نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”اب ہم چلتے ہیں پروگرام کے آخری کالر کی جانب اور دیکھتے ہیں ہو از آن دی لائن؟“ ”ہیلو“ جولی نے کہا۔ فون پر خاموشی تھی۔

”ہیلو!“ جولی نے پھر کہا۔ مگر کوئی آواز نہ آئی جولی لائن کٹ کرنے والی تھی کہ کسی کی سانسوں کی آواز آئی۔

”ہیلو!“ جولی نے تیسری بار کہا۔ اب کہ اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

”ہیلو!“ ایک آدمی کی آواز آئی۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“ جولی نے پوچھا۔

”ٹام۔“ دوسری جانب سے آواز آئی۔

”مسٹر ٹام آپ کال ملا کر سو تو نہیں گئے تھے ویسے بھی کافی رات ہونے والی ہے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟“ جولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“ ٹام نے روکھے انداز سے کہا۔ اس کی بات سن کر جولی کا پارہ ہائی ہونے لگا۔ ”تو پھر مسٹر ٹام آپ بات کرنا بھی پسند کریں گے یا نہیں؟“ اس نے طنز کیا اگر وہ آن ایئر نہ ہوتی تو اس کی خوب عزت افزائی کرتی۔

”میں شروع سے آپ کا شو سن رہا ہوں، آپ کی بے حد روڈنیس نے مجھے کال کرنے پر مجبور کیا ہے۔ آپ کے بارے میں میری رائے ہے کہ آپ کے

پروڈیوسر کو فوراً آپ کو اس شو سے نکال دینا چاہئے۔ کیونکہ جس ہوسٹ کو کالرز کی رائے کا احترام نہیں ہو اسے اس مائیک پر بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ کی رائے مختلف ہے آپ بھوتوں پر یقین نہیں کرتیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسروں کی تذلیل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ آج آپ نے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے، کل آپ کو اس مذاق کی قیمت چکانی پڑے۔'' ٹام کافی غصے میں تھا۔ ''آپ کو اپنے تمام کالرز سے معذرت کرنی چاہئے۔ سب اپنا اپنا ایکسپیرئینس شیئر کر رہے تھے اور اپنی رائے ان پر......'' ٹام بات کر ہی رہا تھا کہ جولی نے جان بوجھ کر اس کی لائن ڈس کنیکٹ کردی۔ اور چالاکی سے بات بنائی۔ ''اوپس! لگتا ہے لائن ڈراپ ہوگئی۔ اینی ویئر اس کے ساتھ آج کے شو کا وقت ختم ہوگیا۔ میں آپ کو لاسٹ سانگ کے ساتھ چھوڑ کر جارہی ہوں اپنا خیال رکھئے گا، کل پھر ملاقات ہوگی۔ سانگ ہے۔ ''تھرلر'' بائی مائیکل جیکسن، گڈ نائٹ اینڈ فاسٹی بائے!'' جولی نے شو اینڈ کیا اور مائیک آف کرکے بڑبڑائی۔ ''سوری مائی فٹ!'' اور گھڑی پر نگاہ ڈالی پونے بارہ ہورہے تھے اس نے پرس سے گاڑی کی چابی نکالی اور انگلی میں گھماتی ہوئی لفٹ میں آگئی۔

نیچے پارکنگ ایریا میں لفٹ کا دروازہ کھلا تو اس کی انگلی میں گھومتی چابی رک گئی۔ سامنے بالکل سناٹا تھا۔ جولی اور سینڈرا روز اسی وقت نکلتی تھیں مگر آج جولی کو جانے کیوں اکیلے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے قدم تیز ہوتے جارہے تھے، گاڑی کے پاس آکر اس نے جیسے ہی دروازے میں چابی لگائی تو اس کو محسوس ہوا کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے، وہ ایک دم پلٹی مگر وہاں صرف سناٹا تھا، خوف کی ایک انجانی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا، سیٹ پر بیٹھ کر پھرتی سے دروازہ بند کرلیا۔ منہ پر آئی لٹ کو ہٹا کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پارک ہوئی کاروں کی لائن پار کرتی ہوئی باہر نکلنے والے راستے پر آگئی۔

وہاں سیکورٹی گارڈ موجود تھا، اس نے اس کو چیک کیا اور جانے کا سگنل دے دیا۔ گارڈ کو موجود پاکر اس کو جانے کیوں سکون کا احساس ہوا۔ گاڑی بلڈنگ سے باہر آتے ہوئے اس نے مسکرا کر سر ہلایا اور خود سے کہا۔ ''لگتا ہے آج کا شو کرکے میرا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ سب اسی کا اثر ہے۔''

اس نے کار کی اسپیڈ بڑھادی۔ اندھیرے میں تیزی سے پیچھے جاتے درخت اس کو وحشت ناک لگ رہے تھے۔ ''سینڈرا پتہ نہیں جاگ رہی ہوگی یا نہیں؟'' اس نے سوچا۔ پھر اچانک اس کی کار نے دو تین جھٹکے لئے اور رک گئی۔ اس نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرنے کے لئے چابی گھمائی۔ کھر کھر کھر...... کرکے گاڑی خاموش ہوگئی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی، تیسری بار مگر گاڑی ہر بار یوں ہی خاموش ہوجاتی، اس کو غصہ آرہا تھا۔ ''شٹ!'' کہہ کر اس نے زور سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا اور باہر نکل کر زور سے گاڑی کا دروازہ بند کردیا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک کسی گاڑی کا نام ونشان نہ تھا، اس کو معلوم تھا یہ سڑک ہمیشہ سنسان رہتی ہے۔ وہ لوگ روز گزرتے ہیں یہاں سے۔ اس نے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی گھڑی کے چمکتے ڈائل میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ''اس سے تو اچھا تھا یہ وہیں خراب ہوجاتی، کم از کم کوئی مدد تو مل جاتی۔'' پندرہ منٹ انتظار کرتے ہوئے گزر گئے مگر نہ تو کوئی گاڑی آئی اور نہ ہی کوئی انسان نظر آیا۔ تھک کر اس نے گاڑی لاک کی اور سڑک سے اتر کر ایک طرف بنے راستے پر بڑھنے لگی۔ ''شاید کوئی یہاں مل جائے یا کسی کا گھر ہو؟'' اس نے سوچا۔

''وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جارہی تھی۔ راستہ صاف ستھرا اور دونوں اطراف اونچی اونچی جھاڑیاں ترتیب سے اگی ہوئی تھیں، جن کی لمبائی اس کے سر سے بھی اونچی تھی، چلتے چلتے رک کر وہ کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی، اسے بائیں طرف جھاڑیوں سے کسی کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ آواز قریب ہوتی جارہی تھی۔ پھر جھاڑیوں میں حرکت ہوئی، اس عذرے اس

جانب دیکھنے لگی۔

اچانک جھاڑیاں ہٹیں تو وہ دھک سے رہ گئی۔ وہاں ایک ''پمپکن ہیڈ'' کھڑا تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی رہی پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے دماغ میں گونج گیا۔ ''آج تو ہیلووین ہے جس میں اکثر لوگ ''پمپکن ہیڈ'' بنتے ہیں۔''

وہ آگے بڑھتی اور چلتی ہوئی اس پمپکن ہیڈ کے قریب جاتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ میری مدد کریں گے؟ میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔'' وہ اس پمپکن ہیڈ کے سامنے پہنچ کر رک گئی، اس نے پمپکن ہیڈ کی آنکھیں دیکھ کر وہ چونکی، وہاں خالی گڑھوں سے انسانی آنکھ کے بجائے روشنی جھلک رہی تھی۔ پھر اس پمپکن ہیڈ نے قہقہے لگانے شروع کردیئے اس کے کھلے منہ سے بھی روشنی جھلک رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں وہ بے حد خوفناک لگ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی جگہ نوکیلی چھریاں لگی ہوئی تھیں، اس پمپکن ہیڈ نے ہاتھ گھما کر اس پر وار کیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی مگر اس کے کاندھے میں انگارے سے دہکتے محسوس ہوئے۔ اس نے اپنے کاندھے کو دیکھا وہاں تین گہری لکیریں پڑگئی تھیں جن سے خون رسنے لگا تھا۔

اس نے بغیر سوچے سمجھے آگے کی جانب دوڑ لگادی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے بھاگ رہی تھی۔ اپنے عقب میں گونجتے قہقہے دور ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ پھر اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ اب اس سے بالکل بھاگا نہیں جارہا تھا۔ وہ رک گئی مگر پیچھے مڑ کر دیکھنا نہ بھولی۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اس کا سانس انجن کی طرح چل رہا تھا اور دل اتنا بے قابو ہورہا تھا کہ مانو ابھی منہ سے نکل کر باہر آجائے گا۔

ابھی اسے سانس لئے چند لمحے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اسے جھاڑیوں میں آواز سنائی دی۔ اس نے اپنے پورے وجود کی طاقت سمیٹی اور دوبارہ بھاگنا شروع کردیا۔ بھاگتے بھاگتے جھاڑیاں ختم ہوگئیں اور ان جھاڑیوں کے اختتام پر ایک کھلا میدان تھا۔ دور دور تک پھیلا ہوا اور کافی آگے کچھ مکانات بنے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کو کچھ ہمت ہوئی اور وہ بھاگتے بھاگتے ان مکانات کی طرف گئی۔ اس کے ہاتھ میں بہت درد ہورہا تھا۔ وہ گرتی پڑتی ایک مکان کے دروازے پر پہنچی اور اسے کھٹکھٹانے لگی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ دروازہ کھلنے سے پہلے کہیں وہ پمپکن ہیڈ آکر اسے دبوچ نہ لے۔ دروازہ نہ کھلا تو اس نے شدت سے دروازہ پیٹنا چاہا مگر دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اندر اندھیرا ہورہا تھا۔ ''ہیلو! کوئی ہے؟'' اس نے اندر داخل ہوکر کہا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

''وہ دروازہ بند کرنا نہ بھولی۔ وہ پمپکن ہیڈ اس کے سر پر سوار تھا۔ اس نے پھر زور سے کہا۔ ''کوئی ہے؟'' مگر وہاں صرف خاموشی تھی۔ سامنے دیوار پر گھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے سوئچ بورڈ کے بٹن دبائے تو لائٹ جل گئی۔ گھڑی رکی ہوئی تھی اس میں بارہ بج رہے تھے۔ اس نے اپنی کلائی پر بندی گھڑی دیکھی تو دو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ اس کو رونا آرہا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ نہ اس راستے پر آتی اور نہ ہی وہ ان حالات میں پھنستی۔ اسے وہیں سڑک پر انتظار کرنا چاہئے تھا۔

اس کے سامنے میز پر ٹرے میں سرخ سرخ بالکل فریش سیب رکھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کی بھوک جاگ اٹھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے ایک سیب اٹھالیا۔ اس نے سیب کا بائیٹ لیا سیب بے حد میٹھا تھا، اچانک اسے دور سے شاور سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی، وہ مڑی تو تھوڑے فاصلے پر باتھ روم تھا اس کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا جس سے روشنی باہر آرہی تھی، وہ اس طرف بڑھی۔ ''ہیلو۔'' اس نے دروازے کو انگلی سے ناک کیا۔ مگر کوئی آواز نہ آئی تو وہ اندر داخل ہوئی۔ چھت میں لگے شاور سے پانی گر رہا تھا۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر سائیڈ میں رکھے باتھ ٹب پر پڑی تو اس کی چیخ

نکل گئی اس میں ایک مردہ عورت پڑی ہوئی تھی، وہ لاش سڑنے لگی تھی۔

وہ بھاگ کر باہر آ گئی۔ اسے اپنے ہونٹوں کے کناروں پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے ہاتھ پھیرا تو وہاں ایک کیڑا تھا۔ اس کو اپنے منہ کے اندر سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے سیب کو دیکھا تو اسے ابکائی آ گئی۔ سیب سڑا ہوا تھا۔ اس میں کیڑے چل رہے تھے، اس نے منہ میں موجود سیب تھوک دیا اور ہاتھ میں پکڑا سیب دور پھینک دیا۔

اچانک باتھ روم کا دروازہ چرچرا کر کھلنے لگا۔ دروازے پر اس کو سڑا ہوا ہاتھ نظر آیا۔ یہ اسی عورت کا تھا جو باتھ ٹب میں پڑی تھی۔ اس نے باہر کے دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اور آگے دوڑنے لگی۔ تھوڑے فاصلے پر موجود ایک گھر کا دروازہ اس کو کھلا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس گھر کے دروازے سے اندر جھانکا گیٹ کے آگے لان تھا جس میں لگا جھولا ہل رہا تھا اس پر ایک بچی گڑیا لئے بیٹھی تھی، اس نے آگے بڑھ کر اس بچی سے پوچھا۔ ”بیٹا! گھر میں مام، ڈیڈ، ہیں آپ کے؟“ بچی نے ہاتھ سے اندر کی جانب اشارہ کردیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ جولی اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اندر ایک بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر موم بتیاں جل رہی تھیں اور ایک آدمی عورت بیٹھے ہوئے تھے۔

”معاف کیجئے گا! میں بغیر اجازت آپ کے گھر کے اندر داخل ہوگئی۔“ مگر دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ”کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس نے کرسی کھسکاتے ہوئے پوچھا۔ مگر دونوں اب بھی خاموش رہے۔

”آر یو گائز او کے؟“ اس نے آگے بڑھ کر عورت سے پوچھا جو میز پر چائے کا کپ پکڑے بیٹھی تھی۔ اس نے آدمی کی جانب دیکھا، وہ ہاتھ میں اخبار تھامے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے عورت کے شانے پر جیسے ہی ہاتھ رکھا تو وہ ہاتھ کے دباؤ سے ہلی اور ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔ اس کا ہاتھ چائے کے کپ میں ہی رہ گیا۔

وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی تو اس آدمی سے ٹکرا گئی۔ آدمی کرسی سے نیچے گرا اور ریزہ ریزہ ہو کر فرش پر بکھر گیا۔ جولی الٹے قدموں باہر بھاگی۔ ”اوہ گاڈ ہیلپ می!“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

لان میں بچی الٹے قدموں باہر بھاگی۔ ”اوہ گاڈ ہیلپ می!“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

لان میں بچی ابھی تک جھولے میں بیٹھی تھی جولی اس سے پہلے کہ وہ باہر نکل جاتی وہ بچی کود کر اس کے سامنے آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گڑیا کے ساتھ ایک ٹوکری بھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹرک اور ٹریٹ“

جولی نے ڈرتے ڈرتے اپنی جینز کی پاکٹ سے چاکلیٹ نکال کر بچی کی ٹوکری میں ڈال دی۔ بچی نے غرا کر چاکلیٹ زمین پر دے ماری۔ ”آئی وانٹ یور بلڈ!“ اتنا کہہ کر بچی نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا تو اس کی گردن پر خود بخود کٹ لگ گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔

جولی کی نیلی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ چیخیں مارتی گھر سے باہر بھاگ نکلی۔ وہ بھاگتی جارہی تھی اور دھاڑیں مار مار کر رو بھی رہی تھی۔ اوپر سے ہاتھ میں اتنی تکلیف تھی کہ اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ زمین پر گر پڑی وہ اٹھی اور گھٹنوں کے بل زمین پر ٹک کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ہاہاہا!!! دردسے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اندھیرے میں ”پمپکن ہیڈ“ کی آنکھوں اور منہ سے جھلکتی روشنیاں بے حد خوفناک لگ رہی تھیں۔

”اوہ گاڈ!“ اس کا دم نکلنے لگا، وہ اٹھی اور پھر سے دوڑنے لگی۔ سارے گھر ویران پڑے تھے۔ پھر اس کو دور ایک گھر میں روشنی نظر آئی تو اس کے قدم بے ساختہ اس گھر کی جانب بھاگنا شروع کردیا۔ دروازے پر پہنچ کر بے تحاشا دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ کچھ دیر میں اندر سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور اس کے پیچھے سے ایک بوڑھی عورت نکلی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔

”کون ہو تم؟ اور رات کے اس وقت کیا کررہی ہو؟“

”پہلے میں اندر آ جاؤں؟“ اس نے بے چارگی اور التجا بھرے انداز سے پوچھا۔

عورت نے پہلے سوچا پھر بولی۔ ”اچھا آجاؤ!“ اور اس کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

جولی تیر کی طرح اندر گھس گئی۔ عورت نے دروازہ بند کرلیا۔ ”اب بتاؤ کون ہو تم اور اتنی رات میں اکیلی یہاں کیا کررہی ہو؟ کس کے گھر آئی ہو یہاں؟“ عورت نے سوالات کی لائن لگادی۔

”میرا نام جولی ہے، دراصل میری گاڑی خراب ہوگئی ہے، سڑک پر کوئی نہ ملا تو میں مدد کے لئے چلتی چلتی یہاں پہنچ گئی۔ اس نے جان بوجھ کر گزرے واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو وہ سوا تین بجا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی ریسٹ واچ دیکھی وہ بھی سوا تین بجا رہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے یہ گھر نارمل ہے۔“ جولی نے دل میں سوچا۔

”تم بیٹھو! چل چل کر پیر تھک گئے ہوں گے تمہارے۔ ابھی میرا بیٹا آجائے تو“ وہ تمہیں تمہاری منزل پر پہنچاوے گا۔“

جولی کو کچھ اطمینان ہوا وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”یہ تمہارے کاندھے پر کیا ہوا؟“

بوڑھی عورت نے سوال کیا۔ ”......وہ میں گر گئی تھی کوئی نوکیلی چیز پڑی تھی وہ لگ گئی۔“ جولی نے بات بتادی۔

”میں تمہارے لئے دوا لاتی ہوں۔“ عورت نے اس کو ایک مرہم لگانے کے لئے دیا جو اس نے اپنے کاندھے پر لگالیا۔

”تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی؟ کچھ کھایا بھی ہے تم نے یا نہیں؟“ عورت کے سوال پر اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اسے سچ مچ بہت شدید بھوک لگ رہی تھی مگر خوف اس کی بھوک پر حاوی تھا اب خوف میں کمی آئی تو بھوک کا احساس پھر سر اٹھانے لگا۔ ”نہیں رہنے دیں آپ کو زحمت ہوگی، ویسے بھی میں نے آپ کو نیند سے جگا کر پریشان کردیا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں بھئی آج کیسی نیند! آج تو ہیلووین نائٹ ہے ہمارے لئے خاص، تو پھر سونا کیسا؟“ بوڑھی عورت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”ٹھہرو میں تمہارے کھانا گرم کرتی ہوں۔“ اور کمرے سے نکل گئی۔

جولی نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں، گزرنے والا ہر واقعہ فلم کی طرح اس کے دماغ میں چلنے لگا۔ ”وہ سب کیا تھا؟ حقیقت تھی؟ یا میرا وہم تھا؟ یا کسی کا بے ہودہ مذاق؟ کہیں وہ وہی کالر ”نام“ تو نہیں جو مجھے دھمکا رہا تھا، نہیں نہیں! اسے کیا پتہ کہ میں کدھر جاؤں گی؟ کہاں رہتی ہوں؟ یا پھر سب سچ میں ہوا ہے؟ کیا بھوتوں کا وجود ہوتا ہے؟“ اس کی بھنویں سوچتے ہوئے سکڑ رہی تھیں۔ وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھی۔

”کھانا گرم ہوگیا ہے۔“ بوڑھی عورت کی آواز سے جولی نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھی ہوگئی۔ ”آجاؤ اس طرف۔“ عورت کہہ کر اندر کی طرف چل پڑی۔

جولی اس کے پیچھے جانے لگی۔ برابر والے کمرے میں کھانے کی میز تھی۔ جس پر سوپ کا گرم گرم بھاپ اڑاتا پیالہ، پلیٹ میں بھنے ہوئے گوشت کے پارچے، سلاد کی ڈش، جولی سب کچھ دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔ ”میں بے حد معذرت خواہ ہوں میری وجہ سے آپ کو رات کے اس پہر اتنی زحمت اٹھانی پڑ رہی ہے۔“ جولی نے جھینپ کر کہا۔

”باتیں چھوڑو، کھانا کھاؤ، ٹھنڈا ہوجائے گا۔ ہاں اگر ٹھنڈا ہوگیا تو پھر ضرور مجھے دوبارہ گرم کرنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔“ بوڑھی عورت نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ جولی مسکراتی ہوئی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”آپ نہیں لیں گی؟“ جولی نے پوچھا۔

”نہیں میں کھانا کھا چکی ہوں اور کرسی کھینچ کر وہ بھی بیٹھ گئی۔“ جولی نے چمچے میں سوپ لیا اور پی کر اس کو ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔ ”یہ تو بہت ہی

مزیدار ہے۔" اس نے کہا۔ اس کی بات سن کر عورت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اگر جولی اس عورت کے دماغ کو پڑھ سکتی تو وہ چیخیں مارتی بھاگ جاتی۔ وہ عورت دل میں کہہ رہی تھی۔ "مزیدار کیوں نہیں ہوگا۔ آخر انسانی بچے کا سوپ ہے جس کا گوشت بہت نرم اور لذیذ ہوتا ہے۔"

جولی نے جلدی جلدی سوپ ختم کرلیا اور چھری کانٹا اٹھا کر گوشت کے پارچے کو کھانے کے لئے کھاٹ کر منہ میں رکھا اتنا لذیذ گوشت جولی نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ "ڈیلیشش!" جولی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ جولی نے جلدی جلدی تمام گوشت کے پارچے صاف کردیئے۔ چھری کانٹا رکھ کر نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "بلاشبہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ آپ ایک بہترین کک ہیں......"

جولی نے جملہ ادھورا چھوڑا تو بوڑھی عورت بولی۔ "مسز کیتھرین" ہم بھی عجیب ہیں کہ سب باتیں کرلیں اور میں نے اپنا نام نہیں بتایا۔

جولی کا خوف بالکل بھاگ چکا تھا اس نے دل کھول کر مسز کیتھرین کے کھانے کی تعریفیں کیں۔ "ویسے میں نے اتنا سوفٹ اور ذائقہ دار گوشت کبھی نہیں کھایا۔ وہ کس جانور کا گوشت تھا؟" جولی نے سوال کیا۔

"انسان کا گوشت۔" بوڑھی عورت نے کہا تو جولی کو سانپ سونگھ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ہاہا ہا! بوڑھی عورت نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "میں مذاق کررہی ہوں۔" تو جولی بھی ہنسنے لگی۔

"آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ مسز کیتھرین!" جولی کی ہنسی کھوکھلی تھی وہ سچ مچ خوفزدہ ہوگئی تھی۔

"ابھی ڈنر کی ایک چیز باقی ہے وہ یہاں نہیں صوفے پر چل کر سرو کروں گی۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے انجوائے کریں گے۔" مسز کیتھرین بولی اور پھر دونوں واپس صوفے پر آکر بیٹھ گئیں۔ بوڑھی عورت اٹھ کر اندر گئی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بوتل اور گلاس تھے۔ "یہ خاص تمہارے لئے ریڈ وائن" بوڑھی عورت نے گلاس میں ریڈ وائن انڈیلتے ہوئے کہا۔ جولی نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا اور تھینکس کہا۔ پہلا سپ لیتے ہی جولی کو اس کا ذائقہ عجیب سا لگا۔

"آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟" جولی بولی۔

"میرے شوہر نے کافی پہلے دوسری شادی کرلی تھی۔ میں اور میرا بیٹا اکیلے رہتے ہیں۔ میرے بیٹے کا نام "سیم ولسن" ہے۔ سیم ولسن کے نام پر جولی کے ہونٹوں سے لگا گلاس وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اچھا رکو! میں تمہیں اپنی تصویریں دکھاتی ہوں۔" بوڑھی عورت پھر اندر چلی گئی۔

"ضروری تو نہیں کہ یہ وہی سیم ولسن ہو۔" جولی نے اپنی تسلی خود ہی کرلی۔ اتنے میں بوڑھی عورت تصویریں لئے اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ "یہ میرے شوہر کی تصویر ہے۔" دوسری تصویر دیکھ کر جولی کی سٹی گم ہوگئی اور تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرگئی۔

"سیم اگر تم ہمارے مشورے پر عمل کرو تو جولی تم سے ضرور دوستی کرلے گی۔ ہم اس کے دوست ہیں اور اس کی پسند، ناپسند جانتے ہیں۔" سیم جولی کا کلاس فیلو تھا۔ مگر جولی کو جانے کیوں سیم سے چڑ تھی ایسا کوئی موقع جولی ہاتھ سے نہ جانے دیتی جس میں وہ سیم کی بے عزتی کرسکتی ہو جبکہ سیم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح جولی سے دوستی کرلے۔ دوستی تو دور کی بات جولی کو سیم کی موجودگی سے چڑ ہوتی تھی اور اب جولی کے دوست "ہیلووین" پر سیم کو بے وقوف بنا رہے تھے کہ وہ جولی کو ڈرا کر اس کی دوستی پاسکتا ہے کیونکہ جولی کو "ہیلووین" بہت پسند ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ جولی کے نزدیک ہیلووین ایک بھونڈا تہوار ہے اور نہ ہی وہ بھوتوں میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس ہیلووین پر تو سینڈرا بھی اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ جولی نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ دوسری طرف سیم کو جولی کے دوستوں نے الو بنا کر راضی کرلیا تھا۔ جولی اکیلی گھر پر ٹی وی دیکھ رہی تھی مگر اس کا پارہ ہائی ہورہا تھا۔ بچوں نے "ٹرک اور ٹریٹ"

کے لئے اس کا دروازہ بجا بجا کر اس کا دماغ گھما دیا تھا۔ مگر جولی بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی نے اس نے گن کر ہر ایک بچے کو ڈانٹ کر بھگایا تھا۔ اسے کسی ایک بچے پر بھی رحم نہ آیا، مجال ہے جو وہ ایک کینڈی دیتی۔

جولی سینڈوچ کھاتے ہوئے ڈرنک ہونٹوں تک لے جارہی تھی کہ ایک بار پھر ڈور بیل بجی جولی نے گلاس میز پر پٹخا اور پیر زور زور سے مارتی ہوئی گیٹ پر گئی اور زور سے گیٹ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی تیز ہوا کے جھونکے سے اس کے سنہری بال اڑ کر اس کے چہرے پر بکھرے گئے۔ اس نے بال سمیٹے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور صوفے پر دھم سے گرگئی اور پلیٹ سے فرنچ فرائز اٹھا کر کھانے لگی۔ ٹی وی پر ہر جگہ ہیلووین تھیم چل رہی تھی۔

جولی اٹھی اور موؤی پلیئر میں اپنی پسند کی موؤی لگا کر واپس آکر بیٹھ گئی۔ موؤی شروع ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ پھر ڈور بیل بجی۔ جولی نے بیل کی آواز کانوں پر سے اڑادی۔ تھوڑی دیر میں بیل بجنی بند ہوگئی۔ جولی کا موڈ بھی آف ہوگیا تھا۔ اس نے ٹی وی آف کردیا۔ برتن کچن میں رکھ کر وہ بستر میں گھس گئی۔ سامنے گھڑی میں ساڑھے بارہ بجے رہے تھے۔ جولی نے منہ تکیے میں دے کر آنکھیں موند لیں۔

"ٹھک! ٹھک!" کی آواز جولی کو اپنے سر پر پڑے ہتھوڑے کی آواز معلوم ہوئی۔ جولی نے آنکھ کھولی تو آواز رک گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور تکیے میں منہ دے دیا۔ "ٹھک! ٹھک! ٹھک!" آواز پھر آئی۔ تو اس نے آواز پر غور کیا تو آواز چھت میں سے آرہی تھی۔ اوپر بھی ایک کمرہ تھا۔ جس میں فالتو سامان رکھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر آنکھ بند کرتی۔ "ٹھک! ٹھک! ٹھک!" اب وہ غراتی ہوئی بستر سے نکلی اور پیر پٹختی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اوپر پہنچ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ اس نے دیوار پر لگے سوئچ کو ٹٹولا اور لائٹ جلا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نظر کمرے میں لگی شیشے کی کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی کے باہر کوئی ہیلووین کی مناسبت سے "پمپکن ہیڈ" کا گیٹ اپ کیا ہوا تھا۔ اور وہ کھڑکی کو سلائیڈ کرکے اوپر اٹھانے کی کوشش کررہا تھا مگر کھڑکی آدھی کھل کر اٹکی ہوئی تھی اور اسے اوپر اٹھانے کی کوشش سے "ٹھک! ٹھک!" کی آواز پیدا ہورہی تھی۔ پھر کھڑکی ایک جھٹکے سے کھل گئی اور وہ پمپکن ہیڈ اندر داخل ہوگیا۔

اس کا رخ جولی کی طرف ہی تھا۔ جولی پہلے ہی بچوں کی وجہ سے غصے میں تھی اس نے چلا کر کہا۔ "ہے یو! جو کوئی بھی ہو یہاں سے فوراً دفع ہوجاؤ، مجھے ایسے بے ہودہ مذاق بالکل پسند نہیں ہیں۔"

مگر اس شخص نے جولی کی بات سنی ان سنی کردی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ "دیکھو میں تمہیں وارن کررہی ہوں میں! میں!" اتنا کہہ کر جولی نے بیس بال کا بیٹ اٹھایا جو سائیڈ میں رکھا ہوا تھا۔ "میں اس بیٹ سے تمہارا یہ کدو نما سر توڑ دوں گی۔" جولی نے خبردار کیا مگر اس شخص کے قدم نہ رکے اور وہ بالکل جولی کے قریب پہنچنے لگا تھا تو اس نے بیٹ بلند کیا اور ایک وار زور سے اس شخص کے کاندھے پر کردیا۔ وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔ وہ پھر کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھوں سے جولی کو رکنے کے لئے کہا اور اپنے ہاتھ آگے کرے۔ مگر جولی سمجھی کہ وہ اسے ڈرانے کی کوشش کررہا تھا۔

جولی نے غلط فہمی میں ایک بار بیٹ پھر فضا میں بلند کیا اور بھرپور طاقت سے بیٹ اس شخص کے سر پر دے مارا۔ سر پر پہنا ہوا پمپکن پھٹ کر زمین پر بکھر گیا اور ساتھ وہ شخص لہرا کر زمین بوس ہوگیا۔ اس کے سر کے آس پاس خون کی لکیریں نمودار ہونے لگیں تو جولی کے ہاتھ سے بیٹ چھوٹ کر گرگیا۔ اس نے قریب جا کر اس شخص کو دیکھا وہ "سیم ولسن" تھا۔ جولی کا کلاس فیلو۔ "او گاڈ! او نو! یہ میں نے کیا کردیا؟" جولی نے بالوں میں انگلیاں ڈال کر کہا۔

وہ سیم کے پاس آئی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا مگر سانس آرہی تھی۔ جولی نے بڑی مشکل سے سیم کو گھسیٹا اور پھر نیچے لا کر اس کو گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گئی۔ اسپتال میں جولی نے اپنا نام بھی غلط بتایا اور یہ

کہا کہ وہ راستے میں جارہی تھی تو یہ نوجوان سڑک پر پڑا ملا اور اسے وہاں چھوڑ کر واپس آ گئی۔ گھر آ کر اس نے وہ بیٹ جلادیا اور سارے خون کے دھبے صاف کر دیئے۔

اگلے دن اس کو نیوز ملی کہ سیم کی ایک حادثے میں ڈیتھ ہو گئی ہے۔ اسپتال پہنچ جانے کے باوجود سر کی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ بچ نہ سکا۔ کالج میں سب سیم کے مرنے پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ ''بے چارہ سیم! جانتی ہو جولی؟ وہ بے چارہ ہمارے مذاق تک میں آ گیا تھا۔ ہیلووین نائٹ پر وہ صرف اس وجہ سے ''پمپکن ہیڈ'' بننا چاہتا تھا کہ ہم نے اسے بیوقوف بنایا تھا کہ تمہیں پمپکن ہیڈ بہت پسند ہے اور تم خوش ہو کر اس کو اپنے فرینڈز کے گروپ میں شامل کرلو گی۔ مگر افسوس اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔''

''جولی کو دل ہی دل میں اپنے کیئے پر افسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ بولتی بھی تو کیا اور اگر بولتی تو پھنس جاتی۔ سیم کی ماں کا دنیا میں اپنے بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ بے چاری اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہہ نہ سکی اور اس نے گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کرلی۔ کچھ دن یہ خبر سب کے لئے ہاٹ ٹاپک بنی رہی مگر پھر وقت کے ساتھ اس پر دھول جمنے لگی اور لوگ کیا خود جولی بھی اس بات کو بھول گئی۔

''تمہیں کیسی لگی؟'' بوڑھی عورت کی آواز پر جولی ماضی سے نکل آئی۔ ''کیا چیز؟'' جولی نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ریڈ وائن۔'' بوڑھی عورت بولی۔

''اچھی۔'' جولی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں پسند تو ضرور آئے گی آخر خون تو تمہارے منہ لگ ہی چکا ہے۔'' بوڑھی عورت کا کہنا تھا کہ جولی نے اپنے گلاس کی طرف دیکھا تو وہ خون سے بھرا ہوا تھا جولی کو ابکائی آئی اور اس نے گلاس فرش پر پھینک دیا۔

''کتنی بے رحمی سے تم نے میرے بیٹے کو مارا تھا! ایسا کیا کیا تھا سیم نے؟'' بوڑھی عورت کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح دہکنے لگیں اور...... اور اس کا رنگ سفید برف کی مانند ہو گیا۔

جولی ڈر کر پیچھے کھسکنے لگی۔ ''وہ...... وہ! ایک حادثہ تھا۔ میں نے اسے بھگانے کے لئے بیٹ مارا تھا۔'' جولی نے لرزتے ہوئے کہا۔

''بکواس کرتی ہو تم!'' بوڑھی عورت دھاڑی۔ تو جولی صوفے سے نیچے گر پڑی اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

''تم نے قتل کیا تھا میرے سیم کا۔'' بوڑھی عورت بولی۔

دھپ! دھپ! دھپ! کرتا ہوا کوئی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جولی نے آواز کی سمت گردن گھما کر اوپر منہ اٹھایا تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ''پمپکن ہیڈ یعنی سیم'' تھا، اس کے ہاتھ میں ایک بیس بال بیٹ تھا۔

جولی لڑکھڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''سیم مجھے معاف کر دو!'' اور رونے لگی۔

وہ پمپکن ہیڈ اس کے قریب پہنچ کر لحہ بھر کے لئے سر جھکا کر کھڑا ہوا اور پھر اچانک اپنا بیٹ والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے جولی پر وار کر دیا۔ جولی کی قسمت تھی کہ وہ وقت پر ایک طرف ہو گئی۔ ورنہ اس کے سر کے پرخچے اڑ جاتے۔ جولی مڑی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور جدھر سے آئی تھی اسی طرف دوڑنے لگی بھاگتے بھاگتے وہ سارے گھر پھر اس کے سامنے آرہے تھے۔ مگر وہ پوری طاقت سے بھاگتی رہی اچانک جولی کے پیروں میں ایک پتھر آ گیا اور وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر جا گری۔ اس کو اپنی زبان پر نمکین ذائقہ محسوس ہوا، اس نے اپنا منہ ٹٹولا تو اس کو اپنے ہونٹوں پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔

اچانک جولی کو اپنی پنڈلی میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو اس کی پنڈلی مسز کیتھرین کی انگلیوں کی گرفت میں تھی جو پنڈلی میں پیوست تھیں۔

جولی نے دوسرے پیر سے ایک زوردار لات اس کے منہ پر رسید کی۔ وہ بوڑھی عورت دور جا گری۔ جولی لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ تو پیچھے سے کسی نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے دبوچ لیا۔ وہ اسے اپنے نوکیلے ناخنوں سے جولی کے پیٹ اور سینے کو نوچنے لگا۔ جہاں جہاں اس کی انگلیاں پیوست ہوتیں وہ وہیں سے گوشت ادھیڑ دیتا۔

جولی ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ خود کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا اور پھر ایک دفعہ اور اس کے پیروں سے کچھ ٹکرایا اور وہ پمپکن ہیڈ سمیت زمین پر جا پڑی۔ پمپکن ہیڈ کی گرفت ڈھیلی پڑی تو جولی نے لحہ نہ لگایا اور گرتی پڑتی پھر بھاگنے لگی۔

وہ دوبارہ انہی جھاڑیوں والے راستے پر بھاگ رہی تھی۔ اس کی ہمت بالکل جواب دے رہی تھی اور اس کی رفتار مدھم ہوتی جارہی تھی۔ وہ کسی بھی لحہ گر کر بے ہوش ہو جاتی۔

اچانک کسی نے اس کی کمر میں پیچھے سے نوکیلی چیز گھسیڑ دی۔

''آہ! کی آواز کے ساتھ جولی زمین پر گر گئی۔ اس میں اب اٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ اسے اپنی موت سر پر نظر آرہی تھی۔ پھر کسی نے اس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا۔ تو اس کو اب درد کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پوری طرح سن ہو چکی تھی۔

مسز کیتھرین نے جولی کے سنہری بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ پھر اس کی گرفت اور سخت ہوئی تو جولی کا سر اور پیچھے کھنچ گیا اور اس کا چہرہ آسمان کی طرف ہو گیا۔

''سیم بیٹا! کاٹ دے اس کی گردن۔''

جولی کو آخری آواز اس پمپکن ہیڈ کے شیطانی قہقہے کی آئی۔

اچانک جولی کی آنکھیں سورج کی کرنوں سے چندھیا گئیں اور ان دونوں ماں بیٹے کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ جولی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی تھی۔

جولی کے رات بھر غائب ہونے پر اگلی صبح سینڈرا نے پولیس کو انفارم کیا اور ان کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن سے واپس جانے والے راستے پر پھر گئی، وہاں سینڈرا کی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی مگر اس میں جولی موجود نہیں تھی۔ پولیس نے سامنے دیکھا پھر اسی راستے پر ان کی نگاہ پڑی تو وہ سب اس جانب چل پڑے کچھ دور جا کر انہیں جولی زمین پر زخموں سے چور بے ہوش پڑی مل گئی۔ سینڈرا نے جلدی سے جولی کو دیکھا پھر پولیس نے ایمبولینس کال کر کے جولی کو اسپتال پہنچایا۔ جولی کی حالت بہت خراب تھی۔ دو دن میں وہ بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ مگر پولیس کی بات سن کر جولی شاک رہ گئی۔ آفیسر نے اسے بتایا ''اس جگہ کی پوری انکوائری کر لی گئی ہے۔ وہاں کوئی مکان نہیں ہے بلکہ وہاں ایک بہت بڑا قبرستان ہے جو آج سے نہیں سالوں سے موجود ہے۔ میم یا تو آپ جگہ غلط بتارہی ہیں یا پھر آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا تو نہیں کہ کسی نے آپ کو لوٹنے کی کوشش کی ہو اور آپ ڈر کر نہیں بتارہی ہیں۔''

''تو آپ کا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' جولی کو غصہ آ گیا۔ سینڈرا نے بات کو سنبھالتے ہوئے آفیسر کو جانے کے لئے کہہ دیا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ جولی بھوتوں پر یقین نہیں کرتی اور اگر وہ یہ کہہ رہی ہے تو اس میں ضرور سچائی ہو گی۔ ''جولی تو آرام کر میں باہر آفیسر سے جا کر بات کرتی ہوں۔'' اور باہر نکل گئی۔

جولی نے ٹھنڈی سانس لی۔ اسے وہ تمام واقعات اچھی طرح یاد تھے اور اس کے زخم اس بات کا ثبوت تھے کہ اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا بلکہ وہ سب حقیقت تھی۔

اب جولی کی رائے بھوتوں، چڑیلوں، روحوں، ویمپائر اور اس طرح کی چیزوں کے بارے میں بدل گئی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ ٹھیک ہونے کے بعد وہ اپنے شو میں اپنے سب کالرز سے اس ''ہیلووین'' کے لئے معافی مانگے گی۔ اسے اپنے کالر تام کے الفاظ بھی یاد تھے۔ ''ایسا نہ ہو کہ آج آپ نے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ کل آپ کو اسی مذاق کی قیمت چکانی پڑے گی۔''

جولی نے اپنے گناہ کا اعتراف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:19

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

ان میں سے ایک نے کہا۔

”آپ کا نام......؟“

”نشاد انش!......“

”تعلق کہاں سے ہے؟“ میں نے اپنے ملک کا نام بتایا۔

”مصر میں کب داخل ہوئیں؟“

”تاریخ یاد نہیں۔ مارشل نامی جہاز پر سفر کر رہی تھی جو سمندری طوفان کا شکار ہونے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔“

”آپ کو واپس اپنے وطن جانا تھا لیکن آپ ہوٹل سے فرار ہوگئیں۔“

”مجھے ہوٹل سے اغوا کیا گیا تھا۔“

”کس نے اغوا کیا تھا؟“

”وہ جو مجھے امیر غیری کے قتل میں ملوث کرنا چاہتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں میرا ساتھی قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی میرے دشمن ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کوئی گہری سازش ہے جس میں ایک مہرے کی حیثیت سے مجھے استعمال کیا گیا ہے۔“

”اس سازش کی تفصیل بتایئے۔“

”بہتر ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر میں نے تھوڑی سی ردو بدل کے ساتھ جس میں صرف وہ احمقانہ کہانی چھپائی گئی تھی جو میری ذات سے منسوب تھی۔ انہیں سب کچھ بتا دیا۔ آخر میں احسان کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے میں نے کہا۔

”یہ شخص براہ راست امیر غیری کے قتل میں ملوث ہے بلکہ ممکن ہے اس نے انہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہو۔“

”اور آپ بے قصور ہیں۔“ کمشنر نے کہا اور ہنس پڑا۔ ”دوسرے آدمی نے کہا۔

”یہ معمولی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ اس نے بے شک ایک کمزور کہانی سنائی ہے۔ جس میں جگہ جگہ سقم ہیں۔ اس کے باوجود اس نے بڑی احتیاط سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ لڑکی آخری سوال کا جواب دو۔ ایک اور شخص تمہارے ساتھ فرار ہوا ہے۔ وہ تمہارا ہم وطن ہے اور اس کا نام عسکری ہے۔ وہ کہاں ہے؟“

”ایسی کوئی بات مجھے نہیں معلوم؟“

”وہ تمہارا ساتھی نہیں ہے؟“

”میں نے کہا نا ایسے کسی شخص کے بارے میں

مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ویسے کیا آپ بین الاقوامی اصول کے مطابق مجھے میرے ملک کے سفارت خانے سے رابطے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"سوری ابھی نہیں۔ ہمارے ملک کی ایک اہم شخصیت کے قتل کی مجرم قرار پائی گئی ہو تم۔ ہم ابھی اپنی تفتیش میں کوئی کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔ یہ تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہی تمہاری اس خواہش کا جائزہ لیا جائے گا......"

"ٹھیک ہے۔ جیسا آپ لوگ پسند کریں......!"

مجھے قاہرہ جیل بھجوادیا گیا۔ شاید یہ خصوصی جیل تھی کیونکہ بہت بہتر تھی۔ ورنہ اپنے وطن میں جیلوں کی کہانیاں سنی تھیں میں نے، بڑا سا ایک کمرہ تھا جس میں تین مسہریاں لگی ہوئی تھیں ایک میز اور کرسیاں بھی تھیں۔ ملحق باتھ بھی تھا جو صاف ستھرا تھا۔ تین مسہریوں کا مقصد اس وقت سمجھ میں آیا جب عدنان ثنائی اور وسکن ڈیزل بھی وہیں پہنچادیئے گئے۔ میں نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ناجائز ہے۔ میں ان دو ذلیل انسانوں کے ساتھ اس کمرے میں نہیں رہ سکتی۔" لیکن میرا احتجاج مسترد کردیا گیا اور انہیں یہاں لانے والے انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ دونوں کی حالت کافی خراب نظر آرہی تھی۔ میں انہیں دیکھ کر ہنس پڑی۔ مگر انہیں بے غیرتی سے مسکراتے دیکھ کر میرا پارہ چڑھ گیا میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"عدنان ثنائی اور احمر جنیدی تو کبھی میرے لئے محترم نہیں رہے وسکن ڈیزل، افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ عرصہ میں نے تمہارا احترام کیا ہے، تمہیں کچھ کہتے ہوئے مجھے اب بھی افسوس ہوتا ہے۔"

"تم نے میرا احترام کیوں ترک کردیا؟" وسکن ڈیزل نے پوچھا۔

"تمہارا خود غرض چہرہ مجھے جزیرے پر نظر آ گیا تھا۔ تم کسی بھی طرح دوسروں سے مختلف نہ ثابت ہوئے۔"

"وہاں اس جزیرے پر کوئی کسی کے لئے کیا کرسکتا تھا۔"

"جسے کچھ کرنا تھا اس نے کیا وسکن اس بات کو جانے دو۔ تم ان جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ جو ابتدا سے مجھے نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔"

"یہ بھی تمہاری ناسمجھی ہے بے بی اور ابھی تمہیں کوئی سمجھا نہیں سکتا۔ اس میں تمہارا قصور نہیں ہے، رہی اس کی بات جس نے تمہارے لئے کچھ کیا تو وہ احمق ان گہرائیوں کو کیا جانے ہمارے لئے تم نے جو کچھ کیا ہے اور جواب ہمارے ساتھ ہو رہا ہے تمہیں شاید سن کر خوشی ہوگی کہ یہی ہمارے لئے بہتر ہے۔"

"یہ سب کچھ تمہارے لئے بہتر ہے؟"

"ہاں بے بی۔ اس طرح تمہاری قربت ہمیں حاصل ہے۔"

"تب میں کوشش کروں گی کہ میرے ساتھ تمہیں بھی سزائے موت ہو، یقین کرو وسکن تمہاری اس بات نے مجھے ایک راستہ دکھایا ہے؟" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"کیا راستہ؟"

"میں تو زندگی سے بیزار ہوں، کوئی دلچسپی نہیں ہے مجھے اس زندگی سے، میں بخوشی موت اپنالوں گی تاکہ تمہیں بھی میرے ساتھ موت ملے۔ مزا چکھو تم اپنی ان سازشوں کا میں امیر غیری کے قتل کا اعتراف کرلوں گی اور یہی کہوں گی کہ یہ سازش تم دونوں نے مل کر کی تھی اور مجھے اپنا آلہ کار بنایا تھا میں نے یہ سب تمہارے ایماء پر کیا تھا۔ کیا سمجھے وسکن ڈیزل۔"

"ہاں اس طرح تم بے شک ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہو۔ لیکن ابھی بے بی تم نوعمر ہو، شوق کے نشے کو نہیں سمجھتیں۔ تاریخ مصر ہماری زندگی ہے۔ یہ شوق ہے ہمارا، اسے جاننے کی کاوشیں اگر موت سے ہمکنار کردیں تب بھی کیا حرج ہے لیکن یہ خوشخبری سن لو کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ان میں سے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کرسکے گا کیونکہ تم تاریخ کی امانت ہو اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو تاریخ مسخ ہوجائے گی۔ ایسا کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ نادیدہ ہوائیں تمہاری نگراں اور محافظ ہیں۔ تمہاری زندگی تمہاری آبرو اس وقت تک محفوظ ہے جب تک تاریخ اپنا فیصلہ نہ سنادے۔ ہمارے بارے میں جو دل چاہے کرو تمہاری مرضی ہے تمہیں بتادیا تھا ہم نے کہ صرف تمہیں محفوظ رکھنے کے لئے ہم نے تمہیں ایک مضبوط شخص تک پہنچایا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ اپنے ضبط کا شکار ہوکر تمہیں ہر طرح تحفظ دے گا یہ نہیں معلوم تھا کہ خود اس کے خلاف کوئی سازش ہوگی اور وہ موت سے ہمکنار ہوجائے گا۔ بات بے شک اس وقت الجھ گئی ہے۔ لیکن سلجھ جائے گی۔ یہ تمہارا معاملہ ہی نہیں ہے تم تو صرف لمحات کا سفر کررہی ہو، وہ وقت پورا کررہی ہو جو تمہیں تاریخ کی عدالت تک لے جائے گا یہ بھی بتا چکا ہوں تمہیں کہ اگر تم اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرتیں اپنے شہر میں اپنی پسند کے مطابق رہتیں تب بھی وقت پورا ہونے پر تمہیں طلب کرلیا جاتا۔ نہ جانے اس وقت راستے کون سے ہوتے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔ تم نے میرا دماغ خراب کرکے رکھ دیا ہے۔ تم سب پاگل ہو، دیوانے ہو۔"

"نہیں بے بی ہم دیوانے ہیں ہارون دانش تو دیوانہ نہیں تھا۔"

"مت لو میرے سامنے یہ نام نفرت ہے مجھے اس نام سے۔"

"تم ذہنی بحران کا شکار ہو، اپنی مسہری پر آرام کرو۔ ہم تمہیں بالکل پریشان نہیں کریں گے۔ اور سنو جو دل چاہے کرنا ہمیں اعتراض نہ ہوگا۔ ہم تمہاری جیسی تقدیر نہیں رکھتے پھر بھی بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ بہت سے نئے باب کھلے ہیں یہاں آ کر، ہماری کاوشوں کا صلہ مل چکا ہے ہمیں۔ زندگی کہیں نہ کہیں تو ختم ہونی ہی ہے ہم تشنہ نہیں ہیں۔"

میں خاموش ہوکر انہیں دیکھتی رہی۔ شوق واقعی آدمی کو دیوانہ کردیتا ہے۔ ان لوگوں کا اور کوئی مقصد نہیں تھا اس کے سوا کہ وہ مصر کی قدیم تاریخ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں۔ اس کے لئے زندگی وقف کردی تھی۔ انہوں نے......

دونوں بوڑھے واقعی میرے لئے باعث تکلیف نہ ثابت ہوئے، بلکہ ان کی موجودگی سے ذہن بٹ گیا تھا۔ ان سے بات چیت تو کرسکتی تھی۔ تقریباً چھتیس گھنٹے گزر چکے تھے اور کسی نے ہم لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وسکن ڈیزل نے کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے ہاں ہوں کرکے ٹال دیا تھا۔ اس وقت سخت بیزاری طاری تھی اور میں مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

"چہل قدمی کرنے نکل جاؤ نشا ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔" عدنان ثنائی نے کہا۔

"نہیں میرا دل نہیں چاہتا۔" میں نے جواب دیا۔ جیل میں شام کو پانچ بجے سے چھ بجے تک زیر تفتیش ملزموں کو یہ رعایت دی جاتی تھی۔ مجھ سے بھی کہا گیا تھا پچھلے دن، لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔

"تم نے بلاوجہ اپنی زبان بند رکھی ہے۔ باتیں کرو دل بہلتا ہے۔" وسکن ڈیزل نے کہا۔

"آپ لوگ بے حد خود غرض ہیں کیا باتیں کروں آپ سے؟"

"صرف ان لمحات کو لے کر بیٹھ گئی ہو تم جو جزیرے پر گزرے تھے۔ اگر ٹھنڈے دل سے غور کرو تو کسی کا قصور نہیں تھا اس لڑکی کو لے لو جو تمہارے ساتھ آئی تھی وہ بھی تم سے دور ہوگئی تھی۔"

"اس سے زیادہ مجھے آپ سے شکوہ ہے انکل ڈیزل، میں طویل فاصلہ طے کرکے آپ کے پاس آئی تھی۔"

"مجھے اعتراف ہے لیکن جزیرے پر سب ایک دوسرے سے بددل ہوگئے تھے۔ وہ وقت گزر گیا؟"

"ہارون دانش نے آپ سے کیا کیا چاہا تھا آپ اب بھی مجھے نہیں بتائیں گے۔"

"اگر تمہارے باپ کے بارے میں کوئی سخت جملہ استعمال کرجاؤں تو برا تو نہیں مانو گی؟"

"بالکل نہیں مجھے ان سے کیا ملا ہے؟"

''تو پھر سنو! اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ مصر پر ریسرچ کرنے والوں میں وہ سرفہرست ہے۔ روئے زمین پر اس سے اعلیٰ محقق کوئی نہیں ہے۔ اسے نہ صرف اس تحقیق پر عبور حاصل تھا بلکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسے دور فراعنہ کے کچھ پراسرار کرداروں کی ہم نشینی بھی حاصل ہوگئی تھی اور اس کا ان سے رابطہ تھا۔ اس کی لکھی ہوئی کتابوں میں ایسے اشارے ملتے ہیں لیکن وہ صحیح معنوں میں خودغرض ہے۔ اس نے اپنی قیمتی معلومات عام نہیں کیں اور انہیں اپنے پاس محفوظ رکھا حالانکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اگر ماہر فنون اپنا علم منتقل نہ کرتے تو اب تک سارے علوم فنا ہوچکے ہوتے ہارون دانش نے انتہائی قیمتی معلومات پوشیدہ رکھیں۔ پھر شاید اپنے علم کے سہارے وہ دور قدیم میں پہنچ گیا وہاں وہ کسی مشکل کا شکار ہوگیا۔ اس کے بعد کی کہانی نہیں ملتی۔''

''پھر کیا ہوا انکل؟''

''وہ روپوش ہوگیا لیکن اس کے باوجود اس کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں تازہ ترین تحقیق کے ساتھ کوئی اسے نہ پاسکا۔ لیکن کچھ نے کہا کہ وہ نادیدہ شکل میں ہے بہت لوگوں نے اسے تلاش کیا مگر نہ پاسکے۔''

''آپ کو انہوں نے کیا لکھا تھا؟''

''نہ صرف لکھا تھا بے بی بلکہ الجزائر میں اس نے مجھ سے ملاقات بھی کی تھی اور میرا دعویٰ ہے کہ مارشل پر بھی وہ ہمارے ساتھ تھا اور جزیرے پر بھی اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہاں مصر میں بھی وہ موجود ہے بلکہ اس کی نگراں سلانوبیہ بھی۔''

مجھے جزیرے کے وہ لمحات یاد آگئے جب میں نے سلانوبیہ کو دیکھا تھا اور روشاق وہاں پہنچ گیا۔ میں نے ان دونوں کو وہ سب کچھ بتایا اور وہ سخت ہیجان کا شکار ہوگئے۔

''آہ یہ تصدیق ہے عدنان شائی تم سن رہے ہو نا گویا ہمارے راستے مبہم نہیں ہیں۔ ہم جو کچھ کررہے ہیں وہ درست ہیں۔''

''آپ کیا کررہے ہیں انکل؟''

''احمق نہیں ہیں ہم، ہمارا کام بھی حسب توفیق جاری رہا ہے اور جاری ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سب کچھ معمول کے مطابق ہورہا ہے۔ اس کے اشارے سمجھ میں آرہے ہیں۔ اصل میں اس نے مجھے لکھا تھا کہ وہ ایک تاریخی المیے کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ تاریخ کا قیدی بن چکا ہے اور ایک بچی کا بھی، یہ بچی ایک تاریخی تنازع کی حیثیت رکھتی ہے اور سورج کے حساب سے جب وہ ایک مخصوص عمر پائے گی تب ہی اس مشکل کا تصفیہ ہوسکے گا اس نے لکھا تھا کہ وہ وقت قریب ہے کہ اگر ہم اس کے ساتھ ہوئے تو ہمیں بھی زمانہ قدیم کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے گی اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنے نادیدہ بدن کو بھی روپوش رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کا ایک خاص دشمن اسے نہ پاسکے وہ اسے اس عالم میں بھی حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی تاریخ کا ایک پراسرار راز ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ سلانوبیہ اس کی نگرانی کررہی ہے اور اگر میں اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو اس کا بہتر صلہ پاؤں گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کی ممیاں اناطور کے پاس پہنچادی جائیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آگے کیا کیا جاسکتا ہے۔ میں نے سب کچھ اس کی ہدایت کے مطابق ہی کیا تھا کاش وہ تھوڑی سی وضاحت اور کردیتا۔ آہ کاش۔ کاش۔''

''مگر وہ ممیاں تو صرف کپڑے کا ڈھیر تھیں انکل۔''

''وہی ان کے نادیدہ اجسام کا گھر تھیں۔''

''وہ مارشل سے غائب ہوگئیں۔''

''بدبخت روشاق کی وجہ سے روشاق نے انہیں تلاش کرلیا تھا۔''

روشاق کا نام سن کر مجھے روشاق کی کہانی یاد آگئی۔ لیکن اسی وقت یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے خاموش کردیا ہے۔

''چالیس سال قبل کی ایک کتاب میں ایک وادی کا تذکرہ ملا ہے ہمیں یہ کتاب یمن کی ایک عظیم محقق سیرا یمنی کی کتاب ہے۔ سیرا یمنی بھی پراسرار طور پر اسی طرح روپوش ہوگئی تھی۔ پھر اس کا نشان نہیں ملا۔ لیکن اس کی تحقیق میں ایک ایسی وادی کا تذکرہ تھا جس میں اڑنے

والے ریت کے بگولوں میں ماضی کے دروازے کھلتے ہیں کوئی ان دروازوں کو پالے تو ماضی میں جاسکتا ہے۔''

''کیا؟'' میں اچھل پڑی اور وہ دونوں چونکے ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ مجھے امیر غیری کی سنائی ہوئی کہانی یاد آگئی تھی۔

''کیوں بے بی تم اس بات پر کیوں چونک پڑیں؟''

''اس وادی کا کیا نام ہے؟''

''نہیں معلوم بے بی۔''

''انکل کیا واقعی یہ روایت درست ہے کہ وادی ارمناس کے بگولوں میں ماضی کے دروازے کھلتے ہیں۔''

''وادی ارمناس؟'' دونوں کے منہ سے بیک وقت سرسراتی آوازیں نکلیں۔

''ہاں اس کے بارے میں امیر غیری نے مجھے بتایا تھا ایسے ہی ایک دروازے سے اندر داخل ہوکر اسے اپنے زمانوخته ہونے کا پتہ چلا تھا۔ میں نے غیری کی داستان انہیں سنائی۔''

''وادی ارمناس...... ارے یہ وادی تو مصر میں موجود ہے۔''

''یہ روایت مصر میں تسلیم کی جاتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ کچھ قدامت پرست بزرگ یہ کہتے ہوں۔ جدید مصر میں اس طرح کا کوئی تذکرہ نہیں۔ مگر امیر غیری وہ تو خبط الحواس تھا۔ جو کچھ وہ کہتا تھا وہ کم از کم درست نہیں تھا۔ قدیم مصری عقائد میں حیات بعد الموت کا تصور ضرور ملتا ہے لیکن یہ ہندو عقیدے آواگون سے بہت مختلف ہے اور پھر اگر یہ سب کچھ حقیقی ہوتا تو پھر اس کی موت کیا معنی رکھتی ہے؟ یہ تو مقدر ہوتا اسے قدیم تاریخ کی صحت کے لئے جینا پڑتا ہے۔ ہم نے آج تک وادی ارمناس کی روایت کے بارے میں نہیں سنا۔''

''ہوسکتا ہے اس کے قدیم دشمنوں نے اسے دوبارہ جینے دیا ہو۔''

''مگر وہ تمہیں ظہورہ کہتا تھا۔''

''میں اسے بالکل نہیں مانتی مگر ایک ایسی انوکھی بات ضرور ہوئی جس پر میں آج بھی حیران ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''اس نے جبل العمامہ میں ایک مصنوعی معبد بنایا تھا اور میں اس معبد میں جاکر قدیم زبان بولنے اور سمجھنے لگی تھی جبکہ زندگی میں کبھی اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ میرے والد کی خواب گاہ میں بہت سی ایسی کتابیں تھیں جو قدیم مصری زبان کے حوالے سے مزین تھیں۔ لیکن کبھی ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ میں اس معبد میں جاکر اچانک یہ زبان سیکھ گئی یہ کیسے ہوا وسکن ڈیزل؟''

''وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتے رہے۔ بہت دیر تک خاموش رہے پھر عدنان شائی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''کیا امیر غیری بھی قدیم زبان سمجھتا اور بولتا تھا۔''

''ہاں۔''

''اس نے بتایا کہ یہ قدیم زبان اسے کیسے آئی؟''

''اس نے باقاعدہ اسے استادوں سے سیکھا تھا۔''

''تمہیں یاد نہیں کہ تم نے کبھی اس کے لئے کوشش کی ہو۔''

''تصور بھی نہیں کیا میں نے۔''

''اوہ کتنے انوکھے انکشاف کئے ہیں تم نے، کیا تم اب بھی وہ زبان بول سکتی ہو؟''

''بخوبی، امیر غیری بے شک خبط الحواس تھا لیکن اس کی کچھ باتیں بہت پراسرار تھیں اور میں نے اپنے اندر پیدا ہوجانے والی اس صفت پر سب سے زیادہ حیران ہوں۔'' میں نے قدیم مصری زبان میں کہا اور دونوں بوڑھے دیوانے ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد وسکن ڈیزل بولا۔

''آج بھی سرزمین مصر اتنی ہی پراسرار ہے جتنی روز اول تھی، یہاں کیا کیا ہے کون جانے۔''

"نشا دانش کے سلسلے میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق بہرحال مصر کی پراسرار تاریخ سے ہے۔ اور اسے مصر قدیم کے ایک مقدمے میں پیش ہونا ہے، ممکن ہے یہ پراسرار ہواؤں کی پیش قدمی ہو۔" عدنان شائی نے کہا۔

"ہاں شاید!" اس کے بعد دونوں بوڑھے اونگھنے لگے۔ میں اپنا دل کچھ ہلکا ہلکا محسوس کررہی تھی۔ بے شک وہ دونوں اب بھی میرے لئے قابل نفرت تھے۔ میری انتہا پسند فطرت اب کسی طور انہیں مخلصانہ طور پر قبول نہیں کرسکتی تھی۔ حالانکہ اگر فطرت انسان کے مطابق غور کیا جاتا تو وسکن ڈیزل کا کہنا بہت درست تھا۔ مسٹر صوفیہ نے بھی وہی کیا جو وسکن ڈیزل نے کیا تھا۔ وہاں آئی لینڈ پر ہر شخص نے بے بسی کا شکار ہوگیا تھا۔ اس بے بسی نے اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔

کون کس کی خبر گیری کرتا لیکن یہ تصور کرتے ہوئے ایک بار پھر عسکری کی صورت نگاہوں میں آگئی۔ وہ تو روز اول سے اس وقت سے جب مارشل پر سفر کا آغاز ہوا تھا۔ میرے لئے ہی مصروف رہا تھا۔ کیا کچھ نہ کیا تھا میں نے اس کے ساتھ، ہر طرح سے توہین کی تھی اس کی، اور بعد میں ایک حد تک یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ اب اس کا تعلق براہ راست روشاق سے نہیں رہا۔ لیکن بس یہ میری ضدی فطرت ہی تھی جس کی بنا پر میں نے اسے آج تک کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ وہاں آئی لینڈ پر بھی اس نے وہ تمام فرائض پورے کئے جو کوئی بے پناہ چاہنے والا کرسکتا ہے۔ بعض اوقات اس کے لئے دل کے گوشے اتنے نرم ہوجاتے تھے کہ مجھے خوف محسوس ہونے لگتا تھا وہ مسلسل میرے لئے سرگرداں تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی فکر میں لچک کھا جاؤں۔ لیکن اس خیال پر خود ہی ہنسی آنے لگتی تھی۔ میری زندگی کی ڈور تو اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کوئی اگر اس پر پاؤں بھی رکھتا تو خود الجھ جاتا جیسے مجھ سے متعلق یہ چند افراد الجھے ہوئے تھے۔

وہ دونوں اونگھتے رہے اور میں بھی ان کے ساتھ اونگھنے لگی۔ لیکن خیالات کا بھنور ذہن میں چل رہا تھا۔ اب بالکل ہی اپنے آپ کو ان معاملات سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتی تھی۔ لاتعداد کہانیاں میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔ بلکہ یہ میری کہانیاں تھیں اور میں خود ہی ان سے ناواقف۔ لیکن اب یہ احساس ہورہا تھا کہ کچھ ہے بے شک کچھ ہے۔

رات ہوگئی اس گفتگو کے بعد وسکن ڈیزل اور عدنان شائی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن وہ خود ایک دوسرے کے سر میں سر گھسائے کھسر پھسر کرتے رہے تھے۔ نہ جانے کیا باتیں کررہے تھے۔ میں نے ان لوگوں میں جو شوق کی دیوانگی پائی تھی۔ اس شعبے میں وہ میرے مشاہدے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ ان کی یہ عمریں آرام کرنے کی تھیں۔ پوری زندگی انہوں نے اپنے شوق کو سونپ دی تھیں لیکن آج بھی ان کا تجسس انہیں دربدر کئے ہوئے تھا۔ نہ جانے یہ کیفیت کن عوامل سے گزر کر پیدا ہوجاتی ہے۔

رات کے کھانے پر وہ پھر میرے پاس آگئے ہم نے مل کر کھانا کھایا، کھانے کے بعد وسکن ڈیزل نے لجاجت سے کہا۔

"کیا ایک بار پھر تم ہمیں وادی ارمناس کے بارے میں بتانا پسند کروگی نشا۔"

"میں اس کے بارے میں کیا بتاؤں؟"

"وہ جو تمہیں غیری نے بتایا تھا۔"

"اس نے کہا تھا کہ وہاں دن بھر سکون ہوتا ہے، رات کو ہوائیں تیز ہوجاتی ہیں۔ ریت کے بگولے پوری وادی میں سفر کرتے ہیں، انہی بگولوں میں روشن بگولے ہوتے ہیں جن میں اچانک دروازے نمودار ہوجاتے ہیں کوئی اگر نمودار ہوجانے والے دروازوں میں اچانک اندر داخل ہوجائے تو وہ ماضی میں پہنچ جاتا ہے۔"

دونوں سکتے کے عالم میں میری بات سنتے رہے تھے۔ انہوں نے مزید کچھ نہ پوچھا۔ بہت دیر کے بعد آرام کرنے لیٹ گئے۔ میں نے ان دونوں کو بے چین اور مضطرب پایا تھا۔ رات کو دو بار آنکھ کھلی اور میں نے انہیں جاگتے ہوئے ہی پایا۔ "پاگل ہیں دونوں...... پاگل

ہیں۔" میں نے دل میں سوچا۔

صبح نہایت سنسنی خیز تھی، کئی افراد قید خانے میں موجود تھے۔ ان کی آوازوں سے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ ایک ڈاکٹر قسم کا آدمی مسہری پر لیٹے وسکن ڈیزل کا اسٹیتھو اسکوپ سے جائزہ لے رہا تھا۔ دوسرے چند وردی پوش ان کے آس پاس کھڑے تھے۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی یہ حرکات دیکھیں پھر عدنان شائی کی مسہری کی طرف دیکھا وہ مسہری پر بے سدھ پڑا ہوا تھا وہ لوگ کئی منٹ تک ان پر مصروف رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے مشتبہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لڑکی کیا تم ہمیں ان دونوں کی اچانک موت کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو۔"

میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے ان دونوں کی طرف نظر ڈالی، پھر پولیس افسر کی طرف دیکھا۔ میں اس کے الفاظ پر غور کررہی تھی جو کچھ اس افسر نے کہا ہے میں نے وہی سمجھا ہے یا کوئی غلط فہمی ہوگئی۔

"آپ۔ آپ نے کیا کہا ہے۔ آفیسر۔"

"غالباً آپ کو ان کی موت کی خبر نہیں ہے۔ جبکہ ڈاکٹر کا اندازہ ہے کہ تقریباً ساڑھے پانچ بجے اور چھ بجے کے درمیان ان کی موت واقع ہوئی۔" آفیسر نے کہا۔

"مرگئے یہ دونوں...... مرگئے؟"

"کیسے مرے۔ یہ آپ بتائیں گی۔" آفیسر کرخت لہجے میں بولا اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے اعصاب بہت کمزور ہوگئے تھے۔ کتنا برداشت کرتی، آخر انسان تھی۔ ہر لمحہ ایک نیا ذہنی جھٹکا۔ ہر بات انوکھی۔ اب تو کسی انوکھی بات پر حیران ہونے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر قریب آکر بولا۔

"لاشوں کو اسپتال پہنچانے کی تیاری کریں۔ آفیسر پتہ چلے کہ آخر ان کی موت کا کیا سبب ہے۔ ویسے یہ مجھے زہر خورانی کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں انہیں زہر دیا گیا ہے۔ تاہم صحیح پتہ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ہوگا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔"

آفیسر ضروری تیاریاں کرنے لگا۔ میں بدستور دم سادھے بیٹھی ہوئی تھی، کچھ دیر کے بعد دونوں کی لاشیں وہاں سے اٹھالی گئیں، میں بس خالی خالی نظروں سے ساری کارروائی دیکھتی رہی۔ کیا سوچتی کیا غور کرتی کچھ سمجھ میں تو آئے، کوئی ایک بات تو ایسی ہو جسے عقل تسلیم کرے۔ دل دکھ رہا تھا ان کے لئے، واقعی دل میں دکھن تھی۔ حالانکہ انہوں نے میرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔ مگر کیسے مرگئے۔ کس نے انہیں زہر دے دیا۔ رات کو بے چین تھے مضطرب تھے۔ تقریباً ساری رات جاگتے رہے تھے کون ہوسکتا ہے ان کا قاتل آخر کون؟ اس کا مطلب ہے کہ مجھ پر دو افراد کے قتل کا الزام اور لگنے والا ہے۔ آفیسر مجھے ہی شبے کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا شبہ بجا تھا۔ ہم تین افراد تھے اس قید خانے میں، دو مرگئے ایک زندہ ہے، ایک ہی کیوں زندہ ہے چلو ٹھیک ہے ایک قتل کے الزام میں گرفتار ہوں۔ دو انسانوں کے قتل کا الزام اور ایک ہی بار تو سزا ملے گی۔"

میرا خیال تھا کہ اب مجھ پر سختیاں شروع ہوجائیں گی۔ آخر کتنی رعایت کریں گے وہ میرے ساتھ۔ لیکن پورا دن گزر گیا شام کو مجھے حسب معمول واک کی دعوت بھی دی گئی جسے میں نے قبول کرلیا۔ جیل کے وسیع وعریض باغیچے میں بہت دیر تک چہل قدمی کرتی رہی۔ چاروں طرف قیدی بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر سورج چھپا تو واپس اپنی جگہ آگئی۔ شاید پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کیا جارہا تھا۔ رات بھر البتہ بڑی بے چینی رہی۔ دونوں بہت یاد آئے تھے۔ لیکن ان یادوں میں بڑے متضاد احساسات تھے۔

دوسرا دن بھی گزر گیا۔ البتہ شام کو اس وقت جب میں باغیچے میں گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی دو پولیس مین میرے پاس پہنچ گئے۔

"آپ کو جیلر کے آفس بلایا گیا ہے۔"

"چلو......" میں نے کہا اور ان کے ساتھ چل

پڑی۔

جیل کا احاطہ بہت وسیع تھا، بہت دور چلنا پڑا پھر میں جیل آفس کی عمارت میں داخل ہوگئی۔ کئی راہداریوں سے گزر کر مجھے ایک بڑے کمرے میں لایا گیا۔ جہاں کئی افراد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مقامی لوگ بھی تھے۔ اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو ان میں سے تین افراد کا تعلق میرے وطن سے تھا۔ مگر تمام صورتیں اجنبی تھیں۔ نہ جانے کون تھے۔ البتہ ایک بات میں نے محسوس کرلی تھی کہ ان کے چہروں پر خوشگوار تاثرات نہیں تھے۔ وہ مجھے ملامت آمیز انداز میں دیکھ رہے تھے۔

''آپ یہاں بیٹھئے۔'' ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے کرسی پیش کی اور میں بیٹھ گئی۔

اسی وقت ایک اور شخص اندر داخل ہوا میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ پولیس کمشنر تھا۔ اس نے چند لوگوں سے ہاتھ ملایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ان لوگوں میں سے ایک نے اردو زبان میں پوچھا۔ جن کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ میرے ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب تصدیق ہوگئی تھی۔ البتہ اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔ میں نے اسے سرد نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''نشا دانش۔''

''والد کا کیا نام ہے؟''

''ہارون دانش۔''

''ہارون دانش کیا کرتے ہیں؟'' وہ اس انداز میں بولا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''آپ لوگوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ کا تعلق میرے وطن سے ہے۔ اور اب آپ کے انداز گفتگو سے اس کی تصدیق ہوگئی۔ ویسے آپ لوگ یہاں کیا کرتے ہیں، بتانا پسند کریں گے؟''

''افسوس ہمارا تعلق سفارت خانے سے ہے، آپ جیسی عظیم ہستیاں ہمارے لئے باعث شرم ہیں کہ آپ اپنی مجرمانہ کاوشوں سے ہمارے سر غیروں کے سامنے جھکا دیتی ہیں۔'' اس شخص نے کہا۔ اسی وقت کمشنر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''میں درخواست کرتا ہوں کہ گفتگو انگریزی میں کی جائے۔''

''سوری کمشنر۔'' اس شخص نے کہا پھر انگریزی میں بولا۔

''جی میڈم آپ اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گی۔''

''کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آج جو کچھ آپ کو معلوم ہو چکا ہے بس اس پر قناعت کریں۔''

''حکومت مصر نے آپ کے سلسلے میں ہم سے رابطہ کیا ہے۔ ہم آپ سے تفصیل سننا چاہتے ہیں...... یہ ضروری ہے۔''

''صرف تفصیل سنیں گے یا اس پر یقین بھی کریں گے؟''

''کیوں نہیں آپ بتایئے۔''

''تو پھر مختصر سنیے۔ جو کچھ میرے نام سے منسوب کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ میں اپنے وطن میں کروڑوں روپے کی دولت اور جائیداد کی تنہا وارث ہوں۔ آپ پورے وثوق سے اس کی تصدیق کرلیں۔ میں آپ کو تفصیلات فراہم کئے دیتی ہوں۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ مجھے مزید دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ الجزائر جارہی تھی کہ مارشل سمندری طوفان کا شکار ہوگیا۔ ہم مشکلات میں گھرے رہے پھر اسی جہاز سے مصر پہنچے۔ یہاں میں ایک ہوٹل میں مقیم تھی۔ مجھے وہاں سے اغوا کرلیا گیا اور ایک پولیس افسر نے رشوت لے کر مجھے ایک دیوانے رئیس کے حوالے کردیا۔ وہ پاگل رئیس قتل کردیا گیا اور مجھے یہاں تک لے آیا گیا۔ اس کے بعد مجھے مزید دو افراد کے قتل میں ملوث کردیا گیا۔ جو مارشل میں میرے ہمسفر تھے اس سے زیادہ میرے لئے کچھ نہیں تھے۔ یہ مکمل کہانی ہے نہ اس سے زیادہ مجھے معلوم ہے اور نہ اس کے بعد کسی اور سوال کا جواب دوں گی۔ مجھے اب کسی کی مدد بھی درکار نہیں ہے۔ اگر ان تین افراد کے قتل کا ذمے دار مجھے سمجھا جاتا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ مجھے تین بار سزائے موت دے دی جائے۔''

''صرف ایک سوال اور مس نشا دانش کیا وہ دونوں افراد بھی آپ کے ہم وطن تھے؟''

''بالکل نہیں۔ ان میں سے ایک انڈونیشیا کا باشندہ تھا اور دوسرا الجزائر کا۔'' میں نے کہا۔

''کمشنر! کیا خاتون نشا دانش کو ان دونوں کے بارے میں نہیں معلوم؟''

''خاتون نشا دانش وہ دونوں بوڑھے مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ وہ شاید حبس دم کے ماہر تھے ان کے جسم مردہ سمجھ کر اسپتال لے جائے گئے تھے۔ جہاں وہ دونوں پوسٹ مارٹم ٹیبل سے اٹھ بھاگے۔ انہوں نے دو ڈاکٹروں کو زخمی کردیا اور صاف نکل گئے۔'' کمشنر نے بتایا۔

''کیا؟'' میں پھر اچھل پڑی۔

''وہ قتل انہوں نے قید سے فرار ہونے کے لئے کیا تھا۔ بہرحال مسٹر کمشنر، اس رابطے کے لئے شکریہ۔ خاتون نشا دانش کو آپ بے شک اپنی تحویل میں رکھیں۔ لیکن اب یہ سفارت خانے کے ریکارڈ پر ہیں، انہیں کسی طرح کا ذہنی یا جسمانی نقصان نہ پہنچے، یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ ان پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں انہوں نے آپ کے سامنے ان سے انحراف کیا ہے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ نہایت باریک بینی سے اس بارے میں تحقیقات کی جائے۔ اتنا اندازہ تو آپ دونوں کو بھی ہوگیا ہوگا کہ وہ دونوں ان کے ساتھی نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تیسری لاش ان کی ہوتی۔ جسے آپ پولیس اسپتال لے جاتے اور یہ بھی فرار ہوجاتیں۔ اس کے باوجود آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ تفتیش کریں۔ اور اگر ان کے بارے میں آپ کو ٹھوس ثبوت مل جائے تو بین الاقوامی قانون کے مطابق عمل کریں۔ ہمارا سفارت خانہ آپ کی ضروریات کے مطابق ہر معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے۔ ان سے تفصیلی کوائف تحریری طور پر حاصل کرکے آپ ہمیں فراہم کریں۔ ہم بہت جلد آپ کو تفصیل فراہم کریں گے۔''

''او کے جس قدر مراعات حاصل ہوں گی انہیں ضرور دی جائیں گی البتہ ان کی ضمانت ممکن نہیں ہوگی۔''

''وہ بعد کی بات ہے۔''

وہ لوگ اٹھ گئے۔ کمشنر نے باہر کھڑی ہوئی لیڈی پولیس کو اندر بھیج دیا۔ جنہوں نے مجھے دوبارہ میرے قید خانے میں پہنچا دیا۔ اس سے قبل مسلسل یہ آرزو کرتی رہی تھی کہ کسی طرح اپنے ملک کے سفارت خانے تک رسائی حاصل کرلوں۔ میرا خیال تھا کہ وہاں مجھے مکمل تحفظ حاصل ہوجائے گا۔ وہ میرے اپنے ہوں گے اور میری بپتا سن کر تڑپ جائیں گے۔ اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ جب تک میری مشکل حل نہ ہوجائے۔ مل لی تھی ان سے یوں لگتا تھا جیسے مقامی لوگوں سے زیادہ مجھے مجرم سمجھتے ہوں اور میرے گناہوں کے چشم دید گواہ ہوں۔ چلو یہ جھوٹی آس بھی ختم ہوئی۔ اب سوچ کے انداز میں فرق آجائے گا۔ پھر ذہن ان شاطروں کی طرف گیا اور دل میں دھواں سا ابھرنے لگا۔ بے حد خود غرض لوگ ہیں۔ واقعی میں انہیں نہیں سمجھ پائی تھی۔ انہیں دنیا سے کوئی خاص غرض نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سرگرداں تھے۔ کمال ہے واقعی اب دنیا کا تجربہ ہورہا تھا۔ ہر شخص اپنی ذات سے پیار رکھتا ہے۔ صرف اپنی ذات سے، جینے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ صرف اپنے بارے میں سوچو، کسی پر تکیہ نہ کرو، اگر کسی سے کوئی کام لینا ہے تو پہلے اس پر غور کرلو کہ اسے تمہاری ذات سے کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ تمہارا کوئی کام کیوں کرے گا؟ یہ چال خوب چلی انہوں نے۔ ڈاکٹروں تک کو چکمہ دے دیا۔

یہ کام انہوں نے حبس دم کی مہارت کی بنیاد پر کر ڈالا۔ اگر وہ اس کے ماہر نہ ہوتے تو شاید یہ سب کچھ ان کے لئے ممکن نہ ہوتا...... لیکن اب وہ کیا کریں گے۔ اب تو وہ مفرور مجرم ہیں۔ حکومت مصر براہ راست ان کا تعاقب کرے گی۔''

بھاڑ میں جائے سب کچھ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے خود کو سنبھال لیا۔ سفارت خانے کے دو تین

افراد مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"آپ خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ مس نشا دانش۔ آپ کے ملک کا سفارت خانہ آپ کے لئے سرگرم ہے ہمیں آپ کے کوائف چاہئیں تاکہ وطن سے ان کی تصدیق کی جاسکے۔"

"بہتر ہے...... میں حاضر ہوں۔"

"مقامی حکام نے آپ سے کوئی بیان لیا؟"

"نہیں بس ابتدا میں ہی پوچھ گچھ کی گئی تھی؟"

"آپ کے والد ہارون دانش وطن میں ہیں۔"

"نہیں وہ ماہر مصریات کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ مہم جو ہیں اور عموماً وطن سے باہر رہتے ہیں۔"

"گویا انہیں آپ کی اس مشکل کے بارے میں نہیں معلوم۔"

"شاید نہیں۔"

"وہاں کچھ اور لوگ؟"

"میرا گھر ہے وہاں اس کا پتہ لے لیجئے۔ وہاں ملازمین ہی میری دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

"کوئی ایسا عزیز جو آپ سے خون کا رشتہ رکھتا ہو؟"

"کوئی نہیں ہے۔"

"الجزائر میں آپ کیوں گئی تھیں؟"

انہوں نے سوال کیا۔ میں اس سوال کے لئے تیار تھی۔ کیونکہ پہلے ہی ان سے اجنبیت ظاہر کرچکی تھی۔ بیان میں تبدیلی مجھے مشکوک بنا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"وہاں میری ایک عزیز دوست رہتی تھی۔ اس سے ملنے گئی تھی۔"

"آپ کی اس سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ الجزائر چلی گئی۔ مجھے پہلے اس بارے میں معلوم نہیں تھا۔"

"اس سے ملنے آپ الجزائر جارہی تھیں۔"

"جی۔"

"معاف کیجئے اس کے لئے آپ نے سمندری سفر کا انتخاب کیوں کیا"

"بس تفریحاً تھوڑی سی ایڈونچر پسندی مجھے ورثے میں ملی ہے۔"

بڑی صفائی سے اتنے جھوٹ بولے تھے میں نے شاید اب کچھ عقل آگئی تھی اور اس کی وجہ خود حفاظتی کا احساس تھا۔ وہ لوگ مجھے تسلیاں دے کر چلے گئے۔ اس کے بعد وہی دن وہی راتیں۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گی کہ جیل میں تمام انسانی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں اور مجھے کوئی ذہنی اذیت نہیں ہوئی تھی۔ شام کو چہل قدمی کی اجازت دی جاتی تھی۔ سفارت خانے کی طرف سے مجھے انگریزی اخبار اور رسالوں کی فراہمی کا بندوبست کردیا گیا تھا۔

یوں تقریباً پندرہ دن گزر گئے۔ اس شام موسم ابر آلود تھا۔ میں چہل قدمی کے لئے احاطے سے نکل آئی۔ کالے بادلوں نے آسمان کو سیاہ کررکھا تھا۔ احاطے میں بے شمار قیدی بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کررہے تھے۔ بارش کی چند ننھی ننھی بوندیں آسمان سے ٹپکیں تو مجھے وطن یاد آگیا۔ ایک عجیب سی کیفیت دل پر طاری ہوگئی تھی۔ میں گھاس پر بیٹھ گئی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں نے ایک شخص کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ میلے کچیلے لباس میں تھا، داڑھی مونچھیں بے تحاشا بڑھی ہوئی تھیں۔ ایک پاؤں شاید دوسرے پاؤں سے چھوٹا تھا۔ خاص طریقے سے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میری اس سے کوئی شناسائی نہیں تھی، نہ جانے کون ہے۔ میں نے سوچا۔

"یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے کوئی کام ہے مجھ سے؟" میں نے اسے بغور دیکھ کر کہا۔ اس کی ایک آنکھ بھی خراب تھی اور اس پر سفیدی آگئی تھی۔

"ہاں۔" وہ کھرکھراتی آواز میں بولا۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا اور وہ چند فٹ کے فاصلے سے بیٹھ گیا۔

"پہچانا؟" اس نے کہا۔

"نہیں میں نے پہلے تمہیں نہیں دیکھا۔"

"میں عسکری ہوں۔" اس نے کہا اور میں اچھل پڑی۔

"آواز سے بھی نہیں پہچانا۔"

"اوہ میرے خدایا، یہ سب کیا ہے، کیا حلیہ بنا رکھا ہے اور تمہاری آنکھ؟" میں نے اب اس کی آواز شناخت کرلی تھی۔

"یہی حلیہ بنائے پھر رہا ہوں ورنہ پولیس شناخت کرلے مجھے۔"

"کیا یہ سب کچھ مصنوعی ہے؟"

"ہاں داڑھی وغیرہ اصلی ہے۔ آنکھ پر جھلی چڑھی ہوئی ہے اور چال میں لنگڑاہٹ خود پیدا کرلی ہے۔"

"اوہ خدا! مگر جیل میں؟ میرا مطلب ہے یہاں کیسے آگئے؟"

"ایک چھوٹا سا جرم کرنا پڑا۔ یہاں آنے کے لئے۔ ایک شخص کو نشے میں زخمی کردیا تھا۔ سات دن کی سزا ہوئی ہے۔"

"نشے میں زخمی کردیا تھا۔"

"او بابا...... تم سے ملنے کے لئے جیل جو آنا تھا۔ تین دن کی سزا کاٹ چکا ہوں۔ آج چوتھا دن ہے۔"

"پہلے کیوں نہ ملے تھے۔"

"آج پہلی بار چہل قدمی کی اجازت ملی ہے۔"

اس نے کہا اور میں عجیب سے جذبات کا شکار ہوگئی۔ اس شخص نے بڑا ایثار کیا تھا۔ میرے لئے اور یہ سچ تھا کہ اب تک یہ دوسروں سے بہت مختلف ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"وہاں ویلی آف کنگز میں بھی تم نے......"

"ہاں۔ میرا خط پڑھ لیا تھا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"اس وقت خوفزدہ تو ہوگئی ہوگی جب میں نے تمہیں خط دیا تھا۔"

"ظاہر ہے۔ وہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ تم وہاں تنہا تھے؟"

"یہ نا پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟"

"جواب سن کر ناراض ہوجاؤ گی۔"

"کیا مطلب؟"

"میں کہیں بھی تنہا نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ ہمیشہ تمہارا تصور ہوتا ہے نشا اور اس پر میرا حق ہے تم اسے مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔ اگر میں تنہا ہوتا تو کیا اس خوفناک ماحول میں ایک لمحہ گزار سکتا تھا۔"

میری گردن جھک گئی۔ وہ فوراً بولا۔

"سوری نشا تم نے پوچھا تھا تو میں نے بتایا۔"

"تم یہاں کیوں رکے ہوئے ہو، تمہیں علم ہے کہ مجھے تو ہوٹل سے پراسرار طور پر اغوا کرلیا گیا تھا۔ تم خود وہاں سے غائب ہوئے تھے یا تمہارے ساتھ بھی کوئی واقعہ پیش آیا تھا؟"

"نہیں میرے ساتھ کوئی واقعہ نہیں پیش آیا بلکہ تمہاری گمشدگی کے بعد میں نے تمہیں مختلف جگہوں پر تلاش کیا اس دوران حکومت مصر کی طرف سے مارشل کے مسافروں کو ان کے وطن بھجوانے کا بندوبست کردیا گیا۔ سسٹر صوفیہ اور ڈاکٹر الیاس کا خیال تھا کہ تم جان بوجھ کر روپوش ہوگئی ہو۔ وہ واپس لوٹ گئے۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کہ میں بھی روپوش ہوجاؤں تمہیں اس طرح بے یارومددگار تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری تلاش میں سرگرداں تھا۔ ایک مقبرے میں روشاق کی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے مخاطب کرکے کہا "کل اسے تمہارے بارے میں معلوم ہوا ہے۔"

"صرف آواز سنائی دی؟"

"ہاں۔ اس نے خود مجھے بتایا کہ اب وہ مجھے نظر نہیں آسکتا اس کی وجہ وہ مجھے نہیں بتائے گا اس نے کہا کہ وجہ میری سمجھ میں بھی نہیں آسکے گی۔ اس نے مجھے بتایا

کہ تم ایک مشکل میں گرفتار ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مشکل نہیں ہے تمہارے لئے بلکہ یہ ایک عمل ہے جس سے تمہیں گزرنا ہے۔ وہ وقت پورا کرنے کے لئے جب اصل کام شروع ہوگا۔"

"اصل کام کیا ہے؟"

"میں نے اس سے اس بارے میں سوال نہیں کیا۔ اس نے خود ہی بتایا کہ تمہیں ایک مخصوص وقت گزارنا ہے جو کسی نہ کسی طرح گزرے گا۔ ظاہر ہے اس وقت کی کوئی نہ کوئی کہانی تو ہوگی۔"

"اور میرا یہ خوب صورت وقت جیل میں گزرا ہے۔"

"ہاں۔ یہ ایک المیہ ہے تمہاری اپنی کیا خواہش ہے نشا۔ تمہیں یہاں سے آزادی مل جائے تو تم کیا کرو گی۔"

"خدا کی قسم اپنے وطن جانا پسند کروں گی۔ وہاں جاکر اپنے گھر کا نقشہ تبدیل کردوں گی۔ فرنیچر، قالین، ڈیکوریشن ہر چیز ہٹادوں گی، وہاں سے۔ ہارون دانش کے بیڈ روم کی ہر شے کو کوٹھی سے باہر رکھ کر جلوادوں گی۔ اس کے بعد میں اپنے نام کے ساتھ ہارون دانش کا نام کبھی سننا گوارہ نہیں کروں گی۔ چاہے مجھے اس کے ترکے سے محروم ہونا پڑے۔ کسی جھونپڑے میں زندگی گزارنی پڑے۔"

"بہت برگشتہ ہو نشا؟" عسکری مسکرایا۔

"تم خود غور کرو عسکری۔ کیا حشر ہوا ہے، میری کیا درگت بنی ہے ماں باپ کی طلب۔ ان کے بارے میں جاننے کی خواہش کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے تھا۔ یہی سب کچھ ہونا چاہئے تھا میرے ساتھ۔"

"روشاق کا کہنا ہے کہ اس نے تمہیں بہت کچھ بتایا تھا۔"

"سب ناقابل یقین، بے ربط، فضول میری کوئی کہانی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ مجھ پر مسلط کیا گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے وسکن ڈیزل اور عدنان ثنائی نے کیا کیا؟"

"اس کی تفصیل بھی مجھے روشاق نے ہی بتائی ہے۔ ہوسکتا ہے خود تمہیں اس بارے میں پوری طرح علم نہ ہو۔ میں نے اس پرزے میں لکھا تھا کہ کسی وقت تمہیں اس کی تفصیل بھی پتہ چل جائے گی۔

امیر غیری کو یہ مرض بہت عرصے سے لاحق تھا وہ خود زمانہ قدیم کا فرعون سمجھتا تھا اور اس وقت کا انتظار کررہا تھا جب اس کی بادشاہت اسے واپس مل جائے گی اور وہ مصر کو پھر قدیم خطوط پر استوار کرکے اس پر حکمران ہوگا۔ ان دونوں نے اس کے یہ بیانات پڑھے تھے اور صرف تمہیں روکے رکھنے کے لئے اسے باور کرایا تھا کہ تم ظہورہ ہو۔ اس کے باوجود روشاق کا کہنا ہے کہ تمہیں نہ تو امیر غیری نے اغوا کرایا نہ ان دونوں نے بلکہ یہ شلزانہ اوشیانوس کی بے حرمتی کا شاخسانہ ہے۔"

"ہاں تم نے لکھا تھا۔ مگر شلزانہ اوشیانوس کے بارے میں اس نے کچھ اور بتایا۔"

"نہیں۔"

"امیر غیری قتل کردیا گیا اور میں اس کی قاتلہ کی حیثیت سے یہاں قید ہوں۔"

"ہاں۔ لیکن تمہارا بال بیکا نہیں ہوگا۔ غیری کے قاتل منظر عام پر آجائیں گے۔"

"تمہیں کچھ معلوم ہے کہ اس کے قاتل کون ہیں؟"

"وہ جنہوں نے اسے یہ باور کرایا تھا کہ وہ فرعون مصر ہے اور اسے یہ باور کرانے والی اس کی چچی زیونا اور اس کے دونوں اوباش بیٹے عشان امیری اور فیصل امیری ہیں۔ وہی دولت کی ہوس کی کہانی ہے۔ زیونا اسکندریہ میں رہتی ہے اس کا شوہر یعنی غیری کا چچا مرچکا ہے مگر وہ غیری کے باپ کے مقابلے میں دولت کے لحاظ سے کچھ بھی نہ تھا اور اس نے جو ترکہ چھوڑا تھا وہ اس کے عیاش بیٹوں نے اڑادیا۔ ان کی نگاہ غیری کی بے شمار دولت پر لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ احسان کی مدد سے انہوں نے اس کھیل کا آغاز کیا۔ اور سخت محنت کرکے بالآخر غیری کو یہ باور کرایا کہ وہ دور قدیم کا فرعون ہے۔ انہوں نے مصر

قدیم کی کچھ پراسرار روایات کا سہارا بھی لیا تھا اور غیری اس جال میں پھنس گیا۔ اس کی بہن ظہورہ کو ان شاطروں نے اس کے ہاتھوں مروادیا اور ایک کانٹا صاف ہوگیا۔ غیری پر وہ آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنا قانونی تحفظ بھی کرنا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اتنی جلدی نہ کرپاتے وہ اگر اچانک تم غیری کو حاصل نہ ہوجاتیں۔ ابتدا میں وہ تم سے خوفزدہ رہے۔ اور یہ معلوم کرتے رہے کہ تم کون ہو اور یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔ لیکن احسان نے سب کچھ معلوم کرکے ایک پلان ترتیب دے دیا۔ اور اس نے اس کے بعد غیری کے خنجر پر تمہاری انگلیوں کے نشانات حاصل کرکے اسی خنجر سے غیری کو قتل کردیا۔ تم پر دہرا جرم عائد ہوگیا۔ حکومت نے تمہیں مفرور تو قرار دیا ہی تھا بعد میں یہ مشکل نہ سمجھا گیا کہ تم پر باقاعدہ سازش کا الزام سنادیا جائے اور ان دونوں احمقوں کو تمہارا ساتھی قرار دے دیا جائے۔"

"میرے خدایا تو یہ زبونا کی سازش تھی؟"

"ہاں۔"

"اور وہ کامیاب ہوگئی؟"

"روشاق کا کہنا ہے کہ ایسا نہ ہوگا......"

"مطلب میں سمجھی نہیں۔"

"تمہاری گلوخلاصی اسی مشکل میں ہوگی کہ اصل مجرم پکڑے جائیں اور ان پر جرم ثابت ہوجائے۔"

"ایسا کیسے ہوگا عسکری؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔"

"کب تک ہوگا۔"

"اس نے اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔" عسکری نے جواب دیا اور میں سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر میں نے کہا۔

"تمہارا کیا ہوگا عسکری؟"

"میں نہیں جانتا لیکن نشا، میری فکر مت کرو، کچھ نہ کچھ ضرور ہوجائے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا اپنا بندوبست کرلوں گا۔"

"میں تم سے بہت متاثر ہوں، عسکری، اعتراف کرتی ہوں کہ تم نے میرے لئے بہت ایثار کیا ہے مگر عسکری۔ میں اس لڑکی کو نہیں بھول سکتی جو تمہیں چاہتی ہے۔ نہ جانے تمہاری جدائی میں اس کا کیا حال ہوا ہوا۔ اس کے علاوہ عسکری۔ تمہیں اب بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔ تمہیں علم ہے کہ میری زندگی میری اپنی نہیں ہے۔ میں ایک پراسرار بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں۔ میں اس سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔ مجھے اب نہ اپنی شناخت سے غرض ہے نہ ماں باپ کا پتہ ٹھکانہ چاہتی ہوں۔ کچھ نہیں چاہئے اب مجھے۔ میں اپنی پسند سے جینا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ لوگ کہتے ہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ مجھے یہاں رہنا ہے وہ منحوس وقت پورا کرنا ہے جو مخصوص کردیا گیا ہے۔ میں اس بھنور کی قیدی ہوں۔ عسکری۔ میں اس بھنور سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

"عسکری کے چہرے پر جھلاہٹ سی نظر آئی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"تمہاری زندگی تمہاری اپنی نہیں ہے نشاء، اگر اپنی ہوتی تو بھی تم صرف اتنا کرتیں کہ مجھے مشل کی زندگی میں شامل کرنے کی تلقین کرتیں۔ بس اتنا ہی کیا سنو نشا، اگر میں اپنے بارے میں تم سے کچھ کہتا ہوں تو اس کا مقصد تمہارے دل میں جگہ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ وہ منزل اب بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ تم نے مجھے اتنا ذلیل کرلیا ہے کہ میرے خیال میں اب اس سے زیادہ ذلیل کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے۔ تم اپنا انتقام لے چکی ہو مجھ سے، رہی میری بات تو شاید میں اب لاشعوری طور پر اپنے ماضی کا کفارہ ادا کررہا ہوں۔ کچھ حاصل کرنے کے لالچ میں تمہارے قریب پہنچا تھا۔ وہ باتیں کی تھیں جن سے میرا معیار بہت پسند ہوگیا تھا۔ بعد میں تم سے حقیقی محبت کرنے لگا۔ تم سے بہت کچھ کہا مگر تم نے مجھے معاف نہ کیا۔ اب کوئی احساس نہیں ہے سوائے اس کے کہ تمہیں نقصان نہ پہنچے۔ میں نہیں جانتا کہ اس جنون کا سفر کتنا ہوگا۔ بہر حال دیکھنا ہے، رہی تمہاری بات تو میرے خیال میں تم غیر محفوظ نہیں ہو جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا۔"

"پتہ نہیں کیا بہتر ہوگا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

شام کے جھٹپٹے مزید گہرے ہوگئے تو مجھے واپس اپنے قید خانے میں آنا پڑا۔ عسکری سے اس کے بعد کوئی اور خاص گفتگو نہیں ہوئی تھی اور وہ چلا گیا تھا۔ میرے پاس سوچوں کا سمندر تھا اور سوچوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک ایک کردار یاد آرہا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا احسان کا ہے۔ وہ امیر غیری کے محل پر اقتدار رکھتا تھا اور سب اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ لیکن یہ امیر غیری بھی بدنصیب انسان تھا۔ دولت کے ہاتھوں شکار ہوگیا اور وہ عورت جو اسکندریہ سے آنے کے بعد امیر غیری سے بہت زیادہ الفت کا اظہار کررہی تھی اور اس کے لئے سسک رہی تھی۔ درحقیقت اس کی قاتلہ تھی۔ تجربات میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ دولت کے لئے رشتے اس طرح ترک کردیئے جاتے ہیں اور یوں بھیانک انداز میں زندگیاں چھین لی جاتی ہیں یہ بھی ایک تجربہ تھا میری زندگی میں۔ ظاہر ہے اس سے پہلے ایسے واقعات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

الغرض یہ کہ ان لوگوں نے بڑی خوب صورتی سے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ لیکن نہ جانے وہ کیسے منظر عام پر آئیں گے۔ روشاق کہتا تھا کہ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر وہ وقت کیسے پورا ہوگا اور کس کس طرح سے پورا ہوگا۔ بات پھر وہیں آجاتی تھی۔ صبر وسکون سے زندگی گزارتی رہتی، کم از کم ان بھیانک واقعات سے تو واسطہ نہ پڑتا، جن سے گزری ہوں۔ کہنا تو یہ چاہیے کہ میں نے اپنے لئے یہ ساری مصیبتیں مول لی تھیں اور اب ان لمحات کی اس ماحول کی آرزو کررہی تھی جس میں رہتی تھی۔ حکمرانی تھی میری گھر پر۔

پھر اس مخمصے میں پھنس جاتی کہ جب یہ سب کچھ ہونا تھا تو ہونا ہی تھا۔ ہوسکتا ہے یہ واقعات بھی اس ساری کہانی کا ایک حصہ ہوں اور ان سے بھی کوئی داستان ہی بن رہی ہو، آہ کاش سکون آجائے مجھ میں ان واقعات میں دلچسپی لینا سیکھ لوں۔ دیکھوں تو سہی کہ یہ سارے کے سارے دیوانے جو مجھے غیر انسانی کہانیاں سنارہے ہیں کتنے سچے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ صرف ان کی اپج ہو اور اس کہانی میں کوئی جان ہی نہ ہو۔ میں ان سارے جھگڑوں سے نجات پاکر اپنے گھر واپس لوٹ جاؤں اس کے بعد اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل مقرر کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ یہ جنون تو کبھی کا ختم ہوچکا ہے کہ میری اپنی کوئی شناخت ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے بھرپائی میں اس شناخت سے ماں باپ کا تصور اب میرے لئے وحشت کا باعث بن گیا تھا۔ جن لوگوں کے ماں باپ ایسے ہوں انہیں بغیر ماں باپ کے رہنا زیادہ اچھا......توبہ توبہ۔

پھر عسکری کی کیفیت کے بارے میں سوچا۔ اب اس بات سے انکار نہیں کرسکتی تھی کہ اس نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے کوئی بھی شخص کتنی ہی دولت کے لالچ میں اتنا کچھ نہیں کرسکتا۔ سوچتی رہی، بہت کچھ سوچا اور پھر ایک فیصلہ کرلیا۔ کل کی ملاقات میں اس سے بات کروں گی۔ اپنے رویے میں لچک پیدا کروں گی۔ حالانکہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بعد میں کیا کروں گی۔

مگر دوسرے دن عسکری نہیں ملا۔ مزید چار دن کی سزا باقی تھی۔ اس کی۔ اسے یہیں ہونا چاہئے تھا آیا کیوں نہیں میرے پاس، کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ بہت دیر اس کا انتظار کیا پھر تلاش کی لیکن نہ ملا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی وہ نہیں نظر آیا تو میں بھی جھنجھلا گئی۔ زیادہ نخرے کررہا ہے تو کرتا رہے۔ اب یہاں خود کو ایڈجسٹ کرلیا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آئندہ کیا ہوگا!

اس رات بھی معمول کے مطابق تمام امور سے فارغ ہوکر اپنے بستر پر سوئی تھی۔ صبح کو جلدی آنکھ کھل جاتی تھی۔ آس پاس کے قیدی جاگ اٹھتے تھے اور چہل پہل ہوجاتی تھی۔ لیکن آج خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ وقت بتارہا تھا کہ سورج چڑھ چکا ہے۔ دن عام معمول سے کچھ زیادہ ہوگیا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ آنکھیں بند کرکے سر زور زور سے جھٹکا اور پھر سلاخوں کے دوسری طرف نگاہ ڈالی لیکن سلاخیں کہاں گئیں ارے سلاخیں کہاں گئیں اور پھر یہ دیوار...... حریری پردہ...... سامنے لگی ہوئی ایک خوب صورت وادی کی تصویر۔

دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا۔ دل نے کہا پھر کچھ ہوگیا۔ اوہ پھر منظر بدل گیا۔ اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ہاں بالکل ٹھیک۔ نہ عالم خواب میں ہوں نہ عالم مدہوشی میں۔ لیکن منظر بدل چکا ہے کب اور کیسے۔ یہ نہیں پتہ چل رہا تھا۔ وسیع وعریض خواب گاہ تھی۔ حسین آرائشی اشیاء سے آراستہ دیکھو دیکھو دیش کا سامان قیمتی اور بے مثل! مگر سب کچھ اجنبی! حیرت کے بجائے ہنسی آنے لگی جو کچھ بھی ہوجائے اس پر حیران ہونا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک دیوار میں ٹوائلٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹوائلٹ کی جانب بڑھ گئی۔ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ تروتازہ ہی تھی اور کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ٹوائلٹ میں داخل ہوئی، فینسی فٹنگ سے آراستہ کسی امیر ترین شخص کی جگہ معلوم ہوتی تھی۔

بہر حال ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار کے نیچے نہ جانے کتنی دیر رکی اور سر پر پانی گراتی رہی، بس دیوانہ ہوجانے کی کسر باقی تھی۔ آہ کاش پاگل ہی ہوجاؤں۔ ان دیوانہ کردینے والے واقعات سے چھٹکارا تو ملے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہے باہر سے ہلکی سی دستک سنائی دی اور پھر ایک مہین سی آواز جس نے انگریزی میں کہا۔

”لباس موجود ہے محترمہ نشا دانش۔ میں باہر جارہی ہوں۔ دروازہ بند ہوگا براہ کرم لباس لے لیجئے گا۔“

میں نے جلدی سے نل بند کردیا۔ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی۔ لیکن دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں اس سے کان لگا کر جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنتی رہی۔ جس آواز نے مجھے میرے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔ وہ بالکل اجنبی تھی۔ پھر تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھا ایک اسٹینڈ پر گلابی رنگ کا مخصوص طرز کا لباس لٹکا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مقامی طرز کا لباس، میرے نئے کرم فرماؤں کا تحفہ، جنہوں نے نجانے کس طرح سے مجھے جیل سے نکال لیا تھا۔ دل پر انتہائی سختی کے ساتھ قابو حاصل کیا۔ دیوانہ کرنے والے تو دیوانہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن کامیاب نہیں ہو پارہے تھے۔ کم بخت دماغ ایک بھی حقیقت کو قبول نہ کرنے کے باوجود اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ یہ بھی مجھ سے باغی تھا لعنت ہے اس پر۔ بہر حال وہ خوب صورت لباس پہن لیا۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر بال خشک کئے اور انہیں سنوارنے لگی...... تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

”آجاؤ۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا اور وہ اندر داخل ہوگئی۔ نوجوان لڑکی تھی۔ جس کی قومیت کے بارے میں اندازہ نہیں ہوسکا۔ رنگ وروپ یورپ کا سا تھا۔ البتہ بال سیاہ تھے۔ آنکھوں پر خوب صورت چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ ناشتہ لائی تھی۔ ٹرالی پر تروتازہ بسکٹ، ابلے ہوئے انڈے اور چائے کے برتن تھے۔

”نفیسہ۔ آپ کی خادمہ۔ سوئچ بورڈ پر سرخ بٹن میرے لئے ہے۔ ناشتہ کرلیجئے۔“

”شکریہ...... میرے نئے میزبان کون ہیں؟“

”گیارہ بجے آپ سے ملاقات کریں گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”اوہ اچھا۔“ میں نے سکون سے کہا اور ناشتے کی ٹرالی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ دل میں سوچا کہ یہ میرا نیا قید خانہ ہے۔ خیر کوئی حرج نہیں ہے۔ چائے کے کئی کپ لئے اور پھر لڑکی کو دیکھنے لگی۔

”کسی اور شے کی ضرورت ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”فرمایئے؟“

”آزادی چاہئے۔“ میں نے کہا اور وہ بھی مسکرادی۔

پھر وہ خاموشی سے ٹرالی دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گیارہ نجانے کس طرح بجے لیکن نفیسہ کی دی ہوئی اطلاع غلط نہیں تھی۔ ٹھیک گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے ان مہذب لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دے دی لیکن جو لوگ اندر داخل ہوئے تھے وہ شناسا چہرے تھے۔ حالانکہ چند لمحات کے لئے انہیں

دیکھا تھا لیکن پہچان گئی تھی! سب سے آگے خاتون زبونا تھی، اس کے پیچھے فیصل اور عشان تھے، تینوں پرسکون انداز میں داخل ہوئے۔ خاتون زبونا نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ عشان اور فیصل صوفے کے عقب میں کھڑے ہوگئے۔

”تعارف ہوجائے!“ خاتون زبونا نے کہا۔

”خوش قسمتی سے میں آپ سے متعارف ہوں خاتون زبونا!“ میں نے کہا اور خاتون زبونا مسکرا پڑیں۔ پھر بولیں۔

”یہ اچھی بات ہے، خیر یہ دونوں میرے بیٹے عشان اور فیصل ہیں۔ تمہارے بارے میں مجھے تفصیلی علم ہوچکا ہے نشا دانش اور میں نہایت صاف گوئی سے تمہیں وہ سب کچھ بتائے دیتی ہوں جس نے تمہیں یقینی طور پر متجسس کررکھا ہوگا۔“

”جی فرمایئے۔“ میں نے کہا۔

”اصل میں یوں سمجھ لو کہ ہم لوگ اپنی زندگی کے اہم مشن پر کام کررہے تھے۔ کائنات میں دولت ایک ایسی چیز ہے جو اگر نہ ہو تو زندگی کا مزہ ختم ہوجاتا ہے۔ تمہارے اوپر امیر غیری کے قتل کا الزام ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ الزام قائم رہے گا یا ختم ہوجائے گا لیکن مجھے کچھ ایسے شواہد ملے تھے جن سے یہ اندازہ ہورہا تھا کہ لوگ امیر غیری کے اصل قاتلوں کے بارے میں غور کررہے ہیں۔ تمہیں یقیناً اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ امیر غیری کے اصل قاتل کون ہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا۔ بہر طور قاتلوں سے تمہارا تعارف کرادیا جائے، وہ ہم لوگ ہیں۔ میں نے اور میرے ان دونوں بیٹوں نے مل کر یہ پروگرام تیار کیا تھا۔ حالانکہ ہمیں اپنے کام میں اتنی آسانی کی امید نہیں تھی۔ لیکن تمہاری آمد نے ہماری مشکل آسان کردی۔ اور وہ کام جس کے لئے کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں کی جاسکتی تھی تمہاری شمولیت سے مکمل ہوگیا۔ یہ کہنا بے سود ہی ہوگا کہ ہم امیر غیری کو اس کی دولت کے لئے قتل کرنا چاہتے تھے۔ تمہاری شخصیت سے ہمیں ایک مضبوط بیک گراؤنڈ مل گیا۔ امیر غیری قتل کردیا گیا، تم گرفتار ہوگئیں۔ اس کے بعد کے حالات سے بھی ہمیں مسلسل واقفیت رہی یعنی یہ کہ تمہارے وہ دونوں ساتھی بوڑھے فرار ہوگئے جو اس قتل میں ملوث قرار دیئے گئے تھے۔ تحقیق بہر طور ہورہی تھی اور پولیس اتنی احمق بھی نہیں تھی کہ وہ بالکل ہی آگے کام نہ کرسکتی۔ ہمیں اپنے آپ کو اس مشکل سے نکالنا تو تھا ہی۔ چنانچہ جہاں ایک منصوبہ بندی کی گئی تھی وہاں کچھ اور منصوبے بنالئے گئے۔ پولیس کمشنر ہمارا دست راست ہے۔ ہمارے مفادات کا نگراں اس نے ہمیں لمحہ لمحہ حالات سے باخبر رکھا۔ پتہ چلا کہ وہ دونوں بوڑھے پولیس کو چکمہ دے کر فرار ہوگئے۔ گویا انہوں نے دوسری بار ہماری مدد کی۔ پہلے بھی انہوں نے تمہیں ظہورہ کے نام سے امیر کے پاس پہنچا کر ہمارے لئے ایک بہترین موقع فراہم کیا تھا۔ اس بار پھر وہی ہمارے کام آئے۔ سنا ہے تمہارا سفارت خانہ تمہارے لئے کافی تگ ودو کررہا ہے۔ لیکن ہم اسے زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ ہوا یوں کہ تمہیں رات کے کھانے میں خواب آور دوا دے کر بے ہوش کیا اور پھر ہمارے دوستوں نے تمہیں ہمارے حوالے کردیا۔ اس وقت تم اسکندریہ میں ہو۔“

”اسکندریہ میں؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں، اخبارات تمہارے بارے میں جو کچھ لکھیں گے وہ یوں ہوگا۔ جرائم پیشہ افراد کے ایک سہ رکنی گروہ نے جو امیر غیری کی دیوانگی سے فائدہ اٹھا کر لاکھوں پونڈ کے ہیرے چرانے کا منصوبہ رکھتا تھا۔ امیر غیری کو قتل کیا لیکن بدقسمتی سے وہ ہیرے لے جانے میں کامیاب نہ ہوسکے اور گرفتار ہوگئے۔ پھر اس گروہ کے دو افراد موت کا ڈرامہ رچا کر پولیس کے چنگل سے نکل گئے اور اب اس وقت جب جیل کے حکام نے کچھ تحقیقی امور کے لئے گروہ کی تیسری فرد لڑکی کو دفتر تحقیق میں طلب کیا تھا اسی گروہ کے افراد نے خواب آور گیس کا بم مار کر جیل کے حکام اور پولیس کمشنر کو بے ہوش کیا اور لڑکی کو نکال

لے گئے۔ وہاں باقاعدہ یہ سب کچھ ہوا ہے اور اخبارات کو یہ خبر ریلیز کردی گئی ہے۔"

خاتون زیونا نے مسکرا مسکرا کر یہ تفصیل بتائی اور میں ششدر اسے دیکھتی رہ گئی، پھر فیصل بولا۔

"میری ماں اس کائنات کی سب سے ذہین عورت ہے مس نشا دانش، لیکن ہم بد دیانت اور خود پسند نہیں ہیں۔ تم لوگ جو کوئی بھی ہو تم نے نادانستگی میں ہماری بہت مدد کی ہے۔ اور ہم تمہیں بحفاظت مصر سے نکال کر جہاں تک تم چاہو گی پہنچا دیا جائے گا اور اگر تمہیں ان سے دلچسپی نہ ہو تو تم خود جہاں جانا چاہو گی ہم بندوبست کردیں گے۔"

ان لوگوں کی داستان پر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ یہ تفصیل عسکری بھی مجھے سنا چکا تھا۔ لیکن ان کے الفاظ کے آخری حصے نے میری توجہ سمیٹ لی تھی۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا کہ ان سے مفاہمت رکھی جائے بس اور کچھ نہیں چاہئے تھا مجھے۔ میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔ جس طرح بھی ہو میری گلوخلاصی ہوجائے۔ میں نے کہا۔

"سنئے جناب۔ میری گزارش ہے کہ آپ لوگ میری باتوں پر یقین کریں۔ مجھے جھوٹ بول کر کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ان تمام واقعات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ آپ کے اور حکومت مصر کے معاملات ہیں۔ آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ بہتر جانتے ہیں۔ میں بس یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو اس میں میری مدد کردیں۔"

"ہم نے اس کا وعدہ کیا ہے نشا دانش۔ وہ دونوں بوڑھے کہاں ہیں؟"

"میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ سب مارشل کے مسافر تھے اور وہی امیر غیری کو دھوکہ دے کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہی یہ سازش کی تھی۔"

"ان کا کوئی مقصد تو ہوگا؟"

"یقیناً لیکن انہوں نے مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔" فیصل بولا۔

"حقیقت یہی ہے۔ آپ لوگوں سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ میرا ان تمام واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اگر ان بوڑھوں کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہوتی تو جس طرح وہ خود فرار ہوئے اسی طرح میرے لئے بھی کوشش کرسکتے تھے۔"

اس دلیل نے شاید انہیں کچھ متاثر کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر عشان بولا۔

"کیا فیصلہ کرتی ہیں مادر مہربان!"

"وہ دونوں شیطان کون تھے اور کہاں روپوش ہوگئے۔ تم ان کے بارے میں کچھ اور بتاؤ لڑکی۔"

"ان میں سے ایک کا نام وسکن ڈیزل ہے اور اس کا تعلق الجزائر سے ہے۔ دوسرا عدنان شائی ہے جو انڈونیشیا سے الجزائر پہنچا تھا۔ اور وہیں سے یہ دونوں جہاز مارشل پر سوار ہوئے تھے۔ یہ قدیم مصر پر تحقیق کے شوقین ہیں۔"

"تم سے ان کی شناسائی کیسے ہوئی؟"

"وہیں مارشل پر، میں بھی ایک محقق کی بیٹی ہوں۔"

"ختم کرو عشان۔ لڑکی شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اس کا کام کردو۔ بوڑھوں کو ہم دیکھ لیں گے۔" خاتون زیونا نے کہا۔

"تم اب کیا چاہتی ہو لڑکی۔"

"صرف اپنے وطن جانا چاہتی ہوں۔"

"اگر ہم تمہارا لیبیا تک جانے کا بندوبست کردیں تو وہاں سے تم اپنے وطن جاسکو گی؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم جناب۔ میں تو بس زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ میرے وطن تک جانے کا بندوبست کردیں تو آپ کی عنایت ہوگی۔ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

"یہ ہمارے لئے مشکل ہوگا۔ اب تمہارے جیل سے نکل جانے کے بعد ان تمام راستوں کی نگرانی کی جائے گی۔ جہاں سے تم اپنے وطن جاسکو۔ اس لئے بھی

بہتر ہے کہ تم لیبیا چلی جاؤ۔ وہاں سے تم خود جدوجہد کرلینا۔"

"جیسا آپ بہتر سمجھیں۔"

"بے فکر ہوجاؤ۔ تمہیں کچھ وقت یہاں گزارنا ہوگا۔ اس کے بعد ایک صحرائی سفر سے تمہیں ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جہاں سے تم لیبیا جاسکو۔ باقی کام تمہیں خود کرنا ہے۔"

میں خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ تینوں چلے گئے۔ میرا دل بھر آیا۔

دو دن اس قید میں گزرے۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ہر طرح میرا خیال رکھا گیا۔ تیسری صبح ناشتہ کررہی تھی کہ ایک شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ احسان تھا۔

"ہیلو مس نشا دانش۔"

میرے ہونٹ ہیلو کہنے کے لئے ہلے لیکن منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

"تم جانتی ہو میں تو حکم کا غلام ہوں۔ بہر حال وطن واپسی مبارک ہو۔ ناشتہ کرو۔"

"ش‌ش...... شکریہ جناب۔ کیا؟" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

"ہاں...... بس تیار ہوجاؤ۔ کچھ دیر کے بعد ہم روانہ ہوجائیں گے۔" اس نے کہا۔

اس کے بعد ناشتہ کیا حیثیت رکھتا تھا۔ احسان چلا گیا اور میں شدید اعصابی دباؤ کا شکار ہوگئی۔ لیبیا بھیج رہے ہیں یہ مجھے۔ بہر حال اس عذاب سے تو نکلوں۔ اس کے بعد تقدیر آزماؤں گی۔ ہوسکتا ہے وطن پہنچنے میں کامیاب ہو ہی جاؤں۔

سفر ایک پرانے طرز کی لینڈ کروزر سے کیا گیا تھا۔ ڈرائیور تھا دو آدمی اور تھے اور احسان تھا۔ لینڈ کروزر میں ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ جس میں دونوں طرف چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اندر ریشم کے گدے لگے ہوئے تھے۔ احسان نے اس کا ڈھکنا کھول کر مجھے اشارہ کیا۔

"کک کیا مطلب؟" میں نے سہم کر کہا۔

"ایک خوفناک، لیکن دلچسپ سفر......!" وہ مسکرا کر بولا۔

"لل...... لیکن......!"

"اپنی عقل سے بھی سوچا کرو بے بی۔ مصری پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ راستہ طویل ہے۔ اگر کہیں چیکنگ ہوگئی تو تمہارے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔ بس آبادیوں سے نکل جائیں۔ اس کے بعد نکل آنا۔"

"میرا دم گھٹ جائے گا اس میں۔"

"نہیں ان سوراخوں سے تمہیں پوری ہوا ملے گی۔"

تھوڑی سی دو قدم کے بعد میں تابوت میں لیٹ گئی۔ پھر لینڈ کروزر اسٹارٹ ہوکر چل پڑی۔ میں نے اس قبر میں آنکھیں بند کرلی تھیں۔ آنکھیں کھولتی تو کلیجہ حلق میں آنے لگتا۔ واہ مجھے اس دنیا میں لانے والوں کیا حسین زندگی دی ہے تم نے مجھے۔ تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔ آنکھوں کی کوروں سے آنسو بہتے رہے۔ ایک بار عسکری کا خیال بری طرح حواس پر چھا گیا۔ اب مجھے اس کے خلوص پر شک نہیں تھا۔ لیکن میں اتنی بے بس تھی کہ اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ کوئی چالیس منٹ تک اس قبر میں دفن رہی، پھر اچانک تابوت کا ڈھکن کھول دیا گیا، تاریکی روشنی میں بدل گئی اور میں نے دہشت زدہ انداز میں آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہوا...... کیا ہوگیا؟"

"کچھ نہیں بے بی۔ اب باہر آجاؤ۔" احسان کی آواز سنائی دی اور میں پھرتی سے تابوت سے باہر نکل آئی۔

"خطرہ ٹل گیا؟"

"ہاں۔ آرام سے بیٹھو۔ کافی پیو گی؟"

"پانی مل سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں پانی دو۔" احسان نے اپنے ساتھی سے کہا۔ بلوری گلاس میں مجھے پانی دیا گیا۔ اس

کے بعد کافی۔ حالانکہ گرمی تھی لیکن چکراتے ہوئے سر کے لئے بہت اچھا ثابت ہو رہا تھا۔ احسان کا رویہ بے حد نرم تھا۔

باہر کے مناظر نمایاں تھے۔ تاحد نگاہ ریت کے ٹیلے بچھے ہوئے تھے کہیں کہیں ٹوٹے پھوٹے اہراموں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن کے بقیہ حصے ریت میں دفن ہو گئے تھے۔ مصر کی روایتی شکل نمایاں تھی۔ میں انہیں دیکھتی رہی۔ مزید کوئی پچیس منٹ تک یہ سفر جاری رہا۔ سیاہ رنگ کا وہ بلند و بالا مقبرہ مجھے کوئی چھ سات منٹ سے نظر آ رہا تھا۔ وہ قریب آتا جا رہا تھا۔ لینڈ کروزر شاید ریت کے درمیان میں بنی ہوئی کسی سڑک پر چل رہی تھی لیکن ایک جگہ سے اس نے راستہ بدل دیا۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ اب وہ ریت پر سفر کر رہی ہے۔ میں سمجھ نہیں پائی...... لیکن اونچا اہرام اب قریب آ گیا تھا اور اس کے قریب لینڈ کروزر رک گئی۔ میرے اعصاب پھر کشیدہ ہو گئے۔ یہاں رکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

بہر حال میں تو اب ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔ میری سمجھ میں تو بہت سی باتیں آ رہی تھیں۔ لیکن بے بسی بھی کیا کرتی۔ اہرام بہت پراسرار نظر آ رہا تھا۔ یہ پہلا فرعونی مقبرہ تھا جسے میں نے اتنے قریب سے دیکھا۔ اس کی ہیبت میرے دل پر طاری ہو رہی تھی۔ عظیم الشان مقبرے کے سامنے کے حصے میں بوسیدہ دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جو بند تھا۔ زمانہ قدیم کا یہ عظیم الشان اہرام جس سے نجانے کتنی داستانیں وابستہ ہوں گی۔ اس لق و دق ریگستان میں بہت خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ احسان اور اس کے ساتھی نیچے اتر گئے۔ میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر پراسرار کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ تابوت نیچے اتارا گیا اور وہ لوگ اسے لیتے ہوئے اہرام کے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے بعد اس کا ڈھکن کھول دیا گیا پھر احسان آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب پہنچا اور اس نے نرم و ملائم لہجے میں کہا۔

''آؤ نشا دانش نیچے اتر آؤ۔ یہ ریگزار تماسرا ہے اور یہ اہرام بھی تماسرا ہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں زمانہ قدیم کے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ ان کی گلی سڑی لاشیں ہڈیوں کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہیں اور یہ ہڈیاں بوسیدہ تابوتوں میں دفن ہیں...... لیکن اصل میں یہ خاتون زبونا کا نوادر خانہ ہے۔ اس کے قدیم تاریخ میں خاتون زبونا کی تاریخ بھی شامل ہو گئی ہے۔ اصل میں تمہیں اندازہ نہیں قلوقطرہ کی سرزمین پر اس جیسی فطرت کی بے شمار خواتین جنم لیتی ہیں۔ کچھ کے نام تاریخ میں بھی محفوظ ہیں۔ شاید ہر دور میں یہاں کم از کم ایک قلوپطرہ ثانی ضرور رہی ہے۔ کسی بھی نقطہ نگاہ سے اس پر غور کیا جائے تو اس کی فطرت میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے جو قلوپطرہ کے مزاج سے مل جاتی ہے۔

خاتون زبونا کو تم اس دور کی قلوپطرہ کہہ سکتی ہو۔ اس نوادر خانے میں وہ عتاب زدہ افراد موجود ہیں جن سے کسی نہ کسی طرح خاتون زبونا کی مخاصمت رہی ہے۔ خاتون زبونا نے ان کی تاریخ ان کے ساتھ یہاں دفن کر دی ہے۔ شاید تمہیں اس بات پر یقین نہ آئے کہ امیر غیری کی اصل لاش بھی ایک تابوت میں یہاں پہنچ گئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا مدفن بظاہر کہیں اور ہے۔ بڑے آدمیوں کے کھیل ہیں اور انہیں یہ کھیل کھیلنا مشکل نہیں ہوتے۔ امیر غیری کی تدفین جہاں کی گئی وہاں سے پوشیدہ طور پر ان کی لاش نکال کر خاتون زبونا کے حکم سے یہاں تک پہنچا دی گئی تاکہ ان کے کشتگان منتشر نہ ہوں۔ ظہورہ کی لاش بھی یہیں ایک تابوت میں موجود ہے اور بھی کئی ایسے ہیں جن کا تذکرہ اس وقت بے مقصد ہوگا اور افسوس مس نشا دانش کہ آپ بھی کسی نہ کسی طور ان افراد میں شامل ہو گئیں جن کے بارے میں خاتون زبونا کا خیال ہے کہ انہیں مر جانا چاہیے اور ان کی زندگی خاتون زبونا کے حق میں بہتر نہ ہوگی۔''

میرے پورے جسم میں پھریریاں دوڑ گئیں، میں لینڈ کروزر سے نیچے تو اتر آئی تھی...... لیکن ان الفاظ پر وحشت زدہ ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''تت...... تو کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ مجھے آزادی دلانے کا بہانہ کیا تھا تم نے۔ کیا میری دلجوئی فریب تھی؟''

''سو فیصد ورنہ تم خود سوچو مس نشا دانش بھلا فیصل، عشان اور خاتون زبونا تمہارے سامنے اس بے تکلفی سے اپنے جرم کا اعتراف کرتے...... تم ناسمجھ ہو اگر تمہاری جگہ کوئی سمجھدار ہوتا تو فوراً یہ اندازہ لگا لیتا کہ تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری زندگی ختم ہو چکی ہے اور تم ان کا راز لے کر صرف قبر میں جا سکتی ہو۔ اب یہ تمہاری معصومیت ہے کہ اس اظہار کے باوجود تم نے اپنے آپ کو زندوں میں شمار کر لیا۔ خیر اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہاری گردن دبا کر تمہیں ہلاک کر دوں۔ ورنہ کسی کو اگر زندہ تابوت میں رکھ کر قبر میں اتار دیا جائے تو ظاہر ہے اسے موت کی شدید تکلیف سے دوچار ہونا پڑے گا اور چونکہ تم اتنی بے ضرر رہی ہو ہمارے لئے کہ تم سے کوئی پرخاش ہی نہیں ہے ہمیں۔ میں ذاتی طور پر تمہیں یہ دکھ نہیں دے سکتا۔''

''دیکھو میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں گی۔ بھول جاؤں گی وہ سب کچھ جو ہو چکا ہے، میری زندگی بخش دو، میں تو خود ہی ان حالات میں پھنسی رہی ہوں، جو موت سے بدتر ہوتے ہیں، مجھے بے بسی کی موت مت مارو، تمہیں اس سے کیا مل جائے گا۔''

''افسوس اس کائنات میں بعض لوگ اپنی مرضی سے ایک دن نہیں گزارتے۔ میں بھی انہی میں سے ہوں مس نشا دانش، میری بدنصیبی نے مجھے غلام پیدا کیا اور میں غلاموں ہی کی مانند زندگی بسر کرتا رہا ہوں...... غلام کا صرف ایک کام ہوتا ہے آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرے۔ میں نے آج تک یہی کیا ہے۔ براہ کرم میرے اندر کسی اور قسم کے جذبات نہ بیدار کر دو۔ میں انہیں نباہ نہ سکوں گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس حکم پر افسردہ رہوں جو مجھے میرے آقاؤں کی جانب سے ملا۔ دیکھو وہ تابوت خوب صورت ہے تم اس کا تجربہ کر چکی ہو۔ صدیوں کے بعد یا ہو سکتا ہے کچھ عرصے کے بعد کچھ محقق ریگزار تماسرا میں اہرام تماسرا کا معائنہ کریں تو تمہاری لاش پا کر تمہاری بھی کوئی تاریخ تعین کر لیں۔ آؤ اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمارے پاس، ہم تمہاری آخری رسومات کے لئے تیار ہیں...... اور......!''

لیکن اس کے ساتھ ہی احسان کو خاموش ہو جانا پڑا۔ ایک آواز فضا میں گونجی تھی، گو فاصلہ بہت تھا لیکن آسمان پر اڑنے والے ہیلی کاپٹر کے لئے یہ فاصلہ طے کر لینا کون سا مشکل تھا۔ احسان کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی پلٹ کر آسمان کی جانب دیکھنے لگے۔ ہیلی کاپٹر بہت تیز رفتاری سے اس سمت آ رہا تھا۔ احسان کے حلق سے دہشت بھری آواز نکلی......

''اوہو...... اس کا رخ تو اس سمت ہے۔ کون ہو سکتا ہے یہ کون ہو سکتا ہے......؟''

میں بھی دہشت بھرے انداز میں اسی سمت دیکھ رہی ہوں۔ اس لئے عقبی سمت ہم لوگ توجہ نہ دے سکے۔ وہ تو جب پیچھے سے آواز سنائی دی تب ہم سب پلٹے تھے۔ اہرام تماسرا سے وہ تمام روحیں باہر نکل آئی تھیں جن کی تدفین یہاں کی گئی تھی اور ان میں سے ایک نے کہا۔

''تم لوگ اپنے ہاتھ بلند کر دو۔ اگر ذرا بھی کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی تو گولیوں سے بھون ڈالے جاؤ گے۔''

ہم پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگے، اجنبی چہرے تھے، لیکن سب کے سب مسلح، احسان نے ہاتھ بلند کر دیئے، اہرام سے نکلنے والے سمجھ میں نہیں آئے تھے، وہ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے پستولوں کی نالیں احسان اور اس کے ساتھیوں کی کنپٹیوں پر رکھ دیں۔ پھر ان میں سے ایک نے جو مقامی ہی معلوم ہوتا تھا نہایت چابک دستی سے ان سب کے لباسوں کی تلاشی لے ڈالی، پستول موجود تھے ان کے پاس، لیکن انہیں ایک لمحے کی مہلت نہیں ملی تھی کہ مقابلے کے لئے پستول نکال سکیں، چنانچہ ان کے سارے ہتھیار قبضے میں لے

لئے گئے، اور اس کے بعد تلاشی لینے والے شخص نے اپنی جیب سے آٹومیٹک ہتھکڑیاں نکالیں اور ان سب کو ایک لڑی میں پروتا چلا گیا۔ میری جانب کوئی متوجہ نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ پشت پر کرلئے گئے تھے تاکہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرسکیں۔

میں ساکت کھڑی خواب آلود نگاہوں سے ان بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی...... اور میرے ذہن میں عجیب وغریب خیالات آرہے تھے۔

پھر ہیلی کاپٹر نیچے اتر آیا۔ فاصلہ ہم سے ذرا زیادہ رکھا گیا تھا تاکہ ریت اڑ کر ہمیں گرد آلود نہ کردے۔ پھر بھی ہیلی کاپٹر کے پروں کی ہواؤں سے اڑنے والی ریت نے ہیلی کاپٹر کو اپنے درمیان چھپالیا تھا۔ البتہ جب وزنی ریت چند لمحوں میں دوبارہ بیٹھ گئی تو تین افراد نمودار ہوئے۔ یہ بہترین شخصیت کے مالک تھے۔ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ بدستور اپنی سیٹ پر موجود رہا۔ البتہ اس نے مشین بند کردی تھی۔ آنے والوں نے گہری نگاہوں سے احسان، اس کے ساتھیوں کو اور مجھے دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک مطمئن انداز میں گردن ہلا کر بولا۔

"ان لوگوں کو آپ اپنی گاڑی میں لے جایئے کرنل دانیال۔ میں مس نشاء دانش کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ آپ میں سے چند افراد کو ان کی گاڑی سنبھالنا ہوگی۔ احتیاط سے اسے لے کر ہیڈ کوارٹر پہنچ جایئے...... اور کوئی خاص بات......؟"

"نہیں جناب ویسے اس شخص نے وہی سب کچھ کیا ہے جس کی توقع ہم لوگ رکھتے تھے۔ اس کی یہاں ہونے والی گفتگو بھی ریکارڈ کرلی گئی ہے۔" اہرام سے برآمد ہونے والے شخص نے بتایا۔ وہ تندرست و توانا شخص جو مقامی ہی معلوم ہوتا تھا اور اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا، نرم لہجے میں مجھ سے بولا۔

"آیئے مس نشاء دانش تشریف لایئے۔"

میں نے قدم آگے بڑھائے لیکن لہرا گئی۔ تب اس نے ہمدردانہ انداز میں مجھے سہارا دیا اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ہیلی کاپٹر تک آ گیا۔ ہیلی کاپٹر میں خاصی گنجائش تھی۔ اور وہ یقیناً فوجی ہیلی کاپٹر تھا۔ مجھے اس میں سوار کرایا گیا، وہ شخص میرے برابر بیٹھ گیا۔ اور ان میں سے ایک آگے پائلٹ کے ساتھ...... تیسرا آدمی مصری زبان میں ان لوگوں سے کچھ کہہ کر دوسرے افراد کی جانب چلا گیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا دروازہ بند ہوا اور پائلٹ نے چند لمحات کے بعد اسے فضا میں بلند کرلیا۔ میرے نزدیک بیٹھے ہوئے شخص نے مقامی زبان میں پائلٹ کو بھی کچھ ہدایات دی تھیں اور پھر اطمینان سے سیٹ سے پشت ٹکالی تھی۔ میں دم بخود بیٹھی ہوئی تھی۔

درحقیقت موت مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ بہت عرصے سے یہی ہورہا تھا۔ ایک لمحہ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی تھی کہ دوسرے لمحے کیا ہوگا۔ ابھی ابھی زندگی ختم ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ احسان جیسے درندہ صفت کے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہی کرتا مگر اچانک پانسہ پلٹ گیا تھا۔ میں بچ گئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ نہ جانے کیسے ہوگیا۔

ہیلی کاپٹر کا سفر جاری رہا۔ پھر وہ ایک بے حد وسیع جگہ اتر گیا۔ سرسبز وشاداب میدان تھا جس کے درمیان ہیلی کاپٹر کا ہیلی پیڈ بنا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ جگہ جگہ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ پہلے وہ لوگ اترے اس کے بعد اس ہمدرد شخص نے مجھے سہارا دیا اور نیچے اتارا اور اسی نرم و مشفق لہجے میں بولا۔

"آپ خود کو سنبھال لیں مس نشاء دانش۔ آپ بالکل محفوظ ہیں مطمئن رہیں کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کرسکے گا۔"

"بہت شکریہ جناب!" میں نے حواس مجتمع کرکے کہا۔ ایک کار اسٹارٹ ہوکر ہیلی پیڈ کے قریب آ گئی۔ مجھ سے اس کار میں بیٹھنے کے لئے کہا گیا اور میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ ڈرائیور کے ساتھ وہ دوسرا

آدمی بیٹھ گیا جو ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پھر کار اسٹارٹ ہوکر چل پڑی اور کوئی بیس منٹ تک اس کا سفر جاری رہا۔ البتہ راستوں سے گزرتے ہوئے میں نے یہ ضروری معلوم کرلیا کہ میں اس وقت قاہرہ میں ہوں۔

اس بار بھی ایک وسیع وعریض عمارت میں مجھے لایا گیا تھا۔ یہاں باوردی افراد کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بھی پولیس ہیڈ کوارٹر ہے۔ میرا رہبر مجھے ساتھ لیئے ہوئے مختلف راستوں سے گزر کر ایک کمرے میں آ گیا، جہاں آرام دہ نشستیں لگی ہوئی تھیں۔

"آپ یہاں بیٹھیں خاتون...... ابھی آپ کے سفارت خانے......" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے سے کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔ سب سے آگے عسکری تھا۔ جو بے اختیار میری طرف لپکا اور اس نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر بے صبری سے بولا۔

"تم ٹھیک تو ہو نشا۔" "اوہ میں تو تمہاری زندگی سے مایوس ہوگیا تھا۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

"یہ ہمارے سفارت خانے کے ذمہ دار اراکین ہیں۔ مسٹر جاوید عالی اور مسٹر جمال شاہ۔"

"میں تو جیل میں مس نشا ہارون سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے کچھ طنزیہ الفاظ بھی کہے تھے مجھ سے۔" جمال شاہ نے کہا۔ مجھے یاد آ گیا لیکن طنزیہ الفاظ میں نے نہیں بلکہ اس نے خود کہے تھے۔ البتہ میں نے خاموشی ہی اختیار کی یہی بہتر تھا۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیں مس نشا دانش۔ ہم لوگ ضابطے کی کارروائی کررہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ ضروری امور کی تکمیل میں آپ کو یہاں ایک آدھ دن گزارنا پڑے۔ اس کے بعد آپ کے لئے معقول بندوبست کرلیا جائے گا۔ اور تیاریوں کے بعد آپ کو وطن روانہ کردیں گے۔"

"بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں اجازت دیجئے۔" دونوں نے کہا اور میں نے مضطربانہ انداز میں عسکری کو دیکھا۔

"تم بھی...... عسکری......؟"

"نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" عسکری نے کہا اور میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ وہ دونوں باہر نکل گئے اور میں ایک صوفے پر نڈھال ہوکر نیم دراز ہوگئی۔

"کچھ پیوگی؟؟" عسکری نے پوچھا۔

"مل سکے گا؟"

"میرے خیال میں مل سکے گا۔ میں دیکھتا ہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔ کوئی یہاں آجائے تو ٹھیک ہے۔ خدا کے لئے تم کہیں نہ جاؤ۔"

"بے فکر رہو۔ اب ہم محفوظ ہیں۔ بس یہیں سے دیکھتا ہوں۔" عسکری نے کہا اور اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ صاف ستھرے قیمتی لباس میں ملبوس تھا۔ اور پہلے کی مانند نظر آرہا تھا۔ اس شخص نے واقعی خود کو میرے لئے وقف کردیا تھا۔ اس سے زیادہ شاید ہی کوئی کسی کے لئے کچھ کرسکے اور اس وقت...... میرے خدا...... یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ بس چند ہی لمحات تو رہ گئے تھے اس کے بعد احسان میری گردن دبادیتا...... اور اس کے بعد...... میں دہشت سے سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ پھر بے اختیار اٹھی اور دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ سخت وحشت کا شکار تھی۔

عسکری کچھ فاصلے پر ایک شخص سے بات کررہا تھا۔ پھر وہ دروازے کی طرف پلٹ پڑا میں بھی اپنی جگہ آ بیٹھی تھی۔ وہ اندر آکر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ چند لمحات بالکل خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے میں موت کے منہ سے نکل کر آئی ہوں۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں اور تمہیں اس بارے میں تفصیلات بتانا چاہتا ہوں یہ اچھی بات ہے کہ ہمیں

دوسروں کے سامنے پیش ہونے سے قبل کچھ تنہائی کے لمحات مل گئے ہیں۔"

"تفصیلات......؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جیل میں تمہیں معلومات فراہم کرنے کے بعد میری رہائی ہوگئی تھی۔"

"مگر اس میں تو چار دن باقی تھے۔"

"چار دن کے بعد ہی کی بات کررہا ہوں۔"

"بعد میں تو تم مجھے نظر نہیں آئے تھے۔"

"تم پھر دھتکار دیتیں۔ فائدہ نہیں تھا۔ خیر...... وہاں سے نکل کر پھر اپنے تحفظ میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد تمہارے بارے میں علم ہوا کہ جیل سے فرار ہوگئی ہو۔ میں بے چین ہوگیا۔ یہ تو جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے تم نے نہ کیا ہوگا۔ پریشان پھر رہا تھا کہ روشاق نے پھر مجھ سے ملاقات کی۔"

"اوہ...... وہ ملا تھا؟"

"اسی نادیدہ شکل میں۔ اس نے مجھے ایک کیسٹ دیا اور مجھے میرے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں بتایا۔ کیسٹ میں وہ گفتگو ریکارڈ تھی جو خاتون زبونا اور اس کے بیٹوں نے تم سے کی تھی اور جس میں انہوں نے امیر غیری کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس میں سے آگے کی گفتگو بھی تھی۔ جس میں خاتون نے احسان کو ریگزار تماسرا میں تمہارے وطن کی ہدایات دی تھیں۔ پورے پروگرام کی تفصیل تھی۔ روشاق نے مجھے حکم دیا کہ یہ کیسٹ لے کر اپنے وطن کے سفارت خانے پہنچ جاؤں۔ وہاں جاوید عالی سے ملوں اور یہ کیسٹ اس کے حوالے کردوں۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا اور خدا کا شکر ہے کہ تمہیں بروقت بچالیا گیا۔"

"روشاق!" میرے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ پھر میں نے چونک کر عسکری سے پوچھا۔

"سفارت خانے کو تم نے اپنے بارے میں کیا بتایا؟"

"یہی کہ خاتون زبونا کا قیدی تھا۔ میں اپنے ہوٹل میں مقیم تھا اور وطن جانے کے لئے تیار تھا کہ مجھے کافی میں خواب آور دوا دے دی گئی اور میں ہوش میں نہ رہا۔ پھر مجھے اسکندریہ میں خاتون زبونا کے محل میں ہوش آیا تھا جہاں مجھے میری قید کی وجہ بھی نہیں بتائی گئی تھی۔ اس وقت سے میں وہیں قیدی تھا۔ لیکن محل میں ایک خادمہ سے گٹھ جوڑ کرکے میں نے کچھ آسانیاں حاصل کرلیں۔ خادمہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ موقع ملنے پر مجھے اس قید سے رہائی دلائے گی۔ اسی نے مجھے حالات سے باخبر رکھا تھا اور بتایا تھا کہ خاتون زبونا امیر غیری کی دولت حاصل کرنے کے لئے ایک سازش کررہی ہے جس میں اس کے دونوں بیٹے بھی شامل ہیں۔ یہ خبر بھی مجھے خادمہ نے دی تھی کہ ایک لڑکی کو لایا گیا ہے جس پر غیری کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اسی نیک خادمہ کی مدد سے مجھے ٹیپ ریکارڈر حاصل ہوا اور میں نے بڑے موقع سے ان لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کی اور پھر صحیح وقت پر وہاں سے نکل بھاگا اور قاہرہ پہنچ گیا۔"

"میرے خدا...... یہ کہانی تو فرضی ہے نا......؟"

"ظاہر ہے۔" عسکری مسکرا پڑا۔

"یہی ایک طریقہ تھا۔ بچنے کا ورنہ میں تو صحیح معنوں میں مفرور ہوں۔"

"اس خادمہ کا تو کوئی وجود نہیں۔"

"ہاں وہ بھی میرے ذہن کی تخلیق ہے۔"

"اور اگر تفتیش میں اس کے بارے میں پوچھ لیا گیا تو......؟"

"کوئی بھی فرضی نام لے دوں گا۔"

"طے کرلیا ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"عزمہ کیسا نام ہے۔"

"اچھا ہے۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔"

"مگر عزمہ ملے گی کہاں؟ ہوسکتا ہے یہ لوگ اسے بھی شامل تفتیش کرنا چاہیں۔" میں نے کہا۔

"اس وقت صورت حال خاتون زبونا کے خلاف ہوچکی ہے۔ وہ نہ ملی تو اس کی لاش بھی تلاش کی جائے گی۔" عسکری ہنس کر بولا۔

"اور جب اس نام کا وجود ہی نہیں ملے گا تو......"

"تب یقیناً خادمہ نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہوگا۔ ویسے شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جو ثبوت اس وقت پولیس کو حاصل ہوچکے ہیں اس کے بعد اتنی گہری تفتیش کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ ویسے یقیناً انہوں نے تمہیں ریگزار تماسرا سے حاصل کیا ہوگا؟"

"ہاں۔"

"یہ بات میرے علم میں آگئی تھی کہ وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے اب بھی خطرہ ہے عسکری۔"

"کیا؟"

"خاتون زبونا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ پولیس کمشنر تک اس کے لئے سازش میں شریک ہوگیا تھا۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"معاملہ سفارت خانے کا ہے اور فوجی حکام اس کیس میں ملوث کئے گئے ہیں۔ سفارت خانے نے اس کی خصوصی درخواست کی تھی اور چونکہ پولیس کمشنر کا تذکرہ کیسٹ میں موجود تھا اس لئے فوجی حکام سفارت خانے کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ تماسرا میں کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ ویسے تھوڑی سی تفصیل مجھے بتاؤ۔ میں نے تو کوشش کی تھی کہ اس مہم جوئی میں مجھے شریک کرلیا جائے۔ لیکن یہ نہ ہوسکا کیونکہ معاملہ اونچی سطح پر چلنے کا تھا۔"

"میں تو موت کے قریب پہنچ چکی تھی عسکری۔ یوں سمجھ لو بس کچھ دیر اور گزر جاتی تو...... لیکن نہیں۔ وہ لوگ مقبرے میں موجود تھے۔" میں نے عسکری کو پوری تفصیل بتائی اور اس نے مسرور لہجے میں کہا۔

"گویا وہاں انہوں نے مکمل بندوبست کرلیا تھا۔" یہ بات مزید مستحکم ہوگئی احسان نے اس کیسٹ کی پوری تصدیق کردی۔

"اب کیا ہوگا عسکری؟"

"میرا خیال ہے اب وطن واپسی ممکن ہوجائے گی۔" عسکری نے کہا اور میرے دل میں ایک حسرت سی بیدار ہوگئی۔

"مجھے امید نہیں ہے۔"

"کیوں؟" وہ چونک کر بولا۔

"اب بھی یہ سوال کررہے ہو۔ اب تو تم میرے بارے میں اتنا ہی جانتے ہو جتنا میں۔ میرے بارے میں تو یہ پیش گوئی ہے کہ مجھے یہاں ایک مخصوص وقت گزارنا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی طرح گزرے۔ خود روشاق کا بھی یہی کہنا ہے۔ روشاق جو میری مدد کررہا ہے بلکہ اب تو اس پیش گوئی کی تصدیق بھی ہورہی ہے بس انسانی فطرت سمجھو ورنہ تماسرا میں بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ لوگ مجھے مار نہیں سکتے۔ میں سب کے کہنے کے مطابق بچ جاتی۔ کسی نہ کسی طرح بچ جاتی۔ کیونکہ روحیں میری محافظ و نگراں ہیں اور دیکھ لو میں بچ گئی۔ بچ تو گئی چاہے کیسے بھی ہو ہاں اس طرح زبونا ضرور کیفر کردار تک پہنچ جائے گی۔ وہ دونوں بوڑھے بھی یہی کہتے تھے۔"

"وسکن ڈیزل اور عدنان شائی؟"

"ہاں۔ جیل میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ تو میری داستان ہی نہیں ہے۔ کوئی میرا بال بیکا نہیں کرسکے گا۔ دیکھ لو یہی ہورہا ہے۔"

"میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں نشا۔"

"ضرور کہو......"

"دیکھو۔ ہر کہانی کا ایک اختتام ہوتا ہے اور یہ اختتام ہمارے علم میں نہیں ہوتا۔ ہم کچھ سوچتے ہیں کہانی کہیں اور ختم ہوتی ہے لیکن ختم ہوجاتی ہے۔ تم پریشان ہونے کے بجائے کہانی کے اختتام کا انتظار کرو۔ اس سے پہلے سوچو ہی نہیں کہ اختتام کیا ہوگا۔"

"یقین کرو یہ سب سے بہتر مشورہ ہے۔ آج کے بعد ہمیشہ یہی کوشش کروں گی اپنا دل پتھر کرلوں گی۔

حالات کیسے ہی ہوں ان سے تعاون کروں گی۔ جب اپنے بس میں کچھ نہیں ہے تو پھر کسی بات پر خوش یا کسی بات سے خوفزدہ ہونا بے سود ہے لیکن تم سے بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا......؟ کہو ضرور کہو......"

"وطن واپسی کا موقع مل جائے تو ضرور چلے جانا۔ بس عسکری اتنے احسانات کر چکے ہو مجھ پر کہ میں انہیں اتارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اب اور کیا کرو گے میرے لئے۔ میں وطن جانا چاہتی ہوں لیکن ہو سکتا ہے یہ میری تقدیر میں نہ ہو۔ وہاں تمہارے ساتھ ہی جانے کی خواہش مند ہوں لیکن اگر نہ جا سکوں تو میرے لئے مزید مشکلات مول نہ لینا۔ مجھ سے وعدہ کرو۔"

"سوری نشا۔ کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا تم سے......"

"کیوں؟"

"میں تمہارے بغیر نہیں جا سکتا اور پھر تم دیکھو۔ کتنی جگہ تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑی ہے اور نجانے آئندہ کہاں تمہیں میری ضرورت پیش آ جائے۔"

"مان لو میری بات عسکری......!"

"میں مجبور ہوں نشا۔ ہاں ایک وعدہ کر سکتا ہوں تم سے......"

"کیا؟"

"تمہیں خیریت کے ساتھ سر زمین وطن پہنچا دوں۔ اپنے شہر کے ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد دوبارہ کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ یہ وعدہ اٹل ہے میرا......!"

میں اسے شکست خوردہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

اورنج جوس کا جگ اور دو گلاس لائے گئے اور ہم جوس پیتے رہے۔ شام کو پانچ بجے چند پولیس افسران ہمیں لینے آ گئے اور ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ ایک بہت بڑے ہال کے سامنے بے شمار لوگ موجود تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی۔ بہت سے لوگ کیمرے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے۔ بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ پریس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ تصویریں اتارنے لگے۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے سوالات بھی کرنا چاہے لیکن مجھے ساتھ لانے والوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"سوری جینٹلمین۔ آپ لوگوں کو جتنا بتایا گیا ہے صرف اسی پر قناعت کریں ابھی کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جائے گا آپ کو۔ سوری، راستہ چھوڑ دیجئے۔"

ہم لوگ اندر داخل ہو گئے۔ بے شمار میزیں لگی ہوئی تھیں ان پر افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سمت خاتون زبونا، عشان اور فیصل تھے ان کے نزدیک احسان اور پولیس کمشنر بھی تھا۔ اس وقت کسی کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں نہیں تھیں۔ میں نے فوجی وردی میں ملبوس اعلیٰ عہدیداران کو بھی دیکھا اور پولیس کے حکام کو بھی۔ میرے اور عسکری کے لئے بھی نشستیں تھیں۔ میرے وطن کے سفارت خانے کے تین افراد بھی وہاں موجود تھے۔ ہال میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"آپ لوگ تشریف رکھئے۔" کسی میز سے مائیک پر آواز ابھری۔

"یہاں بائیں طرف۔" ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر اچانک ایک آواز ابھری۔

"تعارف ہو جائے۔ خوش قسمتی سے میں آپ سے متعارف ہوں۔ یہ میرے بیٹے عشان اور فیصل ہیں اور میں نہایت صاف گوئی سے تمہیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں۔ کائنات میں دولت ایک ایسی شے ہے...... امیر غیبری کے قاتل ہم ہیں۔"

اس تمام گفتگو کی ریکارڈنگ تھی جو خاتون زبونا نے مجھے اپنا کارنامہ سناتے ہوئے کی تھی، نہایت صاف اور ناقابل تردید۔ پوری گفتگو سنائی دی تھی۔ پھر وقفہ آ گیا۔ اس کے بعد دوبارہ کھرکھراہٹ ابھری اور پھر احسان کی آواز سنائی دی۔ (جاری ہے)

وجود جنات

بلقیس خان۔ پشاور

کمرے میں بزرگ کے قرآنی ایات کے ورد سے اچانک کمرے میں فرش سے دھواں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے ایک خوبرو نوجوان کی شکل اختیار کرلی اور وہ بولا۔ اپنی من مانی نہیں بلکہ......

یہ کہانی ان لوگوں کیلئے اہم ہے جو ماورائی مخلوق اور جنات کے وجود کو مانتے نہیں۔ سبق آموز کہانی

اکثر مجھے میرے دوست احباب اور گھر والے باتوں باتوں میں بتاتے تھے کہ جن، پری، بھوت پریت اور دوسری ان دیکھی مخلوقات کا وجود دنیا میں موجود ہے، اور یہ غیبی مخلوقات بعض اوقات انسان کو نقصان پہنچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اور میں ایسی باتیں کرنے والے لوگوں کو دیکھ کر تمسخر سے مسکراتی اور کہتی اپنے اندر کا ڈر چھپانے کے لئے ایسے ڈرپوک انسان کس غیبی شے جو مادی وجود کا حامل ہی نہیں کام نام لے کر ان بے چاروں پر الزام لگاتے ہیں۔ میں سوچتی کہ اگر انسان اور حیوان کے علاوہ بھی اس دنیا میں کوئی وجود ہیں تو ہماری نظر اس کے وجود سے کیوں نہیں ٹکراتی؟ کیوں ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسی بے سروپا باتوں سے ان کی موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن میرا یقین ہے کہ جب تک میں ان

غیر مرئی وجود کو نہ دیکھ لوں تب تک میں ان پر یقین نہیں کروں گی۔"

اور پھر اس کے بعد میرا ذہنی امتحان شروع ہوتا گیا۔ ایک ایسا امتحان جس کے لئے کبھی میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا بلکہ تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔

میرے اندر ایک عجیب بے حسی پیدا ہونے لگی مزاج میں بیزاری طبیعت کا خاصہ بنتی جارہی تھی جس کی وجہ سے میرے تمام گھر والے ڈسٹرب اور غصہ کرنے لگے تھے ہروقت میرا اکتایا ہوا رویہ سب کے لئے ہر کسی کو حیرت کا باعث بنا۔ میں تو ہر بڑی بات کو ین کر دوسرے کان سے اڑا دیا کرتی تھی۔ اب ہر چھوٹی سی چھوٹی بات پر اعتراض کرنے لگی۔ میری قریب ترین سہلیاں میری اس حرکات کو بری طرح سے محسوس کررہی تھی۔ ہر طرف سے یہ آوازیں آنے لگیں۔

"صدف! تم ایسی تو نہ تھی؟"

کیا ہوا ہے تمہیں؟

اتنا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے؟

کس بات پر ناراض ہو؟

اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟

پھر میں سوچنے لگتی "یہ سب کچھ آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہورہا ہے؟"

راتوں کو سونے سے ڈر لگنے لگا اگر آنکھ لگی تو وہی منحوس خواب دوبارہ سے شروع ہوجائیں گے دن کو سارا دن عجیب طرح کی بے چینی رہتی۔ رات کی نیندیں جیسے ڈراؤنے خوابوں نے اڑن چھو کردی تھی۔ وہی خواب جنہوں نے میرے اندر عجیب سی بے چینی پیدا کردی تھی۔ وہ خواب جس میں میں خود کو انجان جگہ پر دیکھتی۔ اپنے علاوہ کسی عجیب قسم کی مخلوق کو دیکھتی۔ وہ مخلوق عجیب الخلقت ہوتی اور وہ مخلوق جسموں میں مجھ سے بھاری اور قد میں اونچی ہوتی تھی کبھی پہاڑوں پر سے ان مخلوق کو اپنی طرف اونچائی پر چڑھتے ہوئے دیکھتی۔ جو اپنے لمبے لمبے اور کالے ہاتھوں سے بلاتے میں یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر اٹھ جاتی کبھی جنگلوں میں عجیب قسم کی مخلوق کے گھیرے میں خود کو پاتی۔ اور ان سے بھاگ رہی ہوتی۔ وہ مخلوق میرے پیچھے بھاگ رہی ہوتی اور میرے پیچھے عجیب زبان میں باتیں کرتی۔ کبھی میں خواب میں، میں خود کو زمین کی تہہ میں دیکھتی اور ڈھیر سارے سانپ میرے اردگرد منڈلا رہے ہوتے اور پھر دھیرے دھیرے وہ سانپ انسانی قالب میں آجاتے اور میں دیوانہ وار بھاگ کھڑی ہوتی۔

کبھی دیکھتی کہ کوئی انجانی مخلوق مجھے آوازیں دے رہی ہوتی اور وہ آوازیں ہوتی "آؤ ہماری دنیا میں آؤ ہم دل کی گہرائی سے تمہیں اپنی دنیا میں خوش آمدید کہیں گے۔ تمہیں اپنی دنیا کی سیر کرائیں گے اور تمہیں دکھائیں گے کہ ہماری دنیا کے نافرمانوں کو کیسی کیسی سزائیں دی جاتی ہیں۔"

یہ وہ خواب تھے جو اکثر وقفے وقفے سے مجھے نظر آتے۔ اور میں خوف کے مارے ساری رات جاگتی رہتی۔ کسی سے کہہ کر خود کا تماشہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔

اب میں اکثر ان کے بارے میں سوچنے لگی۔" جو ہماری دنیا کے بجائے دوسری دنیا کے مخلوق تھے ہماری دنیا کے لوگ انہیں قوم جنات، کہہ کر ان کے وجود کے ماننے والے ہیں۔" سوچنے سے خود کو جتنا روکتی اتنی ہی شدت سے ان باتوں کو سوچتی اور میرے اندر غصے کا مادہ پروان چڑھتا۔ اور اگر کوئی نرمی سے سمجھانا چاہتا میں انتہائی ترشی سے نا سمجھتے ہوئے اسے ہی ڈانٹ دیتی۔ اور اپنا سارا غصہ ان بے چاروں پر نکال دیتی۔

اس عرصے میں مجھے ایسے لگا کہ جیسے مجھ میں ایک انجانی طاقت بھر گئی ہے اور میں اس طاقت کے سامنے بالکل بے بس ہوں۔ اور یہی انجانی طاقت مجھے میری شخصیت کے بالکل الٹ ثابت کرنے پر تلی ہے۔

میری یہ ساری کیفیات ڈراؤنے خواب آنا اور اپنے آپ میں مگن رہنا مجھے اندر سے بالکل کھوکھلا کرنے لگے میں اس حالت کو سب پر عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ میں اس طاقت سے لڑنا چاہتی تھی اور اپنی پراسرار شخصیت اپنے گھر والوں پر ظاہر کرکے دنیا

کا آٹھواں عجوبہ تو بالکل بھی بننا نہیں چاہتی تھی لیکن میری فیملی حیران و پریشان میرے معمولات نوٹ کرکے میری ان تبدیلیوں کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ لیکن سب صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے لیکن اب پھر کچھ عرصے سے خوابوں میں پہلے کی طرح گھر گئی سب کچھ پہلے جیسے تھا۔ مگر اب مجھے اپنے اردگرد ایک نامانوس وجود کا احساس اٹھتے بیٹھتے ہونے لگا تھا۔

"ایسا لگتا جیسے میں کوئی نادیدہ قوت کے نظر میں آگئی ہوں، کیونکہ میں جہاں بھی جاتی کوئی انجانا وجود میرا پیچھا کرتا۔ کسی کو تو محسوس نہیں ہوتا۔ مگر مجھے ضرور محسوس ہوتا۔"

یہ خیال ایک بجلی کے جھٹکے سے بھی تیز میرے دماغ کا حصہ بنتا تھا۔ اور پھر قرآن مجید کی کچھ آیتوں کا ترجمہ بار بار میرے دماغ میں آنے لگا۔ جس میں جنات کا ذکر بہت واضح الفاظ میں کیا گیا ہے۔

پھر میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی۔ کہ کہیں گڑبڑ ضرور کی ہے میں نے۔ مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیا کیا ہے میں نے، جس سے جنات کی نظر مجھ پہ اور میرے خیالات پر پڑی؟

بہت سوچنے کے بعد مجھے اپنے وہی الفاظ کے سوا کچھ یاد نہ آتا جب میں جنات کی باتیں سن کر کہتی مگر لاکھ سوچنے کے باوجود بھی اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکتی اور بغیر دماغ میں آئے میں اس پر کیسے یقین کرلیتی کالج کی اسٹڈی کافی متاثر ہورہی تھی فرینڈز ایک طرف حیران تھیں اور میرا موڈ دیکھ کر انہوں نے بات تک کرنا چھوڑ دی تھی۔ ٹیچرالگ غصہ کرتیں گھر والے خاموش تھے کچھ بھی بولنے سے معذرت کرتے تھے مجھے سب نے یکسر نظر انداز کیا ہوا تھا مجھ سے الاتعلق اور ہی تھی۔ میری کیفیت پہلے خوابوں سے ڈر جس کی وجہ سے سونا محال لگتا تھا اور اب وہ نادیدہ احساس ہر اٹھتے جاگتے ہونے لگا سرسراہٹ اور ہوا کے سائیں سائیں سے خوف محسوس ہونے لگا۔

خود کو حرکت کی وجہ سے اکیلا کرلیا تھا کوئی بات بھی کرتا تو میں نا چاہتے ہوئے بھی اسے کھری کھری سنا دیتی۔ اگر کوئی اس بدلے رویہ کی وجہ پوچھتا اور میں اسے چاہتے ہوئے بھی بتا نا پاتی۔

اس سچویشن سے تنگ آکر اپنا مسئلہ خدا کے حضور پیش کردیا دن رات عبادت کرنے لگی، ہروقت وظائف پڑھتی رہتی اور خدا سے دعائیں مانگنے لگی، اب میرا دل مطمئن ہونے لگا تھا۔ عبادت میں یکسوئی اپنے اندر کے خوف کو مٹاتا چلا گیا مگر پھر بھی وہی ایک احساس باقی رہ گیا جو ہروقت میرے ساتھ ہوتا جیسے کوئی انجانا وجود ہروقت میرے آس پاس رہتا ہو۔ اور پھر میں تو ایک لڑکی تھی اپنے اردگرد کسی کے ہونے کا احساس بہت زیادہ پریشان کرتا تھا۔

ایک بار پھر میں نے اپنی یادداشت کو یکجا کیا مجھے ایسے حالات میں چار ماہ ہوگئے اس طرح تو مجھے عادی ہونا چاہئے تھا، مگر سب کی لاتعلقی اور میرا مزاج ابھی تک سمجھ کی ڈوری سے آزاد تھا۔

اپنے مزاج میں تبدیلی لانے کے لئے امی ابو سے اجازت لے کر دور رہنے والے چچا جان کے گھر چلی گئی۔

فرید چچا ابو کے سب سے چھوٹے بھائی تھے، اور اپنی نوکری کی وجہ سے ہم سے دور رہتے تھے۔ بچپن میں فرید چچا مجھ پر بہت جان چھڑکتے تھے اور اسی وجہ سے وہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے ان کی بیٹیاں میری ہم عمر تھی۔ اسی لئے ان کی دوستی کی بنا پر بھائی مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا خود کو نئی جگہ نئے گھر پاکر میں سوچ رہی تھی کہ اب اس نادیدہ وجود سے پیچھا چھوٹ جائے گا جس کا پل پل احساس مجھے مار دیتا تھا، جو سب سے الگ کرنے کا سبب بنا مگر یہاں بھی وہی کچھ ہونے لگا تھا جس سے بھاگ کر میں نے اس شہر میں پناہ لی تھی۔

میرا ہروقت کھویا کھویا رہنا اور کسی کو صحیح جواب نہ دینا چچا کی بیٹیوں نے بھی میرے رویہ کی وجہ سے مجھے نظر انداز کردیا، لیکن چچا فرید کو میرا کھویا اور بیزار لہجہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ وہ پہلے پیار سے اس بدلے ہوئے

روپے کی وجہ پوچھتے رہے۔ لیکن اس کے ہر بار پوچھنے پر پتہ نہیں کیوں میرے زبان پر قفل سے لگ جاتے میں چاہ کر بھی کچھ بتانہ پاتی۔ میری مسلسل خاموشی کو دیکھ کر چچا فرید بھی چپ ہوگئے اور میں ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

بھرپور کوشش سے اپنا دھیان نادیدہ وجود سے عارضی طور پر ہٹا کر زندگی کی رنگینیوں کے رنگ چرانے بیٹھی اور حتیٰ الامکان پہلے والا رویہ اپنایا جس سے سب کے چہروں پر سوالیہ نشان کی جگہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

مگر چچا جان پریشان تھے انہوں نے فون کر کے گھر والوں سے میرے رویہ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا جس کے بدلے میں امی ابو، بہن، بھائیوں نے ساری معلومات دے دیں۔ اور سب نے مجھ سے کافی شکایات کا شکوہ بھی کیا لیکن میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ سب میرے لئے پریشان ہیں۔

چچا جان نے مجھے شام کے وقت اسٹڈی روم میں بلوایا اور مجھ سے میرے رویہ کے متعلق بہت ہی پیار سے پوچھا اور میں نے حیرت انگیز طور پر چچا جان کو وہ سب بتایا جس سے مجھے کوئی انجانی طاقت ہمیشہ روک دیتی تھی۔ اور ہر وقت خوف میں گھری رہتی ایک خوف سا ہر وقت میرے اردگرد چھایا رہتا وہی خواب، خوف ناک چہرے بھیانک آوازیں اور سب سے بڑھ کر وہ نادیدہ وجود کا احساس۔

سب کچھ بغیر روک ٹوک کے میں نے بہتے آنسوؤں میں کہہ دیا۔ چچا جان میری ساری باتیں بڑی دل جمعی سے سنتے رہے۔ اور میرے چپ ہونے پر بولے۔ ”بیٹا کوئی ایسا واقعہ جس کے بعد تمہیں محسوس ہوا ہو کہ کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔“

”چچا جان میں نے لاکھ کوشش کی کہ یاد آجائے مگر میری ہر کوشش ناکام ہوجاتی ہے۔“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہ رکھو اپنے پاس، اور یاد کرنے کی کوشش کرو شاباش تمہیں ضرور یاد آجائے گا۔“ چچا جان نے ایک تعویز میرے ہاتھ پر رکھ کر شفقت سے بولے۔ اور میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

تعویز پہننا مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا بالآخر میں نے اپنے گلے میں وہ تعویز پہن لیا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ چچا جان ضرور میری پرابلم کو حل کردیں گے۔ جبھی تو انہوں نے مجھے روشنی کا راستہ دکھایا ہے۔

رات کی دبیز تاریکی ہر سو پھیل گئی آسمان سیاہی کے لبادے میں ڈھل گیا۔ روشن ستارے موتیوں کی مانند چمکنے لگے، اور میں اکیلی کمرے میں بیٹھ کر اپنی یادداشت دہرانے لگی۔ اور شاید تعویز کا اثر تھا۔ کہ میرے دماغ میں ٹرین والا واقع آہی گیا، میں بہت حیران ہوئی کہ پہلے یہ واقعہ مجھے یاد کیوں نہیں تھا۔

جب میں پہلے اپنے ذہن پر ضرور دیتی۔ تو ہر چیز دھندلی سی تصویر کی مانند ذہن کی اسکرین پر رک جاتی۔ اور اسی وجہ سے الجھ کر میں سوچنا ترک کردیتی وہ واقعہ یوں تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں، میں اپنے اکلوتے ماموں جان کے گھر گئی تھی۔ واپسی پر میں نے بہت اصرار کر کے ماموں جان اپنے ساتھ آنے سے روک دیا۔ کیونکہ مجھے احساس تھا کہ ماموں سو بکھیروں میں الجھے ہوئے ہیں میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے انکا وقت ضائع ہو، لیکن ماموں جان نے اسٹیشن پر ایک عورت سے کہہ دیا کہ ”بچی کا خیال کرنا، آپ ہی کے شہر میں اترے گی۔“ اور ڈھیر ساری نصیحتوں کے ساتھ مجھے روانہ کردیا۔

میری کھڑکی والی سیٹ تھی لہٰذا وہ باہر کے نظاروں میں بری طرح مگن تھی سامنے کی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر بوڑھا براجمان تھا جو نیند سے شغل فرما رہا تھا۔ اس لئے وہ بے خبر تھا کبھی کبھی اس کا سر نیند کی وجہ سے کسی ایک طرف کو ڈھلک کر ٹیڑھا ہوجاتا اور میری نظر اس پر پڑتی۔ تو بے ساختہ مسکرا دیتی اپنا دھیان پوری طرح باہر کے دلفریب اور سرسبز و شاداب نظاروں میں لگائی ہوئی تھی کہ خاتون کی آواز پر چونک پڑی۔

وہ بیٹھے بیٹھے بور ہوگئی تھی میں نے اندازہ لگایا کہ

وہ مجھ سے کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ وہ اچھے نقوش والی خاتون تھی پہلے تو ادھر ادھر کی بات چیت کرتی رہی پھر اچانک اپنا موضوع جنات کی طرف لے گئی۔ اس موضوع سے مجھے خداواسطے کا بیر تھا پہلے تو وہ اپنے گاؤں کے چھوٹے موٹے واقعات بیان کرنے لگی اور پھر ایک لڑکی کا قصہ سنانا شروع کردیا جس پر ایک جن عاشق ہوگیا تھا اور اس کے ہونے والے شوہر کو جن نے موت سے ہمکنار کردیا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی اور سامنے والے شخص نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور پچھی آنکھوں سے اسٹیشن کا نام دیکھتے ہی گھبرا گیا شاید وہ ایک اسٹیشن آگے پہنچ گیا تھا۔

اب ہماری گفتگو کا رخ اسٹیشن کی ویرانی اور بدحالی کی طرف گھوم گیا تھا اور ہم دوبارہ بات چیت میں مصروف ہوگئے تھے کہ اچانک ٹرین میں ایک نوجوان چڑھ آیا اس کے کندھے پر چرمی بیگ لٹکا ہوا تھا، وہ نوجوان بہت خوبرو تھا۔ جیسے کوئی شہزادہ ہو وہ بالکل میرے سامنے والی سیٹ پر ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس کا صحت مند وجود قابل رشک تھا خوبصورت صاف ستھرا چہرہ کانوں تک خوبصورت بال اور گھنی مونچھیں اس کے وقار میں بے پناہ اضافہ کررہی تھی کپڑے اس نے بڑے خوبصورت پہن رکھے تھے۔

میں نے ایک پل میں اس کا ایکسرے کرلیا اور دوبارہ خاتون کی طرف متوجہ ہوئی ٹرین دوبارہ چل پڑی۔

عورت نے دوبارہ جن اور لڑکی کا قصہ شروع کردیا۔ اس بار مجھے غصہ آیا خاتون سے صاف کہہ دیا۔ ”یہ سب جھوٹ ہے۔“ بکواس ہے۔ وہ لڑکی ضرور ڈھونگ کررہی ہوگی اور جن ون کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہم لوگوں کے ذہنی اور فرسودہ خیالات ہوتے ہیں جو دوسروں پر رعب جمانے اندیکھی وجود کا نام لے لیتے ہیں اور ہاں اگر میرے ساتھ ایسا ہوتا تو ضرور یقین کرلیتی۔“

میرا رخ پوری طرح خاتون کی طرف تھا سامنے بیٹھا وہ خوبرو نوجوان میری بات سن کر آنکھیں کھول کر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھا اور غور سے ہماری گفتگو سننے لگا۔

”اگر یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا تو تم ہوش کھو بیٹھتی یا پھر پوری پاگل ہوجاتی میں نے اپنی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ جب جن کا اثر اس پر ہوتا تو وہ مردوں کی طرح بھاری آواز میں بات چیت کرتی وہ آواز اتنی بھیانک ہوتی کہ کانوں کے تو جیسے پردے پھاڑ دے، اور وہ لڑکی اتنی دھان پان سی تھی کہ بمشکل ایسی آواز نکال سکے، اور ہاں وہ جن تو لڑکی سے ناراض تھا۔ اس لئے اس پر اپنا عذاب مسلط کیا ہوا تھا۔ دراصل جن جب بھی اس سے ملنے آتا وہ لڑکی چیختی چلاتی اور ڈر جاتی اور پھر اس نے اپنے منگیتر سے مشورہ کر کے جن کو ختم کرنے کے لئے کوئی سازش بھی تیار کی تھی۔ مگر جن نے اس کے منگیتر کو ماردیا۔ اور اس کے وجود پر قابض ہوگیا۔“

”جوں بھی ہو، مجھے بالکل بھی یقین نہیں ہے اور اس قسم کے قصے کہانیوں سے ہار میگزین بھرے پڑے ہیں۔ جنات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے بہرحال اگر میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ ہوجائے تب میں یقین کرسکتی ہوں۔“

”ارے اللہ نہ کرے تجھے کبھی کوئی جن دکھائی دے استغفار پڑھ کبھی کبھی مذاق میں بھی کہی ہوئی باتیں سچ ثابت ہوجاتی ہیں۔“ عورت کی بات سن کر میرے دل نے اس کی دقیانوسی سوچ پر قہقہے لگانے کو جی چاہا۔

خیر ہم دونوں میں خاموشی چھا گئی اور میں کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی تیز ہوا سے میرے بال اڑنے لگے، اور میں بار بار بالوں کو سمیٹنے لگی مگر میرے بال سمٹ ہی نہیں رہے تھے، اچانک ہی کسی کی تیز نگاہوں کی تپش میرے وجود کو بے چین کرگئی میں نے سامنے دیکھا تو نگاہ اس نوجوان پر پڑی جو سامنے بیٹھ کر پرسوچ نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا اور اس کے لبوں پر تمسخر اڑاتی مسکان بکھری پڑی تھی۔ وہ مسکان بالکل ویسی تھی جیسی جن بھوت کے واقعات سن کر میرے لبوں پر ہوتی تھی۔

میرا دیکھنا تھا کہ اس نوجوان نے پھر اپنا چہرہ

دوسری طرف موڑ لیا۔ اس کے انداز سے میں بہت حیران ہوئی اور پریشان بھی مگر خیالات کو جھٹک کر چہرہ دوبارہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔

میرے بال ہوا کے دوش پر بکھر رہے تھے پھر میں نے بیگ سے پونی نکالی اور اپنے تمام بال سمیٹ کر پونی میں مقید کردیئے جس پر شکوہ نظر سے نوجوان نے مجھ پر نظر ڈالی۔ جیسے وہ مرے بال پونی میں قید کرنے پر خوش نہ ہو۔

اچانک ٹرین جھٹکے سے رک گئی۔ مسافر نیند میں کسمسا کر اٹھ بیٹھے۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ ”ابھی تو ایک ہی بجا ہے۔“ یہ سوچ کر کوفت ہونے لگی۔

آنکھوں میں نیند تھی۔ مگر سونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے موبائل میں ہینڈ فری ڈال کر اس کے ائیر پیس کانوں میں لگادیئے اور آنکھیں نیم وا کرکے گانے سننے لگی۔

وہ نوجوان اس انجانے اسٹیشن پر اتر گیا اسی پل ٹرین سے باہر ایک طویل العمر بڑھیا چیخیں نکالتی ہوئی میری کھڑکی کی جانب اتنی زور سے چلائی کہ میں نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول دی جب بڑھیا پر نظر پڑی۔ تو دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس بڑھیا کا چہرہ جھریوں سے بھرا پڑا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی وہ نحیف اور منحنی بدن کی مالک تھی منہ دانتوں سے عاری۔ میں ایسی ڈری جیسے کہ بھیانک روح دیکھ لی ہو۔ اس بڑھیا نے اپنی چیزوں سے بھری ٹوکری میرے آگے کردی۔

اس وقت تک میرے دل کی دھڑکن اعتدال پر آگئی تھی میں نے اس کی ٹوکری کو جھٹکے سے پرے ہٹایا اور غصے سے بڑھیا کو بری طرح ڈانٹ کر بھگانا چاہا بڑھیا میرا ردعمل دیکھ کر منہ بگاڑتی چلی گئی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی چلنے لگی۔ تو نوجوان دوڑ کر دوبارہ گاڑی میں چڑھ آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا سارا موڈ اس بھیانک بڑھیا کی وجہ سے غارت ہو چکا تھا اوپر سے اس نوجوان کی تمسخر اڑاتی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔ میرے منہ کے زاویے بدلنے لگے۔ ایک دم نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

”سنیئے؟“

”جی فرمایئے؟“ آواز شائستہ تھی اور بھاری گھمبیر بھی۔

”اگر آپ برا نہ مانیں تو پلیز! کوئی اور سیٹ تلاش کرلیں۔“ میرا اتنا کہنا تھا کہ اس کی بھنویں تن گئیں۔ اس کے چہرے کا زاویہ بدلتے دیکھ کر میں فوراً بول پڑی۔

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو؟“

میں واقعی گھبرا گئی تھی کہ یہ نوجوان رات کی تاریکی میں کہیں مجھے چلتی ٹرین سے دھکا نہ دے دے۔ اور یہ سوچ کر میں نے کانوں کو ہاتھ لگادیا۔

”اوہ توبہ۔“ دل میں کہا۔

نوجوان مجھے دیکھ کر مسکرایا، اور پھر آنکھیں بند کرکے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ گانے سننے لگی کچھ دیر بعد میرا اسٹیشن آنے والا تھا، اور پھر چند منٹ بعد میرا اسٹیشن آگیا۔ میں اور خاتون ٹرین سے اترنے لگے، خاتون نے اپنا سامان سنبھالا اور پھر میں اترنے لگی، میرا ایک بیگ بڑا تھا مگر بھاری نہیں تھا جب میں نے اسے اٹھانا چاہا تو ایسا لگا کہ جیسے من بھر وزنی ہو لہٰذا دشواری ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر میرا وزنی بیگ اس نوجوان نے ہوا میں ایسے اٹھایا جیسے بھاری بیگ نہ ہو بلکہ کوئی غبارہ ہو یا پھر روئی ہو۔

میں نیچے اتری اس نے بیگ نیچے اتارا اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ کے بجائے گہری سنجیدگی تھی۔

”اپنے خیالات کو ہر کسی پر ثبت کرنے کی کوشش نہ کیا کریں، ایسا نہ ہو کہ کوئی حادثہ پیش آجائے آج تو بچ گئیں مگر ہر جگہ ممکن نہیں ہوسکتا۔“

جب میں نے نوجوان کے الفاظ سنے تو سن کر رنگ گئی کچھ اور پوچھتی کہ ”یہ الفاظ تم نے

کیوں کہے؟“ مگر ٹرین چل پڑی میں کھڑی حیران رہ گئی کہ ”یہ کیا کہہ کر گیا ہے؟“

پھر سر جھٹک کر اپنے خیالات کی نفی کی اور بھائی جو اسٹیشن پر میرا منتظر تھا، اس سے ملی قریب اس کی گاڑی کھڑی تھی، میں نے جب اپنا بیگ اٹھایا تو مجھے عجیب حیرت ہوئی کیونکہ اب بیگ ذرا بھی بھاری نہیں تھا میں بھائی کے ساتھ گھر آگئی اور اس واقعہ کو نظر انداز کردیا۔

جب یہ واقعہ میرے ذہن میں آیا تب فوراً وزیر چچا جان کو بتادیا انہوں نے پوری بات سنی اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

”بیٹی مجھے جس بات کا ڈر تھا وہی بات ہوئی۔“

میری آنکھیں پھر نمناک ہونے کے لئے بے چین تھیں۔

”چچا جان اس واقعہ کے بعد مجھے ڈراؤنے خواب آنا شروع ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نوجوان نے مجھ سے یہ سب کیوں کہا؟“

”بیٹا! مجھے بھی پتہ نہیں ہے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ نوجوان ضرور جانتا تھا کہ تم پر مصیبت آنی ہے، اسی لئے پہلے ہی تمہیں آگاہ کردیا اور وہی بتا سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کب ہوا ہے؟ اسی نوجوان کے پاس اس پیچیدہ ڈور کا سرا ہے تو وہی یہ ابھی ڈور سلجھا سکتا ہے۔“

”مگر چچا جان وہ تو کسی اور جگہ کا رہنے والا تھا اور وہ ٹرین لاہور تک جارہی تھی اتنے بڑے شہر میں ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے؟“ میں حیرانی سے بولی۔

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے مگر ایک بات تو صاف ہوگئی کہ اسی تعویذ کی وجہ سے تمہارے دماغ نے کام تو کیا۔ اور جس بزرگ نے مجھے یہ تعویذ دیا ہے وہ بہت اللہ والے ہیں بلکہ ولی اللہ ہیں میرے دوست کے والد محترم ہیں جب بھی میں کبھی پریشان ہوتا ہوں تو ان سے بات کرکے بالکل مطمئن ہوجاتا ہوں اور وہ یقیناً تمہارا مسئلہ بھی حل کردیں گے۔“

”چچا جان ہم چلتے ہیں ان کے پاس!“ میں خوش ہوکر بولی۔ ”ہاں میں نے بھی یہی سوچا ہے۔“ چچا بولے۔

اور اگلے دن ہم ان بزرگ کے گھر ان کے سامنے بیٹھے تھے رعب دار اور نورانی شخصیت تھی۔ سفید داڑھی سفید چہرہ پرنور چہرہ چمک رہا تھا، انہوں نے سفید چادر کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔

انہوں نے توجہ سے میری ساری بات سننے کے بعد بولے۔

”بیٹا اس دنیا میں الہامی کتاب قرآن مجید ہے، جس میں انسانوں اور جنوں کے وجود کا بہت واضح الفاظ میں ذکر آیا ہے، جس سے انحراف ناممکن ہے ویسے تمہاری بات بھی درست تھی، جب تم نے ان نادیدہ وجود کو دیکھا ہی نہ ہو تو پھر کس بنیاد پر یقین کرسکتی ہو تم ناسمجھ اور کم عمر تھی اس عمر میں تم اپنی نظریات اور مشاہدات پیش کرنا چاہتی تھی اس لئے دوسروں کی خاص بات بھی تمہیں بے سروپا لگیں۔“

بزرگ نے کتنا درست اور صحیح اندازہ لگایا تھا، میں حیران ہوکر حیرت میں جیسے ڈوب گئی۔

اور وہ بڑھیا جسے تم نے برا بھلا کہہ کر ڈانٹ دیا تھا وہ اسی وجہ سے تم سے بہت زیادہ ناراض ہوگئی تھی تمہارے رویہ سے وہ دکھی تھی اور وہ تمہیں سبق سکھانا چاہتی تھی مگر اس نوجوان کی وجہ سے خاموش تھی جس نے تمہاری حفاظت کا بندوبست اپنے سر لے لیا۔

لیکن اس بڑھیا کو تم پر بہت غصہ تھا اسی لئے اس نے تمہیں خوابوں میں تنگ کرنا شروع کردیا۔

”شاہ صاحب! میں سمجھی نہیں؟ وہ بڑھیا اور نوجوان آپس میں کیا رشتہ رکھتے تھے۔؟“

”بیٹی! دراصل وہ نوجوان اور وہ بڑھیا انسان نہیں بلکہ جنات میں سے تھے، وہ نوجوان مسلمان نرم خو اور رحم دل نوجوان تھا، اور وہ بڑھیا غیر مذہب سے، اور شر پسند تھی۔ وہی بڑھیا تم پر ناراض تھی جو بھول تم سے ہوگئی تھی۔ وہ بڑھیا اس کا بدلہ لینا چاہتی تھی مگر نوجوان نے بڑھیا کو روکا اور اس کی منت سماجت کی بڑھیا نہ مانی تو

نوجوان نے تمہاری حفاظت کا ذمہ لے لیا اور ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہنے لگا مگر تمہیں ایک انجانے احساس نے ستانا شروع کردیا۔"

شاہ صاحب! کی باتیں سن کر میرے اردگرد دھماکے سے ہونے لگے، میں حیرتوں کے پہاڑوں میں جیسے دفن ہونے لگی، میرا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ کتنے ہی پل میں ساکت وجامد رہی۔ اور کتنے ہی پل یونہی بیت گئے۔

"لیکن شاہ صاحب! وہ میرا پیچھا کیوں کررہا ہے؟ خوف آتا ہے مجھے اس کے احساس سے اور اس نے میری حفاظت کا ذمہ کیوں لیا ہے؟ یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے؟" میں الجھ کر بولی۔

"تمہارے ہاتھ کی کلائی پر ایک نیلے رنگ کا نشان یا تل موجود ہے۔" میں نے جلدی سے کلائی دیکھی تو واقعی میرے ہاتھ کی کلائی پر تل موجود تھا۔ حالانکہ میں نے شاہ صاحب کو اپنا ہاتھ دکھایا بھی نہیں تھا میں نے پوری آستین والی قمیض پہن رکھی تھی۔

"مگر اس نقطے سے کیا مطلب ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی وجہ سے تم اس کی حفاظت میں ہو اور وہ کوئی عام جن نہیں ہے سردار جن کا بیٹا ہے۔ بہت مہربان اور نرم خو ہے۔ وہ خود تو مسلمان ہے مگر وہ بڑھیا غیر مذہب تھی اور اس کے تمہارے خیالات جان کر تم سے نفرت ہوگئی اور تمہیں نقصان پہنچانے ہی والی تھی کہ خدا کو تم پر ترس آگیا اور وہ جن تمہارے اور اس بڑھیا کے درمیان مضبوط دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔"

میں اب بھی خوف زدہ تھی۔

"مگر اس نشان کا صحیح مطلب کیا ہے، کیا یہ کسی مطلب کو ظاہر کرتا ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

شاہ صاحب میری بات سن کر بولے۔ "یہ تو صحیح طور پر وہی نوجوان جن ہی بتا سکتا ہے جو تمہاری حفاظت کرتا ہے۔"

"شاہ صاحب وہ کیسے بتائے گا؟ وہ تو نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

شاہ صاحب میری بات سن کر مسکرائے۔

"آج وہ نظر آجائے گا۔" یہ بول کر شاہ صاحب منہ ہی منہ کچھ پڑھنے لگے۔ آدھے گھنٹے تک شاہ صاحب کچھ پڑھتے رہے۔ اور پھر کمرے میں دھیرے دھیرے دھواں سا ابھرنے لگا اور پھر اس دھوئیں نے اسی نوجوان کی شکل اختیار کرلی اب وہ نوجوان ادب واحترام کے ساتھ شاہ صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ؟" اس کو دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟" وہی گھمبیر آواز شائستہ لہجہ میں بولا۔

"مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی جس کی آپ اتنی بڑی سزا دے رہے ہو، اپنے خیالات کے اظہار پر پابندی تو نہیں ہے؟ اب جبکہ میں نے یقین کو پالیا ہے، یہ سزا ختم ہوجانی چاہئے میرا پیچھا چھوڑدیں ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہنا کیا یہ صحیح یا اچھی بات ہے۔ اگر غلطی ہوئی تھی مجھ سے تو میں نے سدھار لی ہے مان چکی ہوں کہ آپ لوگوں کا وجود بھی اس دنیا میں موجود ہے اور دیکھ بھی چکی ہوں۔ یہ بھی مان چکی ہوں کہ آپ کی بھی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اچھے برے جن بھی ہوتے ہیں مسلم اور غیر مذہب کو بھی مان چکی ہوں ہر چیز پر یقین قائم ہوچکا ہے۔" میری ہچکی بندھ گئی۔

نوجوان نے خاموشی سے سر جھکالیا۔ میری کسی بات کا اس نے جواب نہیں دیا۔

"ذہنی مریض بن چکی ہوں، کسی سے بات نہیں کرسکتی ہر وقت طبیعت پر ایک عجیب سا تاثر رہتا ہے۔ سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے، میری سودائی حالت کے پیش نظر کبھی میں نے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا، پھر کیوں یہ اذیت میرے حصے میں آئی بتائیں؟" میں نے دل کا سارا غبار باہر نکال دیا۔ کمرے میں سکوت طاری اور گہری خاموشی تھی یا پھر میری ہچکیوں کی آوازیں بھی۔

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" نوجوان نے دکھ سے کہا۔ رہا یہ سوال کہ میں تمہارے پیچھے کیوں پڑا تو میرا جواب ہے کہ کسی غلط ارادے سے نہیں بلکہ آپ کی حفاظت کررہا تھا کہ ہماری قوم کے کسی فرد سے آپ کو نقصان نہ پہنچے اسی لئے اب تک آپ کے ساتھ تھا۔

"میری حفاظت کی کوئی خاص وجہ؟ کیا آپ ہر اس لڑکی کی حفاظت کریں گے جس کو کسی جن یا کسی چڑیل سے خطرہ ہو۔"

"نہیں! اصل وجہ میں اب بتاتا ہوں جب آپ نے اس غیر مذہب بڑھیا کو ڈانٹ دیا تو مجھے بھی اس وقت آپ پر غصہ آیا، مگر بڑھیا کے عزائم بہت بھیانک ہوگئے وہ ہر حال میں آپ کو چھٹی کا دودھ یاد دلانا چاہتی تھی۔ میں کبھی بڑھیا کو نہ روکتا، اگر میں آپ کے ہاتھ کی کلائی پر اس نیلے رنگ کا تل نہ دیکھتا۔ اسی تل کی وجہ سے آپ مجھے عزیز ہوگئی ایسا ہر تل یا نشان ہمارے خاندان کی وراثت میں چلا آرہا ہے ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ "یہی ہماری اصل پہچان بن سکتا ہے۔"

اور پھر جب آپ کے ہاتھ کی کلائی پر وہی نشان پایا جیسے میرے ہاتھ کی کلائی پر ہے جو ہماری وراثت کی پہچان ہے۔ یہ نشان نسل در نسل ہمارے ہاتھ کی کلائیوں پر چلا آرہا ہے لیکن جب بالکل ویسا نشان آپ کی کلائی پر دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے آپ ہماری ہی قوم کی ایک فرد ہیں اور میری نا سمجھی تھی کہ میں آپ کو پسند یعنی چاہنے لگا۔

میں نے اس بڑھیا کو سمجھایا کہ وہ تم سے دور رہے پہلے تو وہ نہ مانی اور بدستور تمہیں خوابوں میں اور ڈراؤنی آوازوں سے پریشان کرتی رہی، اگر میں بیچ میں نہ ہوتا تو نہیں وہ بڑھیا آپ کے ساتھ کیا کرتی پھر میں نے اس بڑھیا کی بہت منت سماجت کی اور پھر وہ مان گئی اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اب وہ آپ کو ہرگز پریشان نہیں کرے گی، مگر ایک انجانا خوف مجھے لاحق ہوگیا کہ اگر میں نے آپ کی حفاظت سے غفلت برتی تو وہی بڑھیا آپ کو نقصان نہ پہنچادیں۔

پھر میں نے اپنے بزرگوں سے آپ کے لئے بات کی اور مشورہ مانگا تو آپ کو اپنانا ممکن ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس لئے میں نے اپنے دماغ کا کہا مانا اور یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ کہیں آپ کی قوم کے لوگ ناراض نہ ہوجائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے، انسان ہر مخلوق پر بھاری ہوسکتا ہے۔

آخر کار یہی فیصلہ میں نے طے کیا کہ اپنی روزمرہ کاموں میں سے وقت نکال کر آپ کی حفاظت کروں لیکن اب چونکہ میری مداخلت آپ کو پریشان کررہی ہے تو میں چلا جاتا ہوں لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ جب بھی مصیبت میں آپ کو میری ضرورت محسوس ہو تو میرا نام لے کر تین بار پکارنا میں حاضر ہوجاؤں گا اور آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں اس انکشاف پر ہکا بکا رہ گئی۔ اب میری ہر پریشانی ختم ہوچکی تھی اور اندرونی طور پر سکون محسوس کرنے لگی تھی میرے ہر ادھورے سوال کا جواب مل چکا تھا قدرت کے اس معجزے پر عقل دنگ ہے کہ ایسا بھی ہوتا ہے گہری خاموشی کے بعد شاہ جی بولے۔

"بیٹا! تم نے کچھ اور پوچھنا ہے یا تمہاری تسلی ہوگئی ہے۔"

"شاہ صاحب جی، مجھے صرف اس نوجوان کا نام معلوم کرنا ہے۔" میں شاہ صاحب کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میرا نام جمناش ہے۔" وہ نوجوان گھمبیر آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے جمناش مجھے آپ سے اب کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ کوئی شکوہ ہے، اور نہ کوئی غلط فہمی ہے، سب کچھ شیشے سے کسی دھول کی طرح صاف ہوگیا ہے۔"

"شاہ صاحب اب مجھے اجازت دیں تاکہ میں اپنی دنیا میں چلا جاؤں۔" جمناش نے عقیدت سے شاہ صاحب سے پوچھا۔

"جی بیٹے، بالکل تمہیں اجازت ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم ہمارے بلاوے پر آگئے۔"

جمناش نے شاہ صاحب کے ہاتھ عقیدت سے چومے اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

''الوداع'' اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اس کے بعد وہ غائب ہوگیا میں نے بھی اسے الوداع کہا اور ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

چچا جان نے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ہم وہاں سے آگئے۔

اس دن کے بعد میں بالکل ہلکی پھلکی ہوگئی تھی کوئی خوف مجھے نہیں رہا تھا۔ چچا جان کی لڑکیاں پہلی جیسی دوست بن گئی میری اور کچھ دن چچا کے ہاں رہ کر دوبارہ میں گھر چلی آئی۔

میرا بدلہ ہوا پہلا روپ دیکھ کر گھر والوں کو خوشگوار حیرت ہوئی میرے مزاج سے وہ بوجھل پن ڈر، خوف اور وہ بھیانک خواب رفو چکر ہو چکے تھے۔

کچھ دن کے بعد کالج کی سہیلیاں بھی دوبارہ میری گرویدہ ہوگئی ٹیچر کی ڈانٹ پھٹکار بھی ختم ہوگئی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھک ہوگیا میری زندگی بہت خوبصورت ہوگئی میں نے اللہ تعالیٰ سے لو لگالی اپنی ہر دعا میں جناش کے لئے دعائیں مانگنے لگی۔ وہ میرا محسن تھا مجھے پسند کرتا تھا جب کبھی میں دعا مانگتی تو اس کی صحت اور اچھی زندگی کے لئے بھی دعا ضرور مانگتی۔

دراصل وہ بھی مجھے پسند تھا مگر ضروری نہیں کہ جو چیز پسند آجائے اسے حاصل بھی کرلیں میں اپنی زندگی میں بہت مطمئن اور خوش وخرم ہوں۔ اور جناش جہاں بھی رہے شاد آباد، خوشیوں میں ہر وقت گھرا ہر وقت ہنستا مسکراتا رہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خوش ہوگا اور اپنے لوگوں میں ہنستا مسکراتا ہوا زندگی بسر کررہا ہوگا۔

زندگی کی خوشیوں میں ایک خوشی کی خبر مجھے یہ ملی کہ چچا فرید نے اپنے ہونہار بیٹے ولید سے میرا رشتہ طے کردیا۔

امی ابو سب اس رشتے پر راضی تھے سب کی خوشیوں کو دیکھ کر میں بھی دل وجان سے اس رشتے پر راضی ہوگئی۔

کچھ عرصے کے بعد میری شادی تھی میری شادی میں میرے کزنز نے تمام رسم ادا کئے ہلا گلا ناچ گانا مستی ڈھولکی سب کچھ ہوا۔

باراتیوں کے ساتھ جاتے ہوئے میں زاروقطار روئی کہ آنسو بھی خشک ہوگئے مجھے سجے سجائے کمرے میں بٹھایا گیا کچھ دیر تک میری کزنز ساتھ بیٹھی رہی پھر وہ سب چلی میں کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ کمرہ پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ہر چیز نئی اور رونق بخش رہی تھی اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ زندگی میں آخر بار جناش کو دیکھ لوں کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ کیسا ہوگا بدل گیا ہوگا یا پھر اسی طرح حسین وجمیل ہوگا۔

دل نے تو بہت کہا کہ اس کا نام لے کر تین مرتبہ اونچی آواز میں اسے پکاروں مگر دماغ نہ مانا اور پھر میں نے دماغ کا کہاں مان لیا ولید کا انتظار کرنے لگی۔

رات 10 بجے دروازے کا ہینڈل گھوم گیا ولید کمرے میں داخل ہوگیا اور وہ اس وقت ہرگز کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا دل اس کو دیکھ کر بے اختیار دھڑکنے لگا۔

منہ دکھائی میں اس نے مجھے سونے کی ہیرے والی انگوٹھی دی اور خوبصورت بات چیت سے نئی زندگی کا آغاز کردیا۔

چند دن کے بعد مجھے احساس ہوا کہ زندگی کتنی خوبصورت دلکش اور حسین ہے ولید اور چچا جان اور میرے سسرالی رشتے دار بہت اچھے ہیں وہ اس لئے اچھے ہیں کیونکہ میں اچھی ہو زندگی کی پرمسرت لمحوں میں، میں اس جن کو فراموش کرچکی ہوں لیکن میری دعائیں اب بھی اس کے لئے حیات ہیں۔

مجھے پختہ یقین ہے اور وہ یقین یہ ہے کہ کل کائنات کا مالک صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ذات ہمارا حامی وناصر ہے اور وہی ہمیں صحیح فیصلے کی توفیق عطا فرماتا ہے ہم انسان تو صرف کوشش کرسکتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہم سانس تک نہیں لے سکتے۔

ہولناک منظر

عامر ملک۔ راولپنڈی

پورے علاقے میں ان گنت بے شمار لاشیں پڑی تھیں، کوئی بھی پرسان حال نہ تھا، اور ایک وقت آیا کہ ان لوگوں کو مارنے والے بھی دل تھام کر بیٹھ گئے کہ اسی اثناء میں......

جنگ کے میدان میں جنم لینے والی ایک ہولناک خونچکاں......اور دل برداشتہ روداد

زخمی فوجی اور ان کی لاشیں اٹھانے والے ہیلی کاپٹر کی رفتار اس مقام پر پہنچ کر تھم گئی۔ جہاں ملبے کے اعضا بکھرے پڑے تھے۔ زمین پر دور دور تک ہر چیز خاموش اور بے حس وحرکت نظر آتی تھی۔ موت کا زرد جھنڈا ہر طرف لہرا رہا تھا۔ بھڑکتی ہوئی آگ سے اٹھنے والے دھوئیں کی طرح غبار کے مرغولے فضا میں اٹھ رہے تھے۔ اس زمین سے جہاں کلیفسی اور اس کے ساتھی موت کی آغوش میں پڑے تھے۔ ساری کی ساری الفا کمپنی مرچکی تھی۔ اور امریکہ کی فوجی تاریخ میں کنڑا کے بعد وقوع پذیر ہونے والا یہ سب سے بڑا حادثہ تھا۔

جنگی نامہ نگار مائیک جو ہمیشہ ریڈ انڈینز کی حمایت کرتا تھا...... یہ منظر دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔

''یاد رکھو کہ یہ کوئی ترانوالہ نہیں ہے یہ ویت نام

ہے۔ ویت نام!...... اور وہ سب اپنے گھر سے دور۔ بہت دور یہاں مر چکے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ تمام امریکی یہاں کیا کر رہے تھے؟ یہی کچھ انہوں نے سیوکس میں ریڈ انڈینز کے ساتھ کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ امریکیوں کو ریڈ ہورڈز نسل کے ریڈ انڈینز سے ''بچانا'' چاہتے تھے۔ خدا کلینسی کی مغفرت کرے۔ تم اسی سے اندازہ کر سکتے ہو کہ اس نے کتنی فاش غلطی کی اور وہ غلطی یہ تھی کہ وہ ویت نام میں تھا۔''

''ہیلی کاپٹر اترنے کے لئے زمین پر مناسب مقام کی تلاش میں چکر کاٹنے لگا۔ خاموشی اور موت کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ موت کے عین اوپر زندگی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ مائیک کی سوچ کے دائرے پھیل اور سمٹ رہے تھے۔ ''یہ کلینسی کی حماقت تھی کہ اس نے پہاڑی کی پشت پر قبضہ قائم نہیں رکھا۔ جس کے نتیجے میں انہیں وادی میں دھکیل دیا گیا...... ویت نام میں امریکیوں کی یہ پہلی عظیم ترین غلطی تھی۔ جس سے دشمن کو تقویت ملی جو جنگل کی آڑ سے لڑ رہا تھا۔ حالانکہ امریکیوں نے تو اپنے دیس میں پہلا کام یہ کیا کہ جنگل صاف کر دیئے اور ان کی جگہ شہر بسا دیئے تھے۔''

نیچے جو جنگ لڑی گئی اور لڑی جا رہی ہے، اس کے بارے میں غور کرے۔ ہمیشہ ریڈ انڈینز کی حمایت میں سوچنا چھوڑ دو تم یہاں سے واضح طور پر دیکھ رہے ہو کہ کلینسی کن حالات سے دوچار ہوا۔ ویت نام کے اس کوہستان میں اور کمبوڈیا کی سرحدوں کے قریب۔ جہاں غیر ہموار قطعے ہیں اور ہر چیز بے جوڑ نظر آتی ہے۔ تم ٹبری سے وہ مقام دیکھ سکتے ہو جہاں کلینسی کی کمپنی کا دشمن سے آمنا سامنا ہوا۔ تم جنگ کے بھیانک اور گھناؤنے اثرات کو دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہو کہ کلینسی نے پہاڑی کی پشت پر قدم جمانے کی کس قدر کوشش کی۔ لیکن دشمن کے بے پناہ دباؤ کی تاب نہ لا کر اسے اپنے ساتھیوں کو نشیب میں اترنے کی اجازت دینی پڑی۔ پھر کلینسی نے انہیں دوبارہ اس جگہ اکٹھا کیا...... جہاں پر اب ان سب کی لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔''

کلینسی کو ہر قیمت پر پہاڑی کی پشت پر ہونا چاہئے تھا۔ اگر تمہیں کھلے میں لڑنا پڑے تو ہمیشہ بلندی سے لڑو۔ تب تمہیں ختم کرنے کا دشمن کے پاس ایک ہی طریقہ قوسی یا مارٹر فائر رہ جائے گا۔ جس کا تم بلندی سے موثر جواب دے سکتے ہو۔ لیکن اگر دشمن تمہیں نشیب میں دھکیل دے تو پھر تم اس کے نشانے سے نہیں بچ سکتے اور بلندی سے کسی بھی چیز کے ذریعے تمہیں ختم کر سکتا ہے۔ نیچے جس ترتیب سے لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کلینسی نے پہاڑی کی پشت پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے بار بار حملے کئے۔ جو افراتفری کا شکار ہو گئے اور اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کلینسی نے اپنی کمپنی ایک ہی ساتھ نہیں مروایا تھا...... یقیناً پہاڑی کی پشت میں تنگ دراڑ کے اندر بھی کئی امریکیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ وہ ہر صورت میں اپنی پہلی پوزیشن پر واپس آنا چاہتے تھے۔ یہی ان کے بچاؤ کا واحد راستہ رہ گیا تھا...... اور اب وادی میں ہر طرف موت کی حکمرانی ہے...... آہ...... یہ وادی کتنی آرام دہ اور پرسکون ہے۔ پہاڑی اونچی اور دشوار گزار ہے اور لوگ چپ چاپ بے سدھ موت کی آغوش میں سو رہے ہیں اور لاشوں سے سرخ سرخ خون رس رہا ہے...... ادھر دیکھو جہاں انہوں نے حماقت کی۔ خود فریبی کا شکار ہوئے اور گولیوں سے ان کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ جہاں وہ ناکام و نامراد ہوئے۔ جہاں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے تک لاحاصل جدوجہد کی اور جہاں وہ موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ اس راستے پر نظر ڈالو جو انہوں نے اپنے خون سے تعمیر کیا اور تصور کی آنکھ سے تم کلینسی کو بھی دیکھ سکتے ہو۔ جو پرانی فلموں کے ہیرو کی طرح اپنے ساتھیوں کو دشمن کے خلاف غیظ و غضب سے لڑنے کے لئے اکسا رہا ہے۔ اور انہیں خدا۔ وطن اور اپنا واسطہ دے کر کہہ رہا ہے کہ وہ پہاڑی کی پشت پر دوبارہ قبضہ کر لیں...... سنو...... وہ کہہ رہا ہے۔

''میں نے اسے کہہ دیا۔ تم اسے دوبارہ حاصل کرو...... سمتھ!...... ڈونووچ! لیوس! آگے بڑھو......

سیلن! مارشل! اور ون! اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں...... لیکن سب لوگ کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟ یہ زمین ہمیں کس بات کی سزا دے رہی ہے؟ ہم سب کہاں گئے؟ سب مر چکے ہیں؟''

☆......☆......☆

اس موسم میں وادی کا حسن نکھر آتا ہے۔ مون سون ہواؤں کی وجہ سے بہار آ جاتی ہے...... لیکن اب یہاں سناٹا پرہول سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہر سو موت ہی موت ہے۔ البتہ لاشوں سے رسنے والا سرخ سرخ خون زندگی کی علامت بن گیا ہے۔ زندگی جو سرخ گلاب کی مانند حسین و جمیل ہے۔

جنگی نامہ نگار مائیک کو لانے والے ہیلی کاپٹر نے فضا میں اس غرض سے ایک بڑا چکر لگایا کہ کسی موزوں مقام پر اترا جائے، کوئی ایسی جگہ جو بارودی سرنگوں سے پاک ہو۔ جہاں آگ بھڑک اٹھنے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ پھر جگہ منتخب کر لی گئی۔ ہیلی کاپٹر زمین کی طرف اترنے لگا۔ اور کلینسی اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کے بکھرے ہوئے اعضا کے قریب ایک ہلکے سے شور کے ساتھ زمین پر ٹک گیا۔

لاشیں اٹھانے اور ان کے اندراج کرنے والا عملہ اپنے مخصوص انداز میں ہیلی کاپٹر کے زمین کو پوری طرح چھونے سے پہلے ہی باہر کود چکا تھا۔ اور پھر وہ سب یوں بھاگنے لگے۔ جیسے تیز و تند آندھی ان کا تعاقب کر رہی ہو...... الفا کمپنی کی لاشوں کے قریب پہنچ کر وہ یکدم رک گئے...... موت کا بھیانک چہرہ کسی دیوہیکل چٹان کی طرح ان کے سامنے آ چکا تھا۔ چند لمحے بے حس و حرکت اور پتھراتی ہوئی نگاہوں سے وہ لاشوں کو دیکھنے کے بعد بوجھل قدموں سے ہیلی کاپٹر کی طرف لوٹ گئے...... دکھ...... افسوس...... تعجب اور دہشت کے ملے جلے تاثرات چہروں پر سجائے وہ اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں سوچنے لگے۔ اسی اثنا میں ٹیم کا انچارج لیفٹیننٹ ہیلی کاپٹر سے باہر آیا اور اس نے سب سے پہلا حکم یہ سنایا کہ کوئی شخص بھی کسی لاش کو اس وقت تک نہ چھوئے جب تک کہ فوجی فوٹو گرافر لاشوں کی تصویریں نہیں بنا لیتے۔''

انہی تصویریں سے انٹیلی جنس کے ماہرین کلینسی کی کمپنی کی ہلاکت و شکست کا تجزیہ کر سکتے تھے۔

لیفٹیننٹ بولتے بولتے یکدم رک گیا......

''لیکن ہم یہاں کسی بھی قسم کے نتائج اخذ کرنے کے لئے تو نہیں آئے۔''

اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بال سرخ تھے اور وہ بالکل نوجوان تھا۔ لاشیں اٹھانے والے عملے کے لوگ اس کا آخری جملہ سن کر خاموشی سے لاشوں کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں وہ تھیلے تھام رکھے تھے۔ جن میں لاشیں بھری جاتی ہیں۔ لیفٹیننٹ کے حکم کے انتظار کی کیفیت میں وہ بالکل ان ویٹروں کی طرح نظر آتے تھے جو گاہک کے حکم کے انتظار میں چوکنے کھڑے ہوتے ہیں۔

فوٹو گرافروں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ کیمروں کو ہتھیاروں کی طرح فضا میں بلند کرتے ہوئے لاشوں پر بے ترتیبی سے روشنیاں پھینکنے لگے۔ اسی دوران میں نوجوان لیفٹیننٹ مسلسل لاشوں کو نہ چھونے کی ہدایت دیئے جا رہا تھا۔ ادھر فوٹو گرافروں کو تصویریں بناتے ہوئے شدید دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ کیونکہ کئی لاشیں اس طرح پڑی تھیں کہ ان کی واضح تصویر نہ بن سکتی تھی۔ اور یہی انتہائی ضروری بات تھی۔ لاش کی تصویر دیکھ کر ہی انٹیلی جنس والے بتا سکتے تھے کہ مرتے وقت وہ کس جانب متوجہ تھے اور کس کس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

سپاہیوں کا اس حالت میں مرنا ضروری تھا کہ موت سے قبل ان کے آخری اعمال سے الفا کمپنی اور امریکی فوج کے وقار کو تقویت پہنچے اور الفا کمپنی کی نیک نامی اور شہرت ان کی شکست پر اثر انداز نہ ہو...... کیا لاشوں کی کیفیت ایسی ہی تھی۔ جس سے ان کے جوش و خروش کا اظہار ہوتا تھا۔ عام سپاہیوں کی لاشیں کس

ترتیب سے پڑی تھیں؟ کیا نان کمیشنڈ افسروں کی لاشیں بھی آگے تھیں؟ سپاہیوں کے گروپوں کی کمان کرنے والوں کی لاشیں کہاں تھیں؟

یہ فوٹوگرافروں کا فرض تھا کہ وہ تصویروں کے ذریعے ان سارے سوالوں کا جواب دیں اور اگر ہو سکے تو جنگ کی پوری تفصیلات کمان کرنے والوں کے طریق کار اور جنگ کے اثرات کو اپنے کیمرے میں منعکس کرلیں۔ انہیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ آیا کمیشنڈ افسروں کی ترتیب سے جنگ کے منصوبوں کا سراغ ملتا ہے؟ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ کمپنی کمانڈر کلینسی کی لاش کہاں ہے؟ انہیں ساری مسخ شدہ بکھری ہوئی لاشوں کی تصویریں محفوظ کرنا تھیں۔ کلینسی کی لاش ڈھونڈنے کے بعد یہ جاننا تھا کہ آیا وہ جنگ کی عام موت مرا ہے یا اسے باقاعدہ منصوبہ بنا کر قتل کیا گیا تھا؟

اور کیا کمیشنڈ افسروں کی لاشیں ریڈیائی رابطے کے ہیڈفون والے سپاہیوں کی لاشوں سے زیادہ مسخ کی گئی ہیں؟ اور جب شکست کے آثار واضح ہوگئے تو انہوں نے کانوں پر سے ہیڈفون اتار ڈالے تھے؟ کیا ان کے کان چھپے ہوئے تھے؟ یا ان کے کان ننگے تھے۔

"ہاتھ مت لگاؤ۔" لیفٹیننٹ کی تنبیہ آمیز تیز آواز ابھری...... اور جنگی نامہ نگار...... مائیک...... جو چند لاشوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ چونک کر اس کی طرف پلٹا...... اس نے کبھی اس قدر مسخ شدہ اور بھیانک لاشیں نہیں دیکھی تھیں۔

"لاشوں کو ہاتھ مت لگاؤ۔" لیفٹیننٹ پھر بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ ان کے کانوں کے اوپر کیا ہے؟" مائیک نے چند ایسی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ جن کے کان ہیڈفونوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

"یہ کان Ears ہیں۔" لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

"اچھا۔" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں ویسے تم ان سے مراد سال Ears بھی لے سکتے ہو۔ ان میں سے کچھ سپاہی پانچ سال سے یہاں ہیں اور کچھ دس سال سے۔" لیفٹیننٹ کی آواز میں گمبیرتا تھی۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔" مائیک نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس خوفناک صورت حال کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھتا۔" لیفٹیننٹ نے مائیک سے کہا۔

"اور اگر میں لکھوں تو کیا تم میرے اجازت نامے کو منسوخ کرادو گے؟"

"ہاں۔"

"میں اس پر غور کروں گا۔" مائیک نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ لاشوں کو ہاتھ مت لگاؤ۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"مائیک اب کے ایک نرم و نازک چہرے والے نوجوان لڑکے کی لاش پر جھکا۔ جس کی ایم۔ سولہ مشین گن جام ہوچکی تھی۔ وہ اس قدر کمسن تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر کبھی شیو نہیں کیا تھا۔ اس کے نیم وا منہ سے کوئی چیز جھانک رہی تھی۔

"تم نے دیکھا...... دشمن اتنا وحشی بھی ہوسکتا ہے۔" لیفٹیننٹ نے مائیک کو ایک طرف لے جاکر پوچھا۔

"ہاں۔" مائیک نے جواب دیا...... "لیکن اس کے منہ میں کیا ہے؟"

"یہ دراصل ایک دوا ہے جو سپاہی اپنی حفاظت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

مائیک اس کی وضاحت سن کر لڑکے کی لاش کی جانب اس غرض سے بڑھا کہ اس کے منہ سے وہ دوا نکال لے۔

"میں کہتا ہوں لاش کو چھونا منع ہے۔" لیفٹیننٹ نے تیز لہجے میں کہا۔ تو مائیک جھنجھلا کر اسے کہنے لگا۔

"تم اب لاشوں کو سمیٹنے کیوں نہیں دیتے؟"

"انٹیلی جنس والوں کو تصویریں چاہئیں۔"

"کیجے؟"

"اب انہیں تھیلوں میں بند کرو اور یہاں سے چلو۔" مائیک نے مشورہ دیا۔

"ذرا صبر کرو۔ اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"میں اگر اس ساری غیر انسانی صورت حال کی مکمل رپورٹ لکھوں تو کیا تم میرے خلاف قدم اٹھاؤ گے؟" مائیک نے سوال کیا...... لیفٹیننٹ چند ثانیے چپ رہا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"میں نہیں جانتا کہ تمہاری اس رپورٹ کا بے جان چیزوں پر کیا اثر ہوگا۔ لیکن اتنا تو مجھے یقین ہے کہ لوگ اسے پڑھ کر مشتعل ہوجائیں گے۔"

"وہ تمہاری اس جنگ کو رکوا بھی تو سکتے ہیں۔" مائیک بولا۔

"لیکن انہیں یہاں کی صورت حال کا علم نہیں ہے۔ وہ گوریلا جنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" لیفٹیننٹ نے اسے سمجھایا۔

"تم بہت ہٹ دھرم اور ضدی ہو۔" مائیک نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"سنو!" لیفٹیننٹ لرزتی ہوئی آواز میں اسے مجبور کر بولا۔

"ہاتھ مت لگاؤ۔" مائیک نے اسی لہجے میں حقارت سے جواب دیا۔

"سنو!" لیفٹیننٹ کہنے لگا۔ "میں تمہیں سچ سچ کہہ رہا ہوں کہ ایسی صورت حال دیکھ کر میں بیزار ہوجاتا ہوں۔ مایوسی مجھ پر غالب آنے لگتی ہے۔ یقیناً میں کبھی بھی خود کو اس سے ہم آہنگ نہ کرسکوں گا۔"

مائیک نے اس کی بات سن کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب لاشوں سے اٹھنے والی بو کے بھبکے جنگل میں پھیل رہے تھے۔ اس سے قبل ہیلی کاپٹر کے گھومتے ہوئے پروں کی وجہ سے بو کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ لیکن اب ہیلی کاپٹر کے پر ساکت ہوچکے تھے۔ اور وادی پر ہولناک سناٹے کی چادر تنی ہوئی تھی۔

"کلینسی یہاں کیوں آیا؟" مائیک نے اچانک سوال کیا۔

"وہ اسی طرف سے گزرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن اس سلسلے میں...... میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔"

"تم نے جو کچھ بھی سنا ہے وہ صریحاً غلط ہے۔" لیفٹیننٹ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ اسے یہاں آنے کا حکم دیا گیا تھا۔"

"لیفٹیننٹ نے چند لمحوں کے لئے سوچا اور پھر دھیرے لہجے میں بولا۔

"اس نے خود ہی اس طرف آنا چاہا تھا۔ وہ وائرلیس اور ریڈیائی رابطے کا ماہر تھا۔ اور الفا کمپنی کو یہ امتیاز اور فخر حاصل تھا کہ اس کے پاس لاسلکی کے شعبے میں اتنا ماہر افسر موجود تھا۔"

کلینسی کے بارے میں یہ جملے کہتے ہوئے لیفٹیننٹ غصے میں آگیا۔ اس کی سفید جلد جو سورج کی تاب نہ لارہی تھی۔ اس کے بالوں کی طرح سرخ ہوگئی۔ سبز رنگ کے آہنی خود کے بوجھ تلے دبے ہوئے اس کے بالوں کا رنگ جلد سے ہم آہنگ ہوگیا۔ کلینسی...... وکٹر چارلی کو اس حد تک مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ ان کے لئے مزید ہیڈفون اور دیگر آلات مہیا کریں۔"

"میں تمہاری بات پر قطعاً یقین نہیں کرسکتا۔"

لیفٹیننٹ نے اس کا جواب سن کر اپنے بھاری بھرکم فوجی بوٹ سے کسی چیز کو ٹھوکر ماری۔

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ انسانی کھوپڑیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔" مائیک نے کہا۔

"ہرگز نہیں...... وہ یہ نہیں چاہتا تھا کیوں کہ یہ انتہائی مشکل اور وقت طلب کام ہے۔ تم ہی کہو کیا تم نے کبھی ایک کھوپڑی بھی حاصل کرنے کی کوشش کی؟"

"نہیں۔"

"اس لئے کہ یہ بہت ہی مشکل ہے۔"

لیفٹیننٹ نے اصرار کیا۔

''لیکن تم ثابت کرو کہ الفا کمپنی کے مقاصد وہی تھے جو تم سمجھتے ہو؟''

''اس لئے کہ کلینسی پہاڑی کی چوٹی پر بھی رہ سکتا تھا۔'' لیفٹیننٹ نے پہاڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ جان بوجھ کر پہاڑی کی پشت میں تنگ دراڑ میں ٹھہرا۔ اس امید کے ساتھ کہ چارلی کوئی وحشیانہ حرکت نہ کر ڈالے۔ تم دیکھو......''

''وہ بڑے محتاط لہجے میں کہہ رہا تھا...... ''دراڑ کی چوٹی سے فاصلہ سو گز سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ چنانچہ چوٹی پر بھرپور دفاع کیا جاسکتا ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو...... کلینسی جانتا تھا کہ چارلی ان پر کڑی نظر رکھ سکتا ہے۔ اور گولی بھی چلا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نشیب میں ٹھہرا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ چارلی اس پر اعتماد کرے اور اس سے مل جائے۔''

''تو کیا وہ پوری ایک بٹالین کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا؟'' مائیک نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک پوری بٹالین چارلی کے ساتھ ہے۔''

''لیکن تمہیں اس کا علم کیونکر ہو گیا؟''

''ریڈیائی رابطہ منقطع ہونے سے پہلے...... ایپل فنگر اور آرٹی او کے شعبے سے ہمارا باقاعدہ رابطہ قائم تھا۔ اور پھر کلینسی کا خیال تھا کہ چارلی اور اس کے غدار ساتھیوں کی قوت ایک انتہائی مسلح کمپنی سے زیادہ نہیں ہے۔''

''غدار؟ کون غدار؟''

''شمالی ویت نام کے سپاہی......! کلینسی سمجھتا تھا کہ وہ بہت آسانی سے اس کے ہاتھ آ جائیں گے۔''

لیفٹیننٹ نے لاش پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا...... دکھ، کرب اور اندوہ سے احساس دھواں بن کر اس کے چہرے پر منڈلا رہے تھے اور اس کا لہجہ بہت شکستہ اور بھرایا ہوا تھا۔

لیفٹیننٹ! اس طرف ایک سپاہی ابھی زندہ ہے۔'' کسی کی تیز آواز سنائی دی۔

جنگل خاموش تھا کیونکہ بیشتر لوگ لیفٹیننٹ کی ہدایات کے مطابق لاشوں کے بیچوں بیچ خاموشی سے کھڑے تھے۔ فوٹو گرافر بھی تصویریں بناتے ہوئے کسی قسم کی آواز نہیں نکال رہے تھے۔ اسی لئے وہ آواز بہت اچانک۔ ناطق اور روکھی لگی اور کافی حد تک بے موقع اور بے تکی بھی!

''اس کو ہاتھ مت لگانا۔'' لیفٹیننٹ نے آواز کے جواب میں حکم دیا۔

پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے معالج کو بلایا اور لاشوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آواز کی طرف ہو لیا۔

وہ شخص جس نے آواز دی تھی۔ جس نے ایک زندہ سپاہی کو دریافت کیا تھا۔ اس کا تعلق لاشیں سمیٹنے اور ان کا اندراج کرنے والے عملے سے تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں لاشیں سمیٹنے والا تھیلا سنبھالے بڑی خاموشی سے شدت سے دوسروں کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے لیفٹیننٹ کو دیکھا جو تیزی سے بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اسے چھونا مت۔''

''زندہ سپاہی کے قریب پہنچ کر لیفٹیننٹ نے معالج سے کہا۔ ''اندازہ لگاؤ کہ اس کی زندگی کے لئے کیا جاسکتا ہے؟''

☆......☆......☆

زمین پر بکھرے ہوئے ہر امریکی کے سر میں گولی لگی ہوئی تھی۔ ان پر قابو پا لینے کے بعد دشمن نے ایک کے بعد ایک۔ سب کو بڑے اہتمام اور احتیاط سے سر میں گولی ماری تھی تا کہ ان کی موت کا مکمل اطمینان ہو جائے۔ جو سپاہی زندہ رہ گیا تھا۔ گولی اس کے سر میں بھی ماری گئی تھی۔ لیکن یہ اس کی خوش قسمتی یا بدقسمتی تھی کہ گولی آہنی خول سے ٹکرا کر پھسل گئی تھی اور جب معالج نے اس کے سر سے خود اتارا تو پتہ چلا کہ گولی اس کے

بالوں میں سے ہوتی ہوئی سر کی ہڈی کو متاثر کر گئی ہے۔ وہ ایک میکسیکن لڑکا تھا۔ اور جنگ کے عام تقاضوں کے عین مطابق مر رہا تھا۔ معالج نے بڑی مہارت سے چاقو کے ذریعے اس کی قمیض پھاڑ کر اس کے جسم سے الگ کی۔ اس لڑکے کے پیٹ پر ناف کے قریب دشمن نے پوری آٹھ گولیوں کا چھڑکاؤ کیا تھا اس کی وردی اور جسم دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اب تک زندہ تھا۔ اور زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

''اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وقت گزر چکا ہے۔'' معالج کے چہرے سے یہ تاثر مترشح ہونے لگا۔ اس کے ہاتھ مرتے ہوئے انسان کے بے حس جسم پر چپک گئے تھے۔ عجیب و غریب انداز سے کٹھ پتلی کی طرح ساکت و جامد ہو چکے تھے۔''

''پانی چاہیے؟'' لیفٹیننٹ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

معالج کی آواز سن کر چونک پڑا۔ پھر انکار میں سر ہلانے لگا۔

''اگر یہ مر رہا ہے تو پانی اس کی تکلیف کی شدت کم کر سکتا ہے۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''مجھے کچھ یوں محسوس ہوا ہے کہ وہ نظروں ہی نظروں میں پانی طلب کر رہا ہے۔''

معالج نے پھر سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ پانی پینے سے اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور جب ایک فوٹو گرافر نے اپنے تھرموس سے اسے پلانی پلانا چاہا تو پانی اس کے حلق سے نہ اتر سکا اور ٹھوڑی سے بہتا ہوا چھاتی اور پھر پیٹ تک پہنچ کر اس خون میں گھل مل گیا۔ جو وہاں آٹھ گولیوں نے جمع کر رکھا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ بے چارہ مر چکا ہے۔'' ایک فوٹو گرافر نے جو اس کے منہ میں پانی نہیں ڈال رہا تھا۔ دانت پیستے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''نہیں...... میں کوشش کرتا ہوں۔'' لاشیں اٹھانے والے عملے کے ایک فوجی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔'' عین اسی وقت معالج نے میکسیکن لڑکے کو زمین پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب یہ بالکل مر چکا ہے۔''

''لیکن یہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا جبکہ اس کا جسم دو حصوں میں کٹ چکا تھا۔'' فوٹو گرافر نے پھر کہا۔

ایسے محیر العقول، عجیب اور مضحکہ خیز حادثات بہت عام ہیں۔'' معالج نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے ایسے کئی لوگوں کو مرتے دیکھا ہے جن کے جسم پر زخم کا ایک بھی نشان نہیں تھا۔''

''انتہائی صدمے یا بلڈ پریشر کی وجہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ لیکن اس صورت میں بھی کانوں یا کسی اور حصے سے خون رسنے لگتا ہے، کیا ایسا نہیں ہوتا؟''

''نہیں...... میں نے کئی لوگوں کو کسی بھی وجہ کے بغیر مرتے دیکھا ہے۔'' معالج نے میکسیکن لڑکے کا منہ صاف کرتے ہوئے کہا...... ''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ یہاں اس جگہ جتنی بھی لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ اگر تم غور سے اب سب کا جائزہ لو تو تمہیں کم از کم ایک لاش ایسی ضرور ملے گی۔ جس پر کسی قسم کا کوئی زخم نہیں ہوگا۔ بلاشبہ یہ محیر العقول اور مضحکہ خیز بات ہے کہ کچھ لوگ بغیر کسی سبب کے مر جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کی تو زندگی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔'' ...... پھر اس نے لڑکے کا سر خود کے سہارے ٹکا دیا اور کہا ''یہاں تم کو ایسی لاشیں نظر آ رہی ہیں جنہیں دشمن نے ان پر قابو پانے کے بعد سروں میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔''

''اوہ...... ان میں یقیناً ایسے بھی لوگ ہوں گے جو خود کو مردہ ظاہر کر رہے ہیں۔''

ایک فوٹو گرافر نے کہا...... ''صرف اس امید میں کہ وہ موت کو موت کے ذریعے ٹال سکیں۔''

''نہیں...... ان کے لئے اس حد تک جانا بڑی مشکل بات ہے۔'' معالج نے کہا۔

لیکن وہ اپنی ہی آواز کو سن نہیں رہا تھا۔ اور ابھی تک اس خیال میں مگن تھا کہ لڑکا گولیوں کی بوچھاڑ سے

دو ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود اتنی دیر تک کیسے زندہ رہا؟ کس جذبے، کس قوت نے اسے زندہ رکھا؟ یہ بہت ہی عجیب اور حیران کن ہے۔" وہ بڑبڑانے لگا۔

"کیا تم انہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتے؟" کسی نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ وہ مرتے ہوئے تکلیف اٹھائیں۔" ابھی وہ اپنی بات مکمل ہی کر پایا تھا کہ دور سے ایک تیز آواز آئی۔

"یہاں ایک سپاہی ابھی زندہ ہے۔"

"اسے ہاتھ نہ لگانا۔" لیفٹیننٹ نے مشینی انداز میں حکم دیا۔

آواز کے جواب میں اس سے زیادہ ردعمل مزید نہ ہوا۔ کسی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وادی کی ہر چیز پر سکتے کا عالم تھا اور مائیک سوچ رہا تھا کہ اب دوسری بار کوئی بھی دھوکہ کھانے یا مایوس ہونے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ وادی میں زندگی سراب کا روپ دھار چکی تھی۔ مسئلہ صرف اس قدر تھا کہ الفا کمپنی پوری کی پوری مر چکی تھی اور اس کا اندازہ اس جگہ کو دیکھ کر کیا جاسکتا تھا۔ سب دیکھ رہے تھے کہ لاشیں تصویریں بنوانے اور پھر ہتھیلیوں میں سمٹنے کی منتظر ہیں۔ اس مہم پر آنے سے پہلے اس بات کا کوئی بھی امکان نہیں سوچا گیا تھا کہ یہاں کوئی زندہ بھی رہا ہوگا۔ ان سب کے بارے میں یہی فرض کیا گیا تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ لیکن اب یہاں صورت حال بدل رہی تھی حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جو مر چکا ہے اسے اسی حالت میں رہنا چاہئے۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی زندہ ہو۔" کسی نے خیال ظاہر کیا۔

سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ زندگی کے وجود پر کسی کو یقین نہ آرہا تھا۔

"اسے ہاتھ نہ لگانا۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

مائیک جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔ جہاں کسی نے ایک اور زندگی کو دریافت کیا تھا۔ زندہ سپاہی ایک حبشی تھا اور اتنا زخمی نہیں تھا جتنا میکسیکن لڑکا...... وہ بانس کے بنے ہوئے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ اور کافی آرام دہ حالت میں نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی۔ آنکھیں ایک ہی زاویے پر اوپر کے رخ جنگل کے سائبان میں سے جھانکتے ہوئے آسمان پر گڑی ہوئی تھیں۔ سائبان کی چوٹی پر تاڑ کے دو لمبے پتے ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ انہیں ہی دیکھ رہا ہو۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ دیکھ رہا ہو...... اس کے نیم وا ہونٹ کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہونٹ حرکت کرتے اور الفاظ ادا کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایک سوچنے لگا یہ حبشی لڑکا امریکہ کے کسی دور دراز مقام سے آیا تھا اور امدادی رضا کاروں کو چھوڑ کر یہ کبھی سفید فاموں کے قریب بھی نہ ہوا ہوگا۔ لیکن اب وہ ان میں گڈمڈ ہوچکا تھا۔

موت میں بھی ان کا شریک تھا۔

ایک دم حبشی لڑکے کی سانس رک گئی۔ سفید فام معالج جو اس کے اوپر بڑی محبت سے جھکا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے ہی حبشی کے بستر پر تھا اور اس کے سفید بازو حبشی لڑکے کے ارد گرد حائل تھے۔ اور سفید ہونٹ سیاہ ہونٹوں کو چھو رہے تھے۔ سفید زندگی سیاہ موت میں سانس پھونکنے لگی۔ لیکن اس کا حبشی لڑکے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اس کی موت کا وقت قریب آچکا تھا۔ سفید انسان نے آنے میں دیر کردی تھی اور اس کی آنکھیں سختی سے بند ہوچکی تھیں۔ پھر ایک دم حبشی کے سینے میں مدہم حرکت شروع ہوئی، آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں لیکن زندگی کے لئے نہیں...... مائیک نے سوچا کہ حبشی لڑکا...... سفید فام معالج کو منتقل نہ ہونے والی تکلیف کی شدت سے گزر رہا ہے۔ اندیشوں سے بھرپور......

مائیک کو یہ منظر بہت ہی عجیب اور تکلیف دہ محسوس ہوا۔ حبشی لڑکا موت کے بھیانک جبڑوں کی نذر تو ہو ہی چکا تھا۔ لیکن اب وہ ایک زندگی آمیز آغوش اور ہونٹوں کے حصار میں محصور۔ دوبارہ زندگی کی پیچ در پیچ راہوں کی جانب لوٹ رہا تھا۔ اور جو آغوش اور ہونٹ اسے زندگی

دے رہے تھے۔ وہ ایک سفید فام معالج کے تھے۔

معالج حبشی لڑکے سے الگ ہوا۔ اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے اٹھالئے۔ اور لڑکے کی سانس کی رفتار معمول پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے لڑکے کو گھٹنوں کے بل بٹھایا اور اس کے سیاہ سینے پر اپنے سفید ہاتھوں سے مالش کرنے لگا۔

"آہ......" لڑکا درد کی شدت سے کراہا۔

"آہ......" معالج نے اسے سانس لینے کی ترغیب دی۔ دونوں کراہنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد معالج نے لڑکے کو خود سانس لینے کے لئے چھوڑ دیا۔

"آہ......" اب لیفٹیننٹ نے بھی لڑکے کو سانس لینے کی ترغیب دی۔

اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے حبشی کو سانس لینے پر آمادہ کرنے لگے۔ خاموش وادی...... ان مضحکہ خیز آوازوں سے گونج اٹھی۔ دہشت ناک سناٹا اس شور میں بدل گیا۔ جو عام امریکی فلموں کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ سہمے ہوئے، دبکے ہوئے پرندے بھی ہڑ بڑا کر چہکارنے لگے۔ مٹھاس سے عاری اور لرزا دینے والی چیکار دور جنگلوں میں چوپائے بھی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے، ان کی گڈمڈ آوازیں سن کر یوں لگ رہا تھا جیسے سینما ہال میں دو ریلیں ایک ساتھ چل رہی ہوں۔ اور آپ یہ امید نہیں رکھتے ہوں کہ آئندہ لمحوں میں آپ سے معذرت کرلی جائے گی اور فلم نئے سرے سے ایک بار پھر شروع ہوگی۔

مائیک سوچنے لگا...... "ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ناقابل قبول اس دہشت ناک صورت حال اور کلینسی اور اس کے ساتھیوں کی مکمل تباہی کا سبب جنگ ہی تو ہے...... یا جو بھی جنگ کا ذمہ دار ہے۔ اسے ایسی جگہ پر دفن کیا جانا چاہئے جہاں وہ کبھی اپنا سر نہ ابھار سکے اور اس نے یہ بھی سوچا کہ جنگل کے آغاز میں...... جہاں جنگ کے اثرات بکھرے ہوئے تھے انسانیت اختتام پذیر ہوچکی ہے۔ مرچکی ہے۔ اس سے آگے انسانیت قدم نہیں بڑھا سکتی۔ کیونکہ اس کے بال و پر جنگ کے ہولناک شعلوں نے جلا کر بھسم کردیئے ہیں!...... وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا کہ اس نے خود کو ایک زندگی کی واپسی کی خوشیاں مناتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھ گیا اور اس نے سوچا کہ الفا کمپنی دشمن لاسلکی سلسلے تباہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جو ہم یہاں موجود ہیں۔ ہم بھی تو لاشیں ان کے کان اور دوسرے بکھرے ہوئے اعضا اور اسلحہ جمع کرنے آئے ہیں!

"کیا اس کے بچنے کے آثار ہیں؟" لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

معالج نے اپنے مخصوص انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا اور محبت سے بانس کے بستر پر حبشی لڑکے کے دل کی دھڑکن سننے کے لئے جھک گیا۔

"نہیں......" اس نے سیاہ سینے سے کان ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں؟ کیا مطلب؟"

"اس لئے کہ ہم سب کو مردہ تصور کئے ہوئے تھے، ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں کوئی زندہ بچا ہوگا۔ اس لئے ہیلی کاپٹر میں کسی ایسی جگہ کی گنجائش نہیں رکھی۔ جہاں اس قسم کے زخمی کو لٹایا جاسکے۔"

"کیا خون کا ذخیرہ موجود ہے؟"

"نہیں...... ہم ساتھ نہیں لائے۔" معالج نے جواب دیا۔

"لیفٹیننٹ نے چند لمحوں کے لئے اس کے جواب پر غور کیا۔ پھر کہنے لگا۔

"کیا یہ گفتگو کرسکتا ہے؟"

"ہاں" معالج نے اپنا سفید ہاتھ حبشی لڑکے کی سیاہ آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ اس کی حرکت پر سیاہ آنکھوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"اس سے پوچھو کہ کلینسی کی لاش کہاں ہے؟ وہ کہیں نظر نہیں آیا؟"

معالج نے حبشی لڑکے کا چہرہ بڑے پیار اور شفقت سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگا۔

"تمہارے کیپٹن کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"وہ مرگیا۔" سیاہ ہونٹوں نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی لاش کہاں ہے؟"

"آر ٹی او کے آدمی......" حبشی لڑکا بس اتنا ہی کہہ سکا۔

معالج لیفٹیننٹ کی جانب مڑا اور اسے بتانے لگا۔

اسے "ایپل فنگر" کے لئے لے گئے ہیں۔

"کیا تم اس لڑکے کو مارفیا کا ٹیکہ نہیں لگا دیتے؟" لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ......"

"خطرہ ہے؟"

"ہاں!"

"کیا یہ مزید گفتگو کرسکتا ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ اس کے لئے بہتر ہوگا۔"

"ٹھیک ہے اسے خاموش ہی رہنے دو۔"

"لیفٹیننٹ ابھی خاموش ہی ہوا تھا کہ حبشی لڑکے کے سیاہ ہونٹ جنبش کرنے لگے۔

"وہ کتنے اچھے تھے۔"

"اسے خاموش رکھو۔" لیفٹیننٹ نے معالج کو حکم دیا۔ وہ کچھ جھنجھلایا ہوا تھا۔

"انہوں نے ہم سب کو ایک ایک گولی ماری۔"

لڑکا پھر بڑبڑایا۔ "وہ کتنے اچھے تھے۔"

"خدا کے لئے اسے چپ کراؤ۔"

"وہ کتنے اچھے تھے۔" لڑکا پھر بولا۔

"میں کہتا ہوں اسے خاموش کراؤ۔" لیفٹیننٹ چیخ اٹھا۔

☆......☆......☆

مائیک...... لیفٹیننٹ کو اس عالم میں دیکھ کر بے اختیار سوچنے لگا کہ "جنگ کتنی اچھی ہوتی ہے۔" پھر چاروں طرف بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ آر۔ او۔ ٹی۔ سی...... ایسی تو نہ تھی لیکن جنگ نے ہر ایک کو یہ اجازت دے دی ہے کہ کسی کو معاف نہیں کیا جاتا۔ اسے انہی لاسلکی آلات کا خیال آیا۔ جو کلینسی نے حاصل کئے تھے اور اس نے سوچا کہ انسان پڑھتا اور سوچتا ہے لیکن پھر بھی منفی ذہنیت اس پر حاوی رہتی ہے اور اس نے سوچا برا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز بری ہے تو وہ صرف جنگ ہے جو انسان کو برا۔ وحشی اور درندہ صفت بنا دیتی ہے۔"...... پھر وہ اونچی اور الجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اگر فوٹو گرافروں نے اپنا کام ختم کرلیا ہے تو اب لاشوں کو سمیٹنے میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔"

اس کی آواز سن کر سب سن ہوگئے۔ وادی میں پہلے جیسی بھیانک خاموشی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے ایشیا کی سرزمین سناٹے کی زبان میں سفید فام مداخلت کاروں کو انتہائی درشت تنبیہ اور تلافی کی دھمکی دے رہی ہو۔ لیکن یہ تو ایک مابعد الطبیعیاتی مسئلہ ہے۔ لیفٹیننٹ نے سوچا...... "صرف وکٹر چارلی ہی خطرے کا سبب بن سکتا ہے...... حملے کا خوف مجھے بھی ہونا چاہئے۔ یا پھر یہ خوف کلینسی کا تھا جواب مرچکا ہے۔"

چند لمحوں کے ٹھہرا دینے والے سکوت کے بعد لیفٹیننٹ کی مردہ اور بے جان آواز وادی میں گونجنے لگی۔

"جب تم کسی لاش کے ٹکڑے جمع کرو تو یہ اطمینان کرنے کے بعد ہی انہیں تھیلے میں ڈالو کہ وہ ایک ہی انسان کے مختلف حصے ہیں، یاد رکھو کہ ایک انسان کے دو ہاتھ...... دو پاؤں اور ایک سر ہوتا ہے...... میں ایک تھیلے میں دو انسانی سر نہیں دیکھنا چاہتا۔ سمجھے!" اور لیفٹیننٹ سوچنے لگا...... "کلینسی مرچکا ہے...... لیکن کسٹر کے جراثیم کی طرح...... اس کے جراثیم کے اثرات بھی دیر تک قائم رہیں گے۔ کسٹر نے گاؤں کے گاؤں اجاڑ دیئے...... اسے اپنے ہم وطنوں کو تباہ کرنے میں

لذت ملتی تھی۔" پھر وہ بڑبڑانے لگا۔

"ذرا سنو تو کلینسی! میں اپنا سارا وقت آر او ٹی سی کے مقابلے میں ہی صرف نہیں کرتا۔ اپنا کچھ وقت میں لائبریری میں بھی گزارتا ہوں۔ تم نے یہاں جو کچھ کیا وہ نیا نہیں ہے۔ سنو کلینسی! "سینڈ کریک" میں ریڈ انڈینز کے قتل عام میں ملوث لیفٹیننٹ جیمز ڈی کونز کی بات سنو...... قتل عام کے اگلے روز میں نے کسی ریڈ انڈین مرد۔ عورت یا بچے کی ایک بھی ایسی لاش نہیں دیکھی تھی۔ جس کی گردن ہم نے اس کے دھڑ سے الگ نہ کی ہو۔ لاشوں کو بے دردی اور سفاکی سے مسخ کردیا گیا تھا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کے اعضائے مخصوصہ کاٹ دیئے گئے تھے۔ میں نے ایک شخص کو کسی عورت کے اعضائے مخصوصہ چھڑی پر سجائے گھومتے دیکھا تھا۔ اور کئی لوگوں نے عورتوں کے اعضائے مخصوصہ اپنی ٹوپیوں پر لگا رکھے تھے...... کلینسی!...... میں نہیں سمجھتا کہ تم ان سے آگے نکل گئے ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ جنگ دیر کے بعد آئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ لاسلکی آلات (ہیڈ فون وغیرہ) کی ہوس نے تمہیں کسٹر سے آگے بڑھا دیا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے لیفٹیننٹ!" مائیک نے اس سے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ہو رہا ہے؟ نہیں...... میں تو سوچ رہا تھا۔"

"یہ حبشی لڑکا مرچکا ہے۔" معالج نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے حبشی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے تھیلے میں ڈال دو۔" اس نے حکم دیا۔

"تم کیا سوچ رہے تھے؟" مائیک نے پوچھا۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ پھر بوجھل اور تھکی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"ایسی صورت حال مجھے مضمحل کردیتی ہے۔"

"کیا تم نے پہلے بھی اتنی بربادی دیکھی ہے؟"

"نہیں میں نے اس سے پہلے اتنی تباہی کبھی نہیں دیکھی۔" لیفٹیننٹ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی مختصر سی زندگی میں کبھی ایسی خوفناک صورت حال سے دوچار نہیں ہوا۔ تم مجھ سے یہی بات کہلوانا چاہتے تھے نا......!"

"کیا تم برا مان گئے ہو؟" مائیک نے پوچھا۔

"نہیں......" لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔ "میں غلط سمجھا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔"

وہ خاموش ہوا...... اور اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں نے ایک ایسی آواز سنی۔ جو اس کے رگ و پے میں ٹھنڈی لہر بن کر دوڑ گئی۔ یہ آواز مارٹر شیل کے ٹیوب میں اتارے جانے کی تھی۔ اس نے بارہا یہ آواز سنی تھی۔ اس کے بعد ٹیوب سے شیل کے اخراج کی چیخنی...... دھاڑتی اور سرسراتی ہوئی آواز...... پھر لیفٹیننٹ کی کمپنی کی جانب شیل کے سفر کی آواز...... ویت نام کی موسیقی...... جاری و ساری......! لیفٹیننٹ اپنی پوری قوت سے چلایا۔

"آ رہا ہے۔"

"آ رہا ہے؟ کہاں؟ کون؟ کیوں؟ سوال ذہنوں میں گردش کرنے لگے۔

شیل۔ ہیلی کاپٹر پر لگا۔ اور پھٹ کر آگ کے اونچے نارنجی ستون کی صورت میں جنگل میں پھیل گیا۔

"لاشوں کو اپنے قریب گھسیٹ لو۔ انہیں دفن کرنے کی کوشش کرو۔ انہیں آڑ کے طور پر استعمال کرو۔"

لیفٹیننٹ نے حلق پھاڑتے ہوئے حکم دیا...... پھر وہ بڑی نرمی سے مائیک سے کہنے لگا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم بھی یہاں پھنس گئے۔"

"نہیں تم اس کے ذمہ دار نہیں ہو۔" مائیک نے جواب دیا۔

"میں ریڈار پر امداد اور تحفظ کے لئے رابطہ کرتا ہوں۔"

"ہاں ضرور کوشش کرو۔" مائیک نے جواب دیا۔

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر:03

چاهت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو که پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی که دل کے هاتھوں مجبور اپنی خواهش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے هوئے بهی خوشی محسوس کرتے هیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بهی پروا نهیں کرتے۔ یه حقیقت کهانی میں پوشیده هے۔
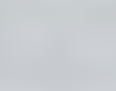
یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

ایک عجیب، پراسرار اور نہ صرف حیرت انگیز، بلکہ خوف ناک بات تھی۔

کیا لاش کو پدما لے گئی ہوگی......؟اس کے دل میں یہ خیال سا آیا۔

”لیکن نیلم کی لاش کو پدما کیوں اور کس لئے لے جائے گی......؟

اب جب کہ نیلم کا وجود ہی نہیں رہا......وہ زندہ ہونے سے رہی......قبر میں تو اس کی لاش گل سڑ گئی ہوگی...... اس نے کبھی قبر کھود کر نیلم کی لاش نہیں دیکھی......اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ محبت تو مردہ جسم سے نہیں کی جاتی ہے۔وہ اس کی آتما ہے۔چشم تصور میں نیلم کو دیکھ کر محبت بھری باتیں کرتا تھا۔“

نیلم کی دردناک موت کے بعد آکاش کا خیال تھا کہ پدما اس کا دکھ، درد اور غم بانٹنے کے لئے کسی لڑکی کے بہروپ میں آئے گی تاکہ صدمے کو ہلکا کرنے کے بہانے اس کے جذبات سے فائدہ اٹھائے......لیکن پدما نہیں آئی تھی......اسے احساس ہوگیا تھا کہ پدما جلد بازی سے کام نہیں لے گی......اس لئے کہ پدما کو اندازہ ہوگیا تھا کہ آکاش چوں کہ بہت زیادہ دکھی اور جذباتی ہوگیا ہے اور انتقام کے اندھے جنون میں مبتلا ہے اور اس کی نسل کو تیزاب سے جھلسا جھلسا کر مار رہا ہے وہ بھی اس کی زد میں آسکتی ہے۔اس کو نفرت، غصے اور انتقام کے جنون نے پاگل کر رکھا ہے اسے سرد ہونے دے......وقت کا مرہم نہ صرف اس کا زخم مندمل کردے گا......پھر وہ کسی لڑکی عورت کے دل کش اور قیامت خیز بہروپ میں اسے اپنے جال میں پھنسائے گی تب وہ نکل نہ سکے گا۔برف کی مانند پگھل جائے گا تب وہ اس سے فائدہ اٹھا کر خون پی جائے گی اور اسے اپنا اسیر بنا کر اور ناگ بنا کر اپنی دنیا میں لے جائے گی۔

ان خیالات کی گرداب میں اسے ایک اور خیال آیا کہ نیلم کی لاش سے بھی پدما نے اس لئے انتقام لیا ہوگا کہ وہ روز ہی دو تین مرتبہ نیلم کی قبر پر کھڑے ہو کر...... نیلم کو چشم تصور میں دیکھ کر باتیں کرتا رہتا ہے۔لہٰذا نیلم کی لاش غائب کردو۔پدما نے یقیناً نیلم کی لاش جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہادی یا ہوا میں اڑادی ہوگی۔

نیلم کے خیال کو وہ ذہن سے کیسے نکال سکتا تھا۔ انتقام کی پیاس کی شدت تھی کہ بڑھتی جارہی تھی کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جو وہ جنگل کی طرف جاکر کئی سانپوں، سنپولیوں اور ناگوں کو جھلسا کر نہ آتا ہو۔ایک روز وہ سہ پہر کے وقت گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ ایک نہایت

حسین اور نوجوان لڑکی اسے جھیل کے کنارے ملی جو اشنان کر کے اپنے لمبے لمبے گھنے ریشمی بال جو اس کے کولہوں پر اور پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ سلجھا رہی تھی تاکہ خشک ہو جائیں۔

آکاش نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ سڑک پر نیلم کے خیالوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ اس لڑکی نے بلند آواز سے پکارا۔

"آکاش...... آکاش......! رک جاؤ...... ادھر آؤ...... میں آ رہی ہوں۔"

آکاش نے ایک دل کش نسوانی آواز سن کر اس سمت دیکھا۔ ایک نہایت حسین لڑکی جو قیامت سے کم نہ تھی اس کی طرف لپکتی آ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں کے بعد اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے بدن سے نہ صرف بلکہ بالوں سے بھی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہی تھی۔

"آکاش......! تم نے مجھے پہچانا......؟" اس کے شانے سے ساڑی کا پلو سرسراتا ہوا زمین پر اس کے قدموں میں گرا۔ اس لڑکی نے پلو اٹھا کر شانے پر درست کرنے میں عجلت نہیں کی تاکہ آکاش ہیجان خیز نظارے سے محظوظ ہو جائے۔ لیکن آکاش کی نگاہیں اس نظارے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ جب وہ ایستادہ ہوئی تو آکاش بولا۔

"میں تمہیں پہچان نہیں سکا...... تم کون ہو؟"

"میں سروجا ہوں آکاش......!" لڑکی نے جواب دیا۔ "میں کالج میں نیلم کی گہری سہیلیوں میں سے تھی۔"

آکاش اسے پہچان نہ سکا۔ کیوں کہ کالج میں ایک نہیں بیسوں نوجوان اور حسین لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ لڑکیاں اس کی اور نیلم کی پرستار تھیں۔ وہ لڑکیوں سے اس لئے بھی دور رہتا تھا کہ وہ ان سے محبت اور دوستی کرنے نہیں بلکہ پڑھنے آتا تھا۔ وہ تو اس پر ایسی مرتی تھیں کہ وہ پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کے لئے بے تاب رہتی تھیں۔ اسے تو چند لڑکیوں کے سوا کسی کی صورت یاد تک نہ تھی۔ سروجا اتنی حسین اور پرکشش تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد بھولنا مشکل تھا۔

"مس سروجا......! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو پہچان نہ سکا۔" آکاش معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

"نیلم کی موت کا صدمہ اتنا گہرا ہے کہ آپ شاید سب کو بھول چکے ہیں۔" سروجا بولی۔ "نیلم کی افسوسناک موت کی خبر سن کر میں اور لڑکیوں کے ساتھ آپ کے گھر پرسہ دینے آئی تھیں۔"

"شما کرنا...... مجھے بالکل بھی یاد نہیں۔" وہ بولا۔

"کیا آپ یہیں کہیں آس پاس رہتی ہیں؟"

"ادھر جو کالونی ہے وہاں رہتی ہوں......" سروجا کہنے لگی۔ "مجھے جھیل میں نہانا اور تیرنا اچھا لگتا ہے...... میں دو ایک دن میں جھیل میں تیرنے اور نہانے آ جاتی ہوں۔ اپنی کسی ایک سہیلی کے ساتھ یا پھر اکیلی...... جب درختوں سے گھری جھیل پر کوئی نہیں ہوتا ہے اس لئے آزادی، سکون اور اطمینان سے نہانے میں بڑی لذت ملتی ہے...... چوں کہ یہ گزرگاہ نہیں ہے اور پھر درختوں کی وجہ سے کسی کی نظر میں آنے کا امکان نہیں ہوتا ہے......"

پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"آکاش صاحب......! نیلم کی موت اور غم سے آپ بہت زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ آپ نے دل پر بہت اثر لیا ہے۔"

"اس لئے کہ مجھے اور نیلم کو بھی...... ایک دوسرے سے بے انتہا محبت تھی...... یہ بات سبھی جانتے ہیں۔ میں اس کی موت سے اور صدمے سے ٹوٹ گیا ہوں۔ اس کی یاد اتنی ستاتی ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"آخر کب تک یہ غم اور صدمہ سہتے رہیں گے......" سروجا بولی۔

"میں نہیں جانتا...... کچھ نہیں کہہ سکتا......"

آکاش نے کہا۔ سرد آہ بھری۔ "میں کیا کروں۔"

"آپ کو چاہیے کہ نیلم کی یاد سینے سے لگائے رہنے سے بہتر ہے کہ اپنے آپ کو سنسار کی دلچسپیوں میں گم کر دیں۔" سروجا کہنے لگی۔ "اس لئے کہ غم اور یاد کرتے رہنے سے نیلم کی آتما دنیا میں آنے سے رہی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" آکاش نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ "اس دنیا میں کوئی رونق اور دل کشی نظر نہیں آتی......"

"کیوں نہیں ہے......" سروجا ہنس پڑی۔ "دنیا میں سب سے بڑی رونق اور دلکشی عورت میں ہے...... کسی لڑکی کو دوست یا ساتھی بنا لیں وہ آپ کا غم دور کر دے گی...... مثلاً میں نیلم کی کمی تو دور نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کا خلا تو پر کر سکتی ہوں...... میں چوں کہ کالج میں آپ سے خاموش محبت کرتی تھی...... میرے دل میں بڑے ارمان تھے کہ آپ کی جیون ساتھی بن جاؤں...... جب آپ کو اور نیلم کو محبت کرتے دیکھا تو سپنوں میں آپ سے محبت کرنے لگی۔ دل میں یہ آرزو آپ کی شادی تک رہی تھی کہ صرف ایک مرتبہ آپ پر مہربان ہو جاؤں...... آپ کا قرب حاصل کر لوں...... لیکن یہ آرزو...... آرزو ہی رہی...... اب آپ کو اکیلے دیکھا تو میری سوئی ہوئی آرزو جاگ اٹھی...... چلیں...... کنارے پر چلیں...... یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے...... میں نیلم کی جگہ لے لوں گی...... آپ نیلم کو یاد اور غم کو بھول جائیں گے......"

سروجا نے اس کے قریب ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور آکاش کو خود سپردگی سے دیکھنے لگی۔

سروجا کا اتنی جلدی بہک جانا آکاش کے دل کے کسی کونے میں شکوک و شبہات جنم لینے لگے...... وہ برہمی سے بولا۔

"سچ بتاؤ...... تم کون ہو......؟ تم اس قدر حسین لڑکی ہو کہ کالج میں پڑھ رہی ہوتیں تو بھولنے والی نہیں تھیں...... جو ایک مرتبہ تمہیں دیکھ لے وہ کبھی نہ بھول سکے...... کالج سے جو لڑکیاں لڑکے مجھے پرسہ دینے آئے تھے تم ان میں نہیں تھیں۔ ہوتیں تو کیا میں اتنی حسین صورت بھول جاتا......؟"

"ہاں...... میں نے اس لئے جھوٹ بولا کہ آپ کا دل جیت لوں...... آپ کی محبت پا لوں...... آپ کی سیوا کرتے ہوئے اپنی ساری زندگی ایک باندی کی طرح آپ کے چرنوں میں گزار دوں...... آپ کو اس طرح خوش کرتی رہوں گی کہ نیلم کو بھول جائیں گے...... اس کی یاد کبھی نہیں آئے گی......"

آکاش کی نظروں کے سامنے ایک دم سے دھند چھٹ گیا...... اسے ایسا لگا کہ وہ کوئی ڈائن...... یا ناگن ہے...... نیلم کی یاد کو کم اور مٹانے کے لئے وہ قبر سے نیلم کی لاش نکال کر لے گئی۔ تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری...... نیلم کی لاش اور قبر ہونے سے وہ اسے یاد کرتا رہے گا...... لاش نہ ہونے سے نیلم کی محبت اور یاد دل سے نکل جائے گی۔

"تم مجھے دھوکا نہ دو......" آکاش کو غصہ آ گیا۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو...... سچ سچ بتاؤ تم کون......؟"

"تمہاری داسی...... تمہاری محبت میں پاگل ہو کر آئی ہوں۔" اس نے محبت بھری نظروں سے گھورا۔

"تم...... انسان نہیں ہو...... ڈائن ہو...... یا پھر ناگن...... تم نیلم کی لاش قبر سے نکال کر لے گئی ہو...... اسے جلا کر بھسم کر دیا اور مجھے ڈسنے آئی ہو...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......"

سروجا کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا تو آکاش نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ سروجا نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اس جدوجہد میں وہ دونوں زمین پر گر گئے۔ وہ سروجا کے سینے پر سوار ہو گیا تاکہ اس کا گلا گھونٹ کر ختم کر دے...... وہ بے آب ماہی کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کا لباس بے ترتیب اور بکھرتا جا رہا تھا...... اس کا تراشیدہ دہکتا ہوا گداز بدن...... آکاش کے بھاری جسم کے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ سروجا نے اپنا لباس اپنے ہاتھوں سے تار تار کر دیا۔ اس کا پورا سراپا کسی پردہ کے بغیر آکاش کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

آکاش ایک لمحے کے لئے اس کے سراپا میں ایسا کھویا کہ سروجا نے فائدہ اٹھایا اور آکاش کو کسی نوزائیدہ بچے کی طرح اچھال کر زمین پر پھینک دیا۔ سروجا کی یہ قوت اس کے لئے حیران کن تھی۔ سروجا جھیل کی طرف سرعت سے دوڑ پڑی۔ آکاش فوراً سنبھل کر اس کے تعاقب میں کوندا بن کر لپکا تاکہ سروجا کو انجام تک پہنچا سکے...... چند قدموں کے بعد سروجا نے ایک دم سے بہروپ بدلا اور ناگن بن گئی۔ اس جگہ ایک بل تھا اس میں گھس گئی۔ وہ رک گیا۔ بل کا منہ بھی آپ ہی آپ بند ہوگیا۔

وہ بہت دیر تک ایک درخت کے نیچے ایک ہاتھ میں بڑا سا پتھر اور اسپرے کی بوتل لئے بیٹھا رہا۔ شاید وہ نکل آئے۔ جب دن ڈوبنے لگا اور ناگن باہر نہیں نکلی تو وہ ناامید سا ہوکر گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن اس نے اتنا جان لیا تھا کہ یہ پدما نہیں تھی۔ جو بھی تھی وہ نیلم کو قبر سے نکال کر لے گئی تھی۔

آکاش جب سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو اسے اپنی عجلت اور حماقت پر بڑا افسوس ہوا...... اس نے سوچا کہ کیا حرج تھا وہ سروجا کو اعتماد میں لے کر نشاط انگیز لمحات کے دوران غیر محسوس انداز سے معلوم کرلیتا کہ نیلم کی لاش کا اس نے کیا کیا...... وہ نیلم سے نفرت کا اور اس سے محبت کا اظہار کرکے بہت کچھ اگلوا سکتا تھا۔ سروجا اس کے دام میں آجاتی...... اس نے ایک بڑا اچھا موقع کھودیا تھا۔ اب پچھتانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ بڑی دیر تک کف افسوس ملتا رہا۔

اس ناکامی نے آکاش کے وجود کو زخمی کرکے رکھ دیا تھا...... وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سروجا کون تھی......؟ کیوں آئی تھی......؟ آخر اس کی نیلم سے ایسی کیا نفرت اور دشمنی تھی جس نے نیلم کی لاش قبر سے نکال کر غائب کردی تھی...... یہ بات ایک معمہ بن گئی تھی...... بڑی پراسرار تھی۔ پدما کو لاش غائب کرنے کی کیا ضرورت تھی...... اسے لاش غائب کرنی ہوتی تو اسی دن کرلیتی جب اسے ڈس کر موت کی آغوش میں دھکیل دیا تھا۔

جب اس کی آنکھ لگی تو اس نے ایک سپنا دیکھا۔ اس سپنے میں اس نے سروجا اور نیلم کو دیکھا۔ کالج میں ایک ورائٹی شو کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نیلم سپیرن بنی تھی۔ اسے بین پر رقص کرنا تھا۔ بین بجانے کے لئے ایک سپیرے کی خدمت حاصل کی گئی تھی۔ موسیقی کی دھن پر نیلم نے رقص شروع کیا۔ پھر سپیرے نے بین بجانا شروع کیا۔

اس وقت ایک ناگن ادھر آنکلی تھی۔ اس نے پدما سے آکاش کی بڑی تعریف سنی تھی کہ ایسا تصوراتی راج کمار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ سروجا ناگن کے بہروپ میں اسٹیج کے پردے کے پیچھے تھی وہ بین پر رقص کرتی رہی۔ اسے کسی نے دیکھا نہیں...... جب نیلم نے اپنا دل فریب اور دلکش رقص ختم کیا تو پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا...... سپیرا نے بین بجانا ختم کردیا۔ پھر وہ اپنا انعام لے کر چل دیا۔

سروجا ناگن نے لڑکی کا روپ بھرا اور متلاشی نظروں سے حاضرین پر نگاہ ڈالی تاکہ آکاش کو دیکھے۔ اس نے آکاش کو لمحے میں تلاش کرلیا اور پہچان لیا تھا۔ وہ حاضرین میں سب سے منفرد، خوب صورت اور پروقار دکھائی دیتا تھا۔ ایک تصوراتی راج کمار کی طرح...... پدما نے اس کی تعریف میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ آکاش کو دل دے بیٹھی اور اس کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اسے اپنے دل اور جذبات پر قابو نہیں رہا تھا۔

وہ یہ بات جانتی تھی کہ پدما آکاش سے عشق کرتی ہے۔ پدما نے اس سے چیلنج کے انداز میں کہا تھا کہ آکاش اس کا ہے۔ آکاش کو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا ہے...... سروجا کو احساس تھا کہ پدما نہایت حسین و جمیل ہے۔ اس کے حسن کے باوجود کوئی بھی ناگن مات نہیں دے سکتی...... لیکن جہاں تک حسن کی کرشمہ سازیاں تھیں وہ غیر معمولی تھیں۔ اسے اپنے سراپے پر بڑا ناز و غرور تھا کتنے ناگ اس کے حصول کے لئے پاگل

تھے۔ لیکن وہ کسی ناگ کو سرفراز کرنے کے بجائے انسان پر مہربان ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے کسی ناگ کو چھونے نہیں دیا تھا۔

ورائٹی شو ختم ہونے کے بعد لڑکیوں نے آکاش کو اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ سروجا کو اس وقت علم نہیں تھا کہ نیلم اور آکاش ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ نیلم کے حسن نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس وقت اس نے نیلم کو دیکھا تھا جو ایک طرف کھڑی آکاش کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سروجا لڑکیوں کو چیرتی ہوئی آکاش کی طرف بڑھنے لگی تو نیلم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔ "کون ہو تم......؟" "تم کالج کی تو دکھائی نہیں دیتی ہو......؟ کہاں سے آئی ہو؟"

"میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آئی ہوں...... وہ اس بھیڑ میں ہے...... لیکن تم مجھے آکاش کے پاس جانے سے کیوں روک رہی ہو...... وہ میرے من میں بس گیا ہے...... میں اس سے آٹوگراف لینا چاہتی ہوں۔ اس نے گیت گا کر دل جیت لیا ہے۔"

"تم یہیں کھڑی رہو......" نیلم نے سخت لہجے میں کہا۔ "آگے جانے کی کوشش مت کرو۔ بدنظمی پیدا ہوجائے گی۔"

"میری بلا سے......" سروجا اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "میں دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے آگے جانے سے......"

"میں......" نیلم بولی۔ "میں اس کالج کی یونین کی سیکریٹری ہوں۔ تمہیں اجازت نہیں دے سکتی...... یہ میری ذمے داری ہے کہ افراتفری پیدا نہ ہونے دوں......"

سروجا ضد میں آکر آگے جانے لگی تو نیلم نے قریب کھڑی ہوئی دو لڑکیوں سے کہا۔

"کامنی اور سرلا دیوی...... یہ لڑکی سوسن کالج کی معلوم ہوتی ہے جو رنگ میں بھنگ ڈالنے اور آکاش کو پریشان یا نقصان پہنچانے کے خیال سے آئی ہے۔ اسے نرمی اور شائستگی سے کالج سے باہر لے جاؤ اور چوکیدار سے کہو اسے اندر گھسنے نہ دے۔"

"اگر ان لڑکیوں نے میرے ساتھ بدتمیزی کی اور مجھے ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا۔" سروجا دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

"تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی جائے گی۔" نیلم بولی۔ "بہتر ہے تم خود ہی باہر چلی جاؤ۔"

"میں نہ صرف آکاش کا آٹوگراف لینا چاہتی ہوں بلکہ اس سے ہاتھ بھی ملانا چاہتی ہوں۔" سروجا نے تنک کر کہا۔

"اس وقت بہت بھیڑ ہے اور رات بیتی جارہی ہے۔" نیلم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسا کرو کسی دن ہمارے کالج آجاؤ۔ آکاش سے مل لینا اور آٹوگراف بھی لے لینا۔"

"نہیں......" سروجا نے تیز اور غصہ بھرے لہجے میں کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت آکاش سے مل کر رہوں گی۔"

"تم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آؤ گی۔" نیلم نے اسے جواب دے کر کامنی اور سرلا دیوی سے کہا۔ "مجبوری ہے...... اسے باہر کا راستہ دکھاؤ۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔"

ان دونوں لڑکیوں نے اس کی ایک ایک بانہہ پکڑی اور اسے غیر محسوس انداز سے جبر، زیادتی سے کالج سے باہر لے گئیں پھر واپس آگئیں۔ تھوڑی دیر بعد پروگرام کے منتظمین نے کہا کہ روشنیاں گل کی جارہی ہیں۔ لہٰذا پنڈال خالی کردیا جائے۔ یہ پنڈال کالج کے وسیع و عریض احاطے میں لگایا ہوا تھا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی لڑکے لڑکیاں کالج سے باہر نکلنے لگیں۔

اس وقت سروجا کالج کے باہر نفرت اور غصے سے ٹہل رہی تھی۔ اسے نیلم پر بہت غصہ آیا تھا۔ جب نیلم باہر آئی تو اسے چکار کا مخاطب کیا تھا۔ "تم نے میری بڑی بے عزتی کی۔ ذلیل کیا۔ جب کہ میں مہمان تھی۔ میں تم سے اس توہین کا بدلہ لے کر رہوں گی۔"

آکاش...... نیلم کو اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔

اتفاق سے آکاش نے سروجا کو نہیں دیکھا۔ وہ اس وقت دوستوں سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ نیلم نے اسے راستے میں سروجا کے بارے میں بتایا تھا۔

سروجا ناگن کے بہروپ میں آکر نیلم اور آکاش کے تعاقب میں تھی...... اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ نیلم کو موت سے ہم کنار کرنے کے بعد آکاش کو جیت لے گی۔ اسے اس وقت تک آلودہ کرتی رہے گی جب تک پدما آکاش کو اپنا اسیر اور ہم جنس بنا کر نہ لے جائے گی۔ لیکن سروجا کو نیلم کو ڈسنے اور کامیاب ہونے کا موقع نہ مل سکا تھا...... اس روز کے بعد وہ نیلم کو ڈسنے کے لئے گھات میں رہی تھی لیکن وہ اس سے محروم رہی تھی۔ پھر پدما نے نیلم سے بدلہ لیا اور اسے ڈس لیا اور اسے یہ کہہ کر اپنی دنیا میں چلی گئی کہ وہ کچھ عرصے کے بعد واپس آئے گی۔ کیوں کہ اس وقت آکاش اس کے انتقام کے جنون میں پاگل ہو رہا ہے...... اگر تم آکاش سے رنگ رلیاں منا سکتی ہو تو میرے آنے تک منالو...... جھیل پر آکاش کو شک ہو گیا تو وہ فرار ہو گئی۔ ورنہ آکاش اسے تیزاب سے جھلسا کر ختم کر دیتا۔

آکاش کے سپنے میں یہ تمام واقعات کسی فلم کے مناظر کی طرح آتے رہے تھے۔ آکاش نے بیدار ہونے کے بعد سوچا کہ اب اسے بہت ہوشیار اور محتاط رہنا ہوگا۔ اب اس کا مقابلہ دو ناگنوں سے ہے۔ سروجا صرف نفسیاتی خواہش رکھتی ہے۔ وہ کسی بھی لڑکی یا عورت کے بہروپ میں آ سکتی ہے...... جب کہ پدما اس پر جادو کر کے اسے سانپ بنا کر اپنی دنیا میں لے جانا چاہتی ہے...... نیلم کی لاش کا قبر سے پراسرار طور پر غائب ہو جانا اسے یہ حرکت اور سازش سروجا کی لگی تھی۔

جانے کیوں اسے ایک آوارہ سا خیال آیا تھا کہ...... کاش! اس نے سروجا سے فائدہ اٹھایا ہوتا۔ جذبات کو آسودگی بخشی ہوتی اس لئے کہ وہ نیلم کی طرح شعلہ بدن تھی۔ وہ صرف اور صرف اس کے ساتھ اپنے جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ وہ سروجا سے بے پناہ محبت کا اظہار کر کے اعتماد میں لے لیتا اور نیلم کی لاش کے راز کے بارے میں معلوم کر لیتا۔

یہ سپنا نہ دیکھتا تو اسے سروجا کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہوتا۔ لیکن اس سپنے میں یہ بات اس کے علم میں نہ آ سکی کہ نیلم کی لاش کیا ہوئی......؟ لیکن اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ حرکت پدما کی ہو گی اس لئے کہ نیلم کی قبر سے اس کی یاد اور زخم تازہ رہیں گے۔ اس لئے اس نے نیلم کی لاش قبر سے نکال کر اس کا وجود اس سنسار سے مٹا دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے غم کی شدت میں کمی آتی گئی۔ لیکن وہ برابر سانپوں سے انتقام لیتا رہا۔ تیزاب سے جھلسا جھلسا کر مارتا رہا۔

☆......☆......☆

ایک روز وہ کسی کام سے قریبی بستی میں جا کر لوٹ رہا تھا۔ جھیل کے پاس والی سڑک سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک دل خراش نسوانی چیخ سنی......

"بچاؤ...... بچاؤ......"

آکاش نے نسوانی چیخ سن کر یہ سمجھا کہ شاید کوئی لڑکی اکیلی جھیل پر نہا رہی ہو گی۔ کوئی سانپ نکل آیا ہوگا۔ کہیں سروجا نہ ہو...... اس روز سروجا ایک بل میں گھس گئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ جھیل کی طرف کوندا بن کر لپکا۔ پھر اس کی حدود میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

جھیل کے کنارے تین بدمعاشوں نے جو مسلح تھے ایک نہایت حسین لڑکی کو قابو میں کر کے اسے بے بس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کا لباس تار تار کر دیا تھا۔ لڑکی ان کی گرفت سے نکلنے کی مزاحمت اور جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ بدمعاش چاقوؤں سے مسلح تھے۔ اس کے باوجود لڑکی خوف زدہ نہیں ہو رہی تھی۔ اپنی عزت بچانے کے لئے جان پر کھیل رہی تھی۔ پھر ایک بدمعاش نے لڑکی کے سر پر پتھر دے مارا تو وہ اس کی ضرب کی تاب نہ لا کر ایک بدمعاش کے بازوؤں میں جھول گئی اور زمین پر گر پڑی۔

آکاش ان تینوں بدمعاشوں کو پہچانتا تھا جو اس کی بستی کے تھے، بے حد خطرناک، سفاک اور خون

آشام بھیڑیے تھے۔ لوگ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ وہ جیل سے ایک جرم کی پاداش میں سزا بھگت کر تین دن قبل ہی آئے تھے۔ وہ کہیں سے کسی لڑکی کو اغوا کر کے لائے تھے اور اس کی بے حرمتی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے آکاش کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔ جب آکاش نے انہیں للکارا تو وہ ایک دم سے چونکے۔

"موتی لال......!" آکاش نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔ "اس معصوم لڑکی کی عزت برباد مت کرو۔"

"آکاش جی......!" موتی لال نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "آپ اپنے گھر جائیں۔ ہمارے شبھ کام میں رکاوٹ نہ بنیں۔"

"یہ شبھ نہیں...... برا کام ہے......" آکاش نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔

"شوق پورا کرنے کے لئے مال کی ضرورت ہوتی ہے۔" بدمعاش گپتا نے کہا۔ "یہ لڑکی مفت کا مال ہے۔ ایسی لڑکی کہاں ملے گی؟"

"اچھا میں مال دیئے دیتا ہوں۔" آکاش نے کہا۔

"ہم بڑی مشکل سے اس پر قابو پا کر اغوا کر کے لائے ہیں۔" موتی لال کہنے لگا۔ "اس نے ہمارا حشر نشر کر دیا...... یہ دیکھو اپنے ناخنوں سے میرا چہرہ لہولہان کر دیا۔ خراشیں ڈال دیں...... سبھاش داس کی کلائی کاٹ لی۔ گپتا کے منہ پر تھوکا اور تھپڑ مارے...... ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے...... اپنے ٹھکانے پر لے جا کر جی بھرنے تک رکھیں گے۔"

"اس نے اپنی عزت بچانے کے لئے مزاحمت کی تھی۔" آکاش نے لڑکی کا دفاع کیا۔ "اسے دوش نہ دو۔ میں اتنی رقم دیتا ہوں کہ بازار میں دل بہلا سکو۔"

"اب تم جاؤ......" موتی لال بولا۔ "تا کہ ہم اپنے ارمان پورے کر سکیں اور اسے اپنے ٹھکانے پر لے جا سکیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم تینوں اس لڑکی کو چھوڑ کر جاؤ۔" آکاش بولا تا کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد اسے اس کے گھر پہنچا آؤں۔"

"نہیں...... ہم اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" گپتا نے کہا۔ "ہم بے وقوف نہیں ہیں۔"

"میں اس کی عزت پامال ہونے نہیں دوں گا......؟" آکاش نے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر تم تینوں اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو چلے جاؤ اس لڑکی کو چھوڑ کر...... ورنہ......"

"ورنہ کیا......؟" موتی لال نے درمیان میں استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"تم تینوں کو ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ ساری زندگی یاد کرو گے؟"

وہ تینوں اس کی دھمکی سن کر ہنسنے لگے۔ پھر موتی لال حقارت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"آکاش......! تمہاری جوانی اور زندگی پر ترس آ رہا ہے...... ہم تین ہیں اور تم ایک ہو...... اور ہم تینوں مسلح بھی ہیں...... ہمارے پاس خوف ناک چاقو ہیں...... لہٰذا تم ہماری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ تا کہ ہم جشن منائیں۔ تم رکاوٹ بنو گے تو پھر تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی بستی والوں کو......"

آکاش جواب دینے کے بجائے ان کی طرف بڑھا۔ اس نے چشم زدن میں تیزاب کی بوتل نکال کر باری باری ان کے ہاتھوں، جسم اور چہروں پر پچکاریاں مار دیں...... ان کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر زمین پر گر پڑے...... وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگے۔ تیزاب نے انہیں اس بری طرح جھلسا دیا تھا کہ وہ تکلیف جلن اور اذیت سے تڑپ گئے ان کا تڑپنا نا قابل برداشت ہوتا گیا۔ آکاش نے ان کا تعاقب کیا تا کہ انہیں اور دہشت زدہ کر دے۔ نہ صرف ان کے چہرے اور آنکھیں بھی متاثر ہو گئی تھیں۔

آکاش کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس نے ان سفاک مجرموں کو عبرتناک سزا دے دی۔ اب وہ اس کے ڈر اور خوف سے بستی سے ہمیشہ کے لئے نکل جائیں

گے۔۔۔۔۔۔اور پھر اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ لڑکی کے لئے واپس آئیں گے۔

وہ اس لڑکی کے پاس آیا تو وہ بے ہوشی کی حالت میں زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

آکاش نے اسے غور سے دیکھنے کے بجائے اس کا لباس جو دھجیوں کی شکل میں تھا اس کے بدن پر ڈال دیا اور گھر کی طرف لے چلا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راستے میں بستی کے کسی آدمی، لڑکی اور عورت سے مڈبھیڑ نہ ہوجائے۔ وہ اس لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر اسے شک کی نظروں سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اسے راستے میں کوئی نہیں ملا۔

آکاش نے گھر پہنچ کر اپنی خواب گاہ میں لے جاکر بستر پر لٹا دیا۔ پھر اس کے جسم پر چادر ڈال کر گلے تک ڈھانپ دیا۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ اس کی صورت دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ لڑکی نے نیم بے ہوشی کی حالت میں لمحے کے لئے آنکھیں کھولیں اور بند کرلیں۔

اس کے چہرے کی شباہت حیرت انگیز طور پر نیلم سے ملتی جلتی تھی۔ گو وہ جڑواں نہیں بلکہ سگی بہن کی سی لگتی تھی۔ اور پھر اس کی ستارہ آنکھیں۔۔۔۔۔۔ نیلم کی آنکھوں کی سی تھیں۔۔۔۔۔۔ کہیں یہ نیلم کا تیسرا جنم تو نہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ کوئی سا بھی جنم اتنی جلدی نہیں ہو پاتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ اٹھارہ برس کی نوجوان لڑکی تھی۔

آکاش نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ رفتہ رفتہ ہوش میں آتی گئی۔ پوری طرح ہوش میں آتے ہی وہ بری طرح چونکی۔ اس نے متوحش نظروں سے آکاش کو دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ کون۔۔۔۔۔۔؟ آپ کون۔۔۔۔۔۔؟ وہ تینوں بدمعاش کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔؟ میں کہاں ہوں۔۔۔۔۔۔؟"

"آپ چنتا نہ کریں۔۔۔۔۔۔ گھبرائیں نہیں۔۔۔۔۔۔ میں آپ کا دوست ہوں۔۔۔۔۔۔ میں نے ان تینوں بدمعاشوں کو بھگا دیا جو آپ کو اغوا کرکے جھیل پر لے گئے تھے۔۔۔۔۔۔ اب نہ تو آپ کو کوئی خطرہ ہے اور نہ عزت کو۔۔۔۔۔۔ آپ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہیں۔۔۔۔۔۔ پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔۔"

"وہ بڑے خطرناک اور ظالم بدمعاش ہیں۔۔۔۔۔۔" وہ سراسیمگی سے کہنے لگی۔ "انہوں نے مجھے اغوا کرتے ہوئے دست درازی کی۔۔۔۔۔۔ میں ان کا تشدد برداشت نہ کرسکی۔۔۔۔۔۔ بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو جھیل کے کنارے پایا۔ ان تینوں نے مجھے حکم دیا کہ میں جھیل میں چل کر ان کے ساتھ نہاؤں۔۔۔۔۔۔ میں انکار کرکے ایک طرف بھاگنے لگی تو مجھے دو بدمعاشوں نے دوڑ کر پکڑ لیا۔ میں نے مزاحمت کی تو میرا لباس تار تار کردیا۔۔۔۔۔۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ ان کی وحشیانہ حرکتوں اور دست درازیوں پر مدد کے لئے چیخی۔ پھر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ اگر وہ آگئے تو نہ صرف آپ کو قتل کردیں گے بلکہ میری عزت بھی لوٹ لیں گے۔"

"آپ شانتی رکھیں۔" آکاش نے دلاسا دیا۔ "میں نے انہیں ایسا سبق دیا ہے کہ وہ معذور ہوگئے ہیں۔"

پھر اس نے مختصر طور پر اس لڑکی کو سارا واقعہ سنایا تو وہ سن کر ایک دم سے خوش ہوگئی۔

"آپ نے انہیں جھلسا کر شبھ کام کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اب وہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالنے کے قابل بھی نہیں رہے۔"

"آپ کون ہیں۔۔۔۔۔۔؟" آکاش نے پوچھا۔۔۔۔۔۔ "ان بدمعاشوں نے آپ کو کہاں سے اغوا کیا؟"

"میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔۔۔۔۔۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا نام امرتا ہے۔۔۔۔۔۔ میں ہندو پور کی ہوں۔ میری ماں کا دو مہینے پہلے دیہانت ہوگیا۔ میرے پڑوس میں ایک جوان لڑکی درگا ہے۔ میرے باپ کے پاس چونکہ بہت دولت ہے اس لئے درگا نے اپنی عمر کا بھی خیال نہیں کیا۔ وہ عمر میں مجھ سے دو برس چھوٹی ہے۔۔۔۔۔۔ بہت تیز، ہوشیار اور لالچی ہے۔۔۔۔۔۔ دیکھا جائے

تو اس نے میری ماں کو زہر دے کر ہلاک کیا تاکہ میرے باپ سے شادی کرلے۔۔۔۔۔۔" ۔۔۔۔۔۔"آپ میرے لئے اوتار بن کر آئے اور مجھے بدمعاشوں سے بچالیا۔"

"آپ کی کہانی بڑی دردناک ہے؟" آکاش بولا۔ "اچھا ہوا میں مل گیا؟"

"آپ کی پتنی اور بچے کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔؟ وہ نظر نہیں آرہے؟" وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

میری بیوی کو ایک ناگن نے ڈس لیا تھا۔

" آکاش نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ "یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ تم سے گہری مشابہت رکھتی تھی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ تم میری نیلم ہو۔۔۔۔۔۔ وہی چاند سی پیشانی۔۔۔۔۔۔ وہی ستارہ آنکھیں۔۔۔۔۔۔ ہو بہو وہی نقش و نگار۔۔۔۔۔۔ گلابی گداز ہونٹ۔۔۔۔۔۔ وہی سراپا اور تناسب۔۔۔۔۔۔ قد و قامت۔۔۔۔۔۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میری نیلم نے جنم لیا ہو۔۔۔۔۔۔ تم دونوں سگی بہنیں تھیں۔۔۔۔۔۔ یا پھر جڑواں۔۔۔۔۔۔" آکاش جذباتی لہجے میں کہنے لگا۔ "کوئی دیکھے گا تو دھوکا کھا جائے گا۔ تمہیں نیلم ہی سمجھے گا۔۔۔۔۔۔" اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔

"گویا آپ بھی مقدر کے ستائے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔" وہ غم زدہ سے لہجے میں کہنے لگی۔ "گویا ایک موذی جانور نے بے رحمی اور سفاکی سے آپ کی جیون ساتھی کو چھین لیا۔۔۔۔۔۔ آپ کو لافانی محبت سے محروم کردیا۔۔۔۔۔۔ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ غمزدہ ہیں اور ہم دونوں ایک ہی کشتی کے ہم سفر ہیں۔۔۔۔۔۔ دکھ، درد کے ساتھی۔۔۔۔۔۔ ہم دونوں زخمی ہیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے وجود میں جو گھاؤ ہیں وہ ہم دونوں اپنی محبت کے مرہم سے بھر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔" وہ قدرے جھجک کر تذبذب سے بولی۔ "کیا میں نیلم کا خلا اپنی محبت سے بھر دوں۔۔۔۔۔۔"

"آپ۔۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔۔"

"آکاش کے ہونٹوں نے اس کے رسیلے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا۔

پھر ان کے درمیان اتنی محبت اور بے تکلفی پیدا ہوگئی کہ آکاش نیلم کو بھول گیا۔

ساری رات وہ دونوں جاگتے اور محبت بھری باتیں کرتے رہے تھے۔ آکاش کو امرتا کے قرب نے سونے نہیں دیا اور نہ ہی وہ سونا چاہتا تھا۔ اس نے امرتا کو اپنے اور نیلم کے پہلے جنم سے لے کر دوسرے جنم کے بارے میں بتادیا۔۔۔۔۔۔ پدما کے عشق کے بارے میں۔۔۔۔۔۔ جانے کس خیال کے زیر اثر کسی وجہ سے نیلم کی قبر اور لاش کے پراسرار طور پر غائب ہونے کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیوں اور کس لئے وہ خود نہیں جانتا تھا۔

جذبات کا ایک لاوا تھا جس میں صبر اور برداشت اور سارے بندھن بہتے گئے۔ سارے حجاب ایک ایک کرکے سمٹتے گئے۔۔۔۔۔۔

جب وہ صبح بیدار ہوا تو اس نے امرتا کو دیکھا جو مدہوش تھی۔۔۔۔۔۔ لمحے کے لئے اسے نیلم یاد آئی۔۔۔۔۔۔ پھر اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ اس نے نیلم سے کوئی بے وفائی نہیں کی۔۔۔۔۔۔ اس نے نیلم کی قبر پر کھڑے ہوکر جانے کتنی مرتبہ سوگند کھائی تھی کہ وہ پدما کو ختم کرکے اس کے پاس آجائے گا۔۔۔۔۔۔ امرتا کو پانے کے بعد وہ نیلم کو نہیں بھولا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن امرتا کے وجود سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاید ہی امرتا سے نجات حاصل کرے گا۔۔۔۔۔۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بھگوان نے نیلم کو اس لڑکی کے روپ میں بھیج دیا ہو۔۔۔۔۔۔ اس لئے اس لڑکی کی مشابہت نیلم سے ملتی جلتی ہے۔۔۔۔۔۔ اسے ایک ایسی شریک سفر مل گئی تھی جس نے ماضی کی تمام تلخیوں کو فراموش کردیا تھا لیکن انتقام کی آگ جو سینے میں بھڑک رہی تھی وہ اسی وقت بجھ سکتی تھی۔ جب تک پدما سے انتقام نہ لے لے۔

آکاش امرتا کو گہری نیند میں غرق دیکھ کر باہر نکل آیا۔ وہ اسے نیلم کی قبر کے بارے میں اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے وہ بیلچہ لے کر قبر کے پاس پہنچا۔ وہ یہ دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا کہ نیلم کی قبر کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ وہاں کی زمین کو اس طرح سے ہموار کردیا گیا تھا کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہاں قبر کھودی گئی تھی۔ آخر یہ کون ہے۔۔۔۔۔۔؟ کس کی حرکت

ہے؟ کہیں امرتا کوئی ناگن تو نہیں کہ جس نے عورت کے بہروپ میں ہو......؟ لیکن ایسا نہیں تھا......اگر امرتا کوئی ناگن ہوتی تو وہ تینوں بدمعاش اسے اغوا کر کے جھیل پر نہ لاتے اور دست درازیاں نہ کر پاتے اور اس کا لباس تار تار کر کے اسے بے پردہ نہ کر دیتے......امرتا ناگن ہوتی تو انہیں ڈس لیتی......اور پھر امرتا پو پھٹنے تک جاگتی اور اس پر فیاضی سے مہربان ہوتی رہی تھی۔ خودسپردگی سے اس سے پیش آتی رہی تھی۔ امرتا کے سونے کے کافی دیر بعد تک وہ سویا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے حسن کے سحر اور سراپا میں کھویا رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ نیلم ہو بہو لگنے لگی تھی۔ لہٰذا اس نے امرتا کے شک کو دل سے نکال پھینکا تھا۔ پھر وہ بیلچہ لے کر واپس گھر میں آیا تو اس پراسرار معمہ کو حل نہ کر سکا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس کے ساتھ یہ کیا مذاق ہو رہا ہے......اور پھر اس کی نفسیات سے کھیلا جا رہا ہے۔

امرتا نے چند دنوں میں اس کا دل جیت لیا تھا۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش اور جاذبیت سے بھری ہوئی تھی۔ آکاش محسوس کرتا تھا کہ امرتا میں نیلم سے کہیں زیادہ گرم جوشی، والہانہ پن اور وارفتگی ہے۔ وہ نہ صرف بستر کی بہترین رفیقہ تھی بلکہ سگھڑ، سلیقہ مند اور ایک روایتی جیون ساتھی کی طرح اس کی ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ کھانے بھی بڑے لذیذ اور ذائقہ دار بناتی تھی۔ وہ انگلیاں چاٹ لیتا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ نیلم سے کہیں زیادہ دل کی گہرائیوں سے چاہے گی۔ چوں کہ وہ بہت خوب صورت تھا۔ بھرپور مردانہ وجاہت تھی۔ دراز قد تھا اس امرتا کا عشق شدید سے شدید ہونے لگا تھا۔ وہ آکاش کی معیت میں لمحہ بہ لمحہ رہتی۔

لیکن دوسری طرف اس کے باوجود کہ امرتا اتنی فیاضی اور خودسپردگی سے پیش آتی تو وہ سوچتا کہ اب بھی کیوں نیلم کو یاد کرتا رہتا ہے......اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ امرتا کو اس محبت کا جواب نہیں دے پاتا ہے جس کا وہ اظہار کرتی اور طلب کی بھوکی ہوتی ہے۔ اسے دل کے کسی کونے میں ایک عجیب سی شرمندگی ہوتی کہ تنہائی کے علاوہ بسا اوقات امرتا کے مرمریں اور گداز بدن کی لذتوں سے محظوظ ہونے کے باوجود نیلم کی یاد اور محبت اسے بے انتہا یاد آتی تھی۔ یہ امرتا کو فریب دینے والی بات تھی۔ اس نے کئی مرتبہ چاہا اور سوچا کہ وہ جو لاش کی پراسرار گم شدگی اور قبر کے برابر ہونے والے اسرار کو فراموش کر کے پدما کو تلاش جاری رکھے...... جب یہ باتیں اس کے لئے پریشان کن بن جاتیں تو ذہنی دباؤ کم کرنے کی غرض سے امرتا کا قرب حاصل کر کے پرسکون ہو جاتا۔

ایک روز وہ امرتا کو لے کر دریا کے کنارے آیا جہاں چھوٹی چھوٹی سرسبز اور شاداب پہاڑیاں تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اب پدما اس کے عشق میں بے تاب ہو کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاید چلی آئے۔ امرتا کے ساتھ جو وہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے پدما کے دل میں حسد و جلن کی آگ بھڑک اٹھی ہوگی۔ اسے اس وقت چین و سکون نہیں ملے گا تو قتیکہ امرتا کو نیلم سمجھ کر ڈس نہ لے۔ وہ تیار تھا کہ پدما سامنا ہوتا کہ موقع سے فائدہ اٹھائے۔

دریا کے کنارے گھنا جنگل بھی تھا۔ ماحول بڑا رومان پرور تھا۔ امرتا اس کی آغوش میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز تھی کہ ایک مردانہ سپاٹ آواز فضا میں گونجی۔

"اوہ امرتا......! یہ تم ہو...... میں کب سے تمہاری تلاش میں تھا......؟"

یہ آواز سنتے ہی امرتا...... آکاش کی آغوش سے اس طرح تڑپ کر نکلی جیسے اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ پگھلا دیا ہو۔ آکاش نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک سادھو نما شخص کھڑا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال سفید براق تھے۔ وہ ان سے چند قدموں پر تھا اور ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی بھی تھی۔ جس کے سہارے وہ چل رہا تھا۔

امرتا کی نظر جیسے ہی اس شخص پر پڑی اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ پھر وہ آکاش کا ہاتھ تھام کر سراسیمگی سے بولی۔

"آکاش......! جلدی سے بھاگ چلو...... یہ بدروح ہے جو انسان کے روپ میں آئی ہے۔"

"لیکن یہ بات تم کیسے جانتی ہو اور کس بنا پر کہہ رہی ہو؟" آکاش کہنے لگا۔ "یہ بدروح ہے اور مری انسانی بہروپ میں ہے۔ ایک بدروح کو لاٹھی کے سہارے چلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"دراصل میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ وہ شخص ہے جس سے میرے گھر والے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔" امرتا نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔ "یہ مجھے تلاش کرتا ہوا آ گیا ہے تاکہ مجھے لے جائے...... میرے ظالم، بے رحم، خودغرض اور لالچی باپ نے اس کی رقم اور زیورات ہڑپ کر لئے ہیں وہ معہ سود وصول کر لے...... پھر جی بھرنے کے بعد میرا کسی اور مال دار بوڑھے سے سودا کر دے۔ یہ کسی گدھ سے کم نہیں ہے۔"

"اس پہاڑی کے نشیب میں جو غار کا دہانہ اس میں دو آدمیوں کی گنجائش ہے۔ اس میں جا کر چھپ جاؤ۔"

"یہ کمینہ بڑا پہنچا ہوا ہے...... ایک درندے کی مانند عورت کی بو دور سے ہی سونگھ لیتا ہے۔" امرتا کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ "اسے جتنا میں جانتی ہوں کوئی اور نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہے۔"

اس کا مال تم نے نہیں تمہارے چاچی نے ہڑپ کیا ہے......؟ تم کیوں پریشان اور خوف زدہ ہو رہی ہو؟" آکاش نے اسے دلاسا دیا۔ "میں اسے سمجھا دوں گا کہ......"

آکاش نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ امرتا نے فوراً ہی آکاش کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ بوکھلائی ہوئی سی بولی۔ "اس نے شاید ٹھیک سے نہیں دیکھا اور پہچان بھی نہیں پایا...... چلو...... جلدی کرو۔"

وہ دو قدم چلے ہی تھے کہ اس باریش بوڑھے نے فضا میں لاٹھی لہرا کر امرتا کو بلند آواز سے مخاطب کیا۔ امرتا بار بار مڑ کے اسے دیکھتی ہی جا رہی تھی۔ ڈھلوان کی وجہ سے انہیں تیزی سے اترنا دشوار ہو رہا تھا کہ پھسل نہ جائیں۔

"تو کہاں بھاگی جا رہی ہے......؟ آخر مجھ سے بچ نہیں سکتی...... میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔"

یہ سنسناتی ہوئی آواز تھی جس نے امرتا کو ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کیا تھا۔ امرتا کا حسین چہرہ بے لہو ہو گیا۔ آکاش کو یقین آ گیا کہ یہی وہ بوڑھا شخص ہے جس نے امرتا کے عوض امرتا کے باپ سے سودا کیا تھا۔ اب تو اس کی بھی شامت آ گئی۔ یہ سمجھے گا کہ امرتا چوں کہ اس سے محبت کرتی تھی اس لئے وہ شادی کرنے کے بجائے اس کے ساتھ فرار ہو کر یہاں آ گئی۔ اب وہ اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ اس لئے بھی کہ وہ نہ صرف بہت خوب صورت ہے بلکہ بے حد جوان بھی ہے۔

آکاش نے اس شخص کی غلط فہمی اور الزامات دور کرنے کے لئے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سچ سچ سارا واقعہ اس شخص کے علم میں لا کر اپنی پوزیشن صاف کر لے گا۔ کوئی بات نہیں چھپائے گا۔ جھوٹا آدمی بزدل ہوتا ہے۔ سچا آدمی بہادر...... وہ اس کی سچائی کو مان لے گا۔ یوں بھی اس میں اس کا کوئی دوش نہ تھا۔ وہ نردوش تھا۔ امرتا اس کے ساتھ ایک پتنی کی طرح رہ رہی تھی۔ اس میں اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔ بلکہ حالات کا بھی دخل تھا۔ اگر اس شخص نے موقع کی نزاکت کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور قانونی اور پولیس کی دھمکی دی تو وہ اسے پھنسا دے گا۔ اس لئے کہ امرتا بالغ لڑکی ہے......اس کی مرضی کے بغیر کوئی اسے جبر و زیادتی سے اپنا نہیں سکتا...... اور پھر سودے بازی سے بیاہ کرنا بھی غیر قانونی اور سنگین جرم ہے۔ وہ ہر طرح سے اس شخص سے نمٹنے اور سامنا کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

وہ بوڑھا شخص آہستہ آہستہ ان کی طرف آ رہا تھا۔ آکاش نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں جو لاٹھی ہے اس کے سہارے نہیں چل رہا ہے بلکہ وہ اسے اپنی حفاظت کے لئے رکھا ہوا ہے۔ جیسے اس بوڑھے اور ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آکاش نے دیکھا

کہ امرتا کا چہرہ مردے کی طرح ہورہا تھا اور آنکھوں میں موت کے سائے افق تا افق نظر آرہے تھے۔ موسم نہایت خوش گوار اور خنک تھا لیکن امرتا کی پیشانی عرق آلود ہورہی تھی۔

آکاش نے دل میں سوچا کہ وہ اتنی بزدل تھی تو اسے گھر سے فرار ہونے کی ضرورت کیا تھی۔ وہ اس بوڑھے سے شادی نہیں کرتی۔ حالات کے سامنے ڈٹ جاتی۔ چٹان بن جاتی۔

پھر وہ شخص آکر سامنے رکا تو پہاڑی پر چڑھنے کے باعث اس کی سانس سینے میں پھول رہی تھی۔ اسے قابو میں پانے کے لئے کوشش کرنے لگا۔ وہ قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ امرتا کی حالت ایک مجرم کی سی ہورہی تھی۔ وہ اس بوڑھے شخص سے نظریں چرا رہی تھی۔ جیسے اس نے اس بوڑھے کی رقم اور زیورات ہڑپ کرلئے ہوں۔

آکاش کو ایسا لگا جیسے وہ بوڑھا امرتا کو کسی بھی لمحے دبوچ کرلے جانا چاہتا ہو...... آکاش نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں......؟ مجھے آپ کے تیور اور ارادے اچھے نہیں لگ رہے ہیں؟"

"تم ہم دونوں کے معاملات میں دخل مت دو......" بوڑھے نے ترش لہجے میں جواب دیا۔

"پھر اس بوڑھے نے امرتا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ سرعت سے ان دونوں کے درمیان آگیا۔ بوڑھے نے آکاش کو ایک طرف ہٹایا تو وہ حیران رہ گیا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ بوڑھا اس قدر طاقت ور ہے۔

پھر اس بوڑھے شخص نے آکاش کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

"نوجوان......! تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو...... میں اس ڈائن کو عبرت ناک سزا دینا چاہتا ہوں۔ تم مجھے نہ روکو۔"

آکاش نے بوڑھے کے تیور سے اندازہ کرلیا کہ وہ امرتا کو موت کی نیند سلانا چاہتا ہے۔ گلا دبانا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی تھی، آکاش نے زندگی میں پہلی بار یہ فیصلہ کیا کہ امرتا کی زندگی بچانے کے لئے اس بوڑھے کو قتل کرنے کی نوبت آئے گی تو وہ قتل کردے گا۔ جب کہ آج تک اس نے کوئی پرندہ تک ذبح نہیں کیا تھا۔

ادھر امرتا کا بدن لرزے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھیں آکاش سے جیسے التجا کررہی تھیں کہ وہ اسے اس ظالم شخص سے بچالے جو اسے اغوا کرکے لے جانے آیا ہے...... وہ بوڑھا خوں آشام بھیڑیا لگ رہا تھا۔ آکاش نے سوچا کہ...... اس بوڑھے کو دھکا دینے کی ضرورت ہے...... وہ پہاڑی سے پھسلتا ہوا جا گرے گا تو مرجائے گا۔ اس کا سر نوکیلے پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے گا۔

وہ اس بوڑھے کو دھکا دینے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ امرتا ابھی تک خود پر پوری طرح قابو نہ پاسکی تھی۔ سینے میں اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔

آکاش کو یقین آگیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی رقم اور زیورات امرتا کے باپ نے ہڑپ کرلئے۔ لیکن وہ اس کے باپ سے رقم اور زیورات وصول کرنے کے بجائے امرتا کی تلاش میں کس لئے آیا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ امرتا کو کسی قیمت پر بوڑھے کو لے جانے نہیں دے گا...... چاہے اسے قتل کرنے کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے...... اور پھر اس بوڑھے کو قتل کرکے اس کی لاش کو کسی گڑھے میں ڈال کر منوں مٹی میں دبا دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ ایک قاتل کے انداز میں سوچ رہا ہے...... وہ کیا کرتا......؟ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امرتا جو نیلم کا روپ ہے...... اس کے قرب سے محروم ہوجائے...... وہ بوڑھا امرتا کو زبردستی لے گیا تو اس کی زندگی بے کیف اور ویران ہوکر رہ جائے گی۔ جب اس کی نگاہیں امرتا سے ملیں تو امرتا نے غیر محسوس انداز سے اسے اشارہ کیا وہ

بوڑھے کو موت کی بھینٹ چڑھادے...... پھر اس بوڑھے نے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے آکاش کو اپنائیت کے سے انداز میں کہا۔

"نیک اور معصوم نوجوان...... یہ ڈائن اپنے اصلی روپ میں آرہی ہے...... تم ہوشیار ہوجاؤ۔"

آکاش نے اس بوڑھے کی بات سن کر اسے ایک لمحے کی مہلت دے کر ادھر ادھر دیکھنا نہیں چاہتا تھا کہ بوڑھا فائدہ اٹھائے۔ پھر وہ بوڑھا گرجا۔ میں آج اس کمینی کو جان بچا کر فرار ہونے نہیں دوں گا...... دیکھتا ہوں کیسے اپنی جان بچاتی ہے۔"

"امرتا اس کی محبت تھی...... اس کی ذات کا جزو تھی...... اس کی نیلم کا عکس...... اس بوڑھے نے امرتا کو جو گالی دی تھی وہ صرف امرتا کو نہیں بلکہ اسے اور نیلم کو بھی...... یہ گالی اس کے وجود پر کوڑا بن کر لگی تھی۔ آکاش بڑے ٹھنڈے اور تحمل مزاج کا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی سے جھگڑا کیا اور نہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ اس پر پل پڑا۔ اس نے بوڑھے کے منہ پر گھونسا مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا کہ بوڑھے نے اس کی کلائی پکڑلی اور اسے کمر کے پیچھے لے گیا۔ بوڑھے کا ہاتھ جیسے آہنی تھا۔ اس نے جو مروڑا تو آکاش کے منہ سے درد ناک چیخ نکل گئی۔

بوڑھے نے آکاش کو ایک طرف پوری قوت سے دھکیلا، پھر اس نے امرتا کو دبوچنے میں لحظہ بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔ امرتا میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ایک طرف دوڑ لگادیتی اور اس بوڑھے کے قابو میں نہیں آتی۔ وہ ساکت جامد سی اپنی جگہ کھڑی خوف سے لرزاں کانپ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس بوڑھے نے اس پر کوئی جادو کرکے ہوش و حواس گم کردیئے ہوں۔ آکاش کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ امرتا بت کیوں بنی کھڑی ہے۔ پھر غصہ بھی آیا کہ وہ دوڑی کیوں نہیں...... کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی تھی کہ بوڑھا اسے قتل کرنے سے قبل امرتا کی بے حرمتی کرنا اور دولت ہڑپ کرنے کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اسے قتل یا مفلوج کرکے امرتا کو اپنے ٹھکانے پر لے جائے گا۔ پھر اسے زندان میں ڈال کر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا رہے گا۔

زمین پر گرنے سے آکاش کے جسم پر سخت چوٹیں آئی تھیں اور ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اٹھ کھڑا ہوا تاکہ امرتا کو بوڑھے کی گرفت سے آزاد کرائے۔ وہ سرعت سے بوڑھے کی طرف بڑھا جس کی گرفت میں امرتا کسمسا رہی تھی۔ مچل رہی تھی۔ اس کی حالت بے آب ماہی کی سی طرح ہورہی تھی...... آکاش کا خیال تھا کہ امرتا کو قابو میں بے بس پاکر من مانیاں اور دست اندازی کرے گا۔ امرتا کا نازک اور برما دینے والا جسم بوڑھے کے جذبات کو بھڑکا نہ سکا تھا۔ اس نے کوئی نازیبا اور ناشائستہ حرکت نہیں کی۔

آکاش جب ان کے قریب پہنچا تو اس کی نفرت اور غصہ جو اسے آپے سے باہر کررہا تھا۔ وہ اک دم سے کافور ہوگیا۔ اس کی جگہ حیرت نے لے لی۔ وہ تحیر زدہ سا ہوکر امرتا کو دیکھنے لگا۔

امرتا کی بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں جو برقی قمقموں کی سی چمک رہی تھی وہ دم توڑنے لگی۔ اس کے رخساروں کی شادابی، شگفتگی اور تروتازگی تھی وہ بے رونق سی ہوکر ماند پڑتی گئی۔ اس کا کسا کسا بدن کا جو جادو تھا وہ بے لہو سا لگ رہا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز بات جو تھی وہ یہ کہ نیلم کی شبہات چہرے پر نہ تھی۔

لمحے کے لئے آکاش کی آنکھوں میں ایک دھند سی چھا گئی۔ جب دھند چھٹی تو اس نے دیکھا کہ اب امرتا کا اسے جو دل کش سراپا نظر آتا رہا تھا وہ اس کا واہمہ سا لگ رہا تھا۔ اسے وہ سب ایک فریب سا محسوس ہورہا تھا۔

آکاش بے حس و حرکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے اس کی ریشمی سیاہ زلفوں کو پکڑ کر ایک جھٹکا دے کر امرتا کو اپنی نظروں کے سامنے کیا تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے۔ امرتا اس بوڑھے سے نظریں چار کرنے کی ہمت نہیں پارہی تھی۔ جیسے کوئی جرم احساس اسے باز رکھ

رہا ہو۔

"تو مجھے چکمے، جھانسے اور فریب دے کر بچتی رہی لیکن آج اب تیرا بچنا ناممکن ہے۔" بوڑھے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تو نے ایک بدچلن بن کر اپنی جنس کی پیاس بجھانے کے لئے خوبرو جوانوں کا شکار کیا...... ان کا خون کیا...... ان کی جوانی اور زندگیاں برباد کردیں...... اس لئے تیری موت اور خاتمہ ضروری ہے...... ورنہ تو نئی نسل کو برباد کردے گی۔"

"خون......!" آکاش اک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔

بوڑھے کی باتیں سن کر امرتا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر اس کے حلق سے ایسی خوف ناک، ناقابل فہم اور رونگٹے کھڑی کردینے والی آوازیں نکل رہی تھیں جس نے آکاش کے جسم میں خون کو منجمد کردیا۔ پھر اسے امرتا لڑکی نہیں بلکہ ایک ڈائن سی دکھائی دی...... وہ یکسر بدلتی جارہی تھی۔

"اے معصوم بالک......!" بوڑھے نے میٹھے سے لہجے میں آکاش کو مخاطب کیا۔ "یہ ڈائن کون سی زبان بول رہی ہے تم سمجھ رہے ہو......؟ یہ انسانوں کی نہیں...... وحشت اور حیوانوں کی ہے جسے انسان نہیں سمجھ سکتا...... یہ تمہیں اپنے حسن کے طلسم کا اسیر بنا چکی ہے۔ تم اس کے ظاہری حسن پر مرمٹے ہو...... اس نے نیلم کا بہروپ بھر کے تمہیں اپنے جال میں پھانس کر تمہیں کھلونا بنا کر کھیلنے لگی...... یہ اب تک سات کڑیل جوانوں کو ہوس کا نشانہ بنا چکی ہے...... اس موذی نے ان کا خون چوس چوس کو موت کی آغوش میں پہنچادیا...... اب تمہاری باری تھی۔"

اس بوڑھے کی باتیں سن کر آکاش پر کوئی بجلی سی آگری۔ اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا...... یہ نہ جانے کون مخلص شخص تھا جو اچانک اور غیر متوقع اوتار بن کر آیا تھا...... اس بوڑھے کی باتوں اور انداز سے ایسا لگ رہا تھا وہ امرتا کا رشتہ دار نہیں ہے...... لیکن آکاش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ امرتا اور اس کے چال چلن اور بدکرداری کے متعلق اتنا کچھ جانتا ہے...... اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال جنم لے کر زہریلے سانپوں کی طرح پھنکارنے لگے۔ اب غصے کی جگہ حیرت نے لے لی تھی...... اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ یہ معمہ وہ حل کرنے سے قاصر تھا۔

"آپ اس کو کیسے اور کب سے جانتے ہیں......؟" آکاش پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"شاید تم اس بات سے واقف ہوگے کہ جب نیکی نے جنم لیا تو بدی نے بھی جنم لیا تھا۔" بوڑھا کہنے لگا۔ "یہ ازل سے ہوتا آرہا ہے...... دنیا ان کے وجود سے خالی نہیں ہے...... یہ بھی اس وقت ختم ہوجائیں گے جب دنیا ختم ہوگی...... تمہاری کوئی نیکی کام آگئی جس نے تمہیں بچالیا۔ اگر یہ میرے قابو میں نہ آتی تو میں تمہیں بچا نہیں پاتا...... یہ لڑکی جو میری گرفت میں بے بس سی کھڑی ہے، جس کا زہر میں نے بے اثر کردیا ہے وہ لمحے بھر کی مہلت کے لئے بے چین ہے...... تڑپ رہی ہے...... تاکہ پاتال کی گہرائیوں میں غرق ہوجائے...... زمین اسے اپنی امانت سمجھ کر سمانے کے لئے تیار ہے۔"

"آپ نے جیسا کہ کہا...... یہ بدچلن ہے...... یہ سچ ہے؟" آکاش نے پوچھا۔

"میں نے ایک بات بھی غلط نہیں کہی ہے......؟ تم خود اس کلنکار سے دریافت کرلو۔"

امرتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب کہ بوڑھے اس کے ریشمی بالوں کو بڑے زور سے جھٹکا دیا تھا...... آکاش کو ایسا لگا یہ کوئی ڈائن اور کوئی پراسراری سی مخلوق ہے...... بوڑھے نے اس کے بالوں کو جو جھٹکا دیا تھا اس جیسی نازک اندام لڑکی اس دنیا کی ہوتی تو وہ برداشت نہ کرپاتی...... اس کی چیخیں نکل جاتیں، بے ہوش ہوجاتی۔ لیکن اس پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

آکاش کی نگاہیں بدستور امرتا کے چہرے اور سراپے پر جمی ہوئی تھیں اور بوڑھے کی باتیں بھی سن رہا تھا جو کہے جارہا تھا۔ "یہ کمینی...... بدذات...... بدچلن سینکڑوں میں کسی ایسے جوان کا انتخاب کرتی تھی جو نہ صرف خوب صورت، مردانہ وجاہت، بھرپور، دراز قد اور کسرتی بدن کا ہو۔ جس کی زندگی میں کوئی لڑکی عورت نہ آئی ہو...... وہ ایسے جوانوں کو بستر کا ساتھی بناتی تھی...... ایسے نوجوانوں کا انتخاب اس لئے بھی کرتی تھی کہ ان کا خون صاف وشفاف اور صحت مند ہوتا تھا...... اس کی کمزوری یہ جوان تھے۔ یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آرہی تھی۔ میں اس کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرتا، بھٹکتا اور خوار ہوتا رہا۔ آج میری کوشش کام آگئی...... تمہارے کارن یہ ہاتھ لگ گئی۔ میں اسے عبرت ناک سزا دیئے بغیر نہیں رہوں گا۔"

اس دوران امرتا نے آکاش کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی تھی۔ بوڑھا جیسے جیسے اس کا ظاہر اور باطن کھولتا جارہا تھا وہ شرم سے گڑتی جارہی تھی۔

لیکن اس بوڑھے نے امرتا کو اپنی دسترس میں رکھ کر کوئی منتر پڑھ کر اس پر جیسے جیسے پھونکتا جارہا تھا۔ ویسے ویسے امرتا کی حالت دگرگوں ہونے لگی...... اس کے سرخ وشیریں لبوں سے زخمی سانپوں کی سی ہول ناک اور دہشت ناک انداز پھنکاریاں ابھرنے لگیں۔ وہ بوڑھے کی آغوش میں اپنے وجود کو ان منتروں سے محفوظ اور بچانا چاہ رہی تھی۔ جن کے شعلے اس کے جسم کو جھلسائے دے رہے تھے۔

آکاش سے یہ منظر دیکھا نہیں جارہا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے امرتا کی درگت بنتا دیکھ کر حوصلہ ہار رہا تھا...... امرتا نے نیلم کا روپ دھار کر جو عشق کیا...... ہر طرح خوش کیا اسے کیسے فراموش کرسکتا تھا...... اب امرتا کی اصلیت ظاہر ہونے پر اسے دکھ ہو رہا تھا...... کاش! یہ نیلم کے روپ میں نہ آتی...... وہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ امرتا کا عشق سچا تھا...... اس میں کوئی تصنع اور کھوٹ نہیں تھا...... نشاط انگیز لمحات میں امرتا نے اس کی کسی بات اور حرکت سے انکار نہیں کیا تھا۔ اس کی محبت میں اندھی ہوگئی تھی...... کیا وہ اس سے کھیل رہی تھی...... اس کا سارا خون پی کر اسے نچوڑ لینا چاہتی تھی...... لیکن ایسی کوئی بات اور شک محسوس نہیں کیا تھا...... اس نے جانے کتنی مرتبہ امرتا کے ہونٹ اپنی گردن میں پیوست ہوتے محسوس کیا لیکن اس نے کاٹا اور ڈسا نہیں تھا...... جیسا کہ اس نے پدما کے بارے میں سنا ہوا تھا کہ وہ اپنی زبان سے گردن کو بے بس بنا کر دانت گاڑ کر خون پی جاتی ہے اور اپنا زہر چھوڑ دیتی ہے...... وہ پدما نہیں تھی جو اتنے دنوں تک اس کی پتنی بنی رہی تھی۔

آکاش درخت کے تنے کے سہارے کھڑا ہوگیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس لئے کہ وہ بوڑھے کے تشدد کا نشانہ جو بن رہی تھی وہ اذیت ناک تھا۔ بوڑھا جو اسے جسمانی ایذا دے رہا تھا امرتا اسے سہہ نہیں پارہی تھی...... ناقابل برداشت ہونے کے باعث امرتا کا خوف و دہشت سے سسکاریاں بھرتا ہوا تاثر اتنا شدید تھا کہ آکاش سے دیکھا نہیں جارہا تھا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔

جب آکاش کو ہوش آیا تو اسے کچھ اندازہ نہ ہوسکا تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا۔ اس نے دیکھا کہ چاروں طرف ملگجا اندھیرا اور گہرا سکوت سا طاری ہے۔ امرتا کا نام ونشان کہیں بھی نہیں تھا۔ صرف بوڑھا مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو لڑکے......!" بوڑھا کہنے لگا۔ "تم امرتا کو تلاش کررہے ہو...... میں نے اپنی پراسرار قوتوں کے سہارے امرتا کو زندہ زمین میں غرق کردیا...... وہ زمین کی امانت تھی...... میں حیران ہوں کہ تم اتنے دنوں تک اس کے ہاتھوں موت کی آغوش میں جانے سے محفوظ رہے...... جب کہ وہ روز اپنی آغوش بدلنے کی عادی تھی۔ کیا تم اندازہ کرسکتے ہو اور سوچ سکتے ہو کہ ایسی بدچلن نے تم سے اتنے دنوں ایک اچھی عورت اور پتنی کی طرح زندگی گزاری۔ تم سے اس کا جی بھرا نہیں...... کسی

اور مرد کی طرف دیکھا تک نہیں...... آخر کیوں اور کس لئے......؟"

"شاید اسے مطلب اور پسند کا کوئی جوان لڑکا ملا نہیں ہوگا۔" آکاش نے جواب دیا۔

"نہیں...... یہ بات نہیں......" بوڑھا معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

"پھر کیا بات تھی......؟" آکاش نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

"عشق......" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اسے تم سے عشق ہوگیا تھا۔ عورت عشق کرنا اور نبھانا جانتی ہے...... عورت ہی کو عشق کرنا آتا ہے...... عشق ایسا انمول اور نایاب اور عظیم جذبہ ہے جو عورت کے من کی گہرائیوں میں نقش ہوتا ہے...... وہ عشق میں مرد سے ہار جاتی ہے...... اس کی باندی بن جاتی ہے...... میں نہ آتا تو وہ تمہاری نیلم ہی بنی رہتی...... شاید برسوں تک تمہاری سیوا کرتی رہتی...... پدما کو اپنے مقصد میں کسی بھی قیمت پر کامیاب ہونے نہیں دیتی...... پتنی بن کر زندگی گزارتی...... مجھے نفرت اور غصہ اس پر اس لئے آیا تھا کہ اس نے کئی لڑکوں کو تباہ و برباد کیا تھا...... اس نے بہت چاہا اور مجھ سے مقابلہ کیا اور یقین دلایا کہ وہ تم سے ہرجائی پن نہیں کرے گی۔ پتنی بن کر حسین اور رنگین زندگی بسر کرتی رہے گی...... جانے کیوں مجھے اس کی اس بات اور وچن پر یقین نہیں ہوا...... اس لئے میں نے اسے زمین کی آغوش میں سمو دیا۔"

آکاش بڑی حیرت سے اس بوڑھے کی باتیں سنتا رہا۔ ایک عجیب سی بات یہ بھی تھی کہ وہ راتوں کو بالکل ہی نیلم کی طرح محسوس ہوتی...... لب و لہجہ...... شیریں آواز...... خال وقد...... جسامت اور بدن...... اور محبت بھری باتیں اور والہانہ پن اور وارفتگی...... کاش...... یہ بوڑھا نہ آتا...... زندگی یوں ہی گزر جاتی۔

"تم جو سوچ رہے ہو وہ تمہارے چہرے پر عیاں ہو رہا ہے۔" بوڑھا بولا۔ "دل کی بات چہرے سے چھپائی نہیں جاسکتی...... میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا اور کہنا چاہتا ہوں۔ میرا آنا تمہارے حق میں بہت مفید ہوا ہے......"

"رات ہوگئی ہے اور موسم بھی بے حد خنک ہوتا جارہا ہے۔" آکاش بولا۔ "آپ میرے گھر چلیں اور جب تک دل کرے میرے مہمان رہیں۔ مجھے سیوا کرنے دیں...... امرتا ہوتی تو آپ کی مہمان نوازی بہت اچھی ہوتی...... میں بھی کروں گا۔"

آکاش اسے اپنے گھر لے کر پہنچا۔ آکاش نے چار انڈے ابالے اور کافی بنائی۔ باورچی خانے میں مچھلی کا سالن اور بھات تھا جو امرتا نے دوپہر کے وقت بنایا تھا۔ وہ اتنی مقدار میں تھا کہ دو آدمی پیٹ بھر کر کھاتا تو بھی بچ جاتا...... اس نے انڈے اور کافی موسم کے لحاظ سے تیار کی تھی۔ کھانا ٹھہر کے کھانے کے لئے رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے آتش دان میں کوئلے ڈال دیئے۔ اس میں کچھ کوئلے کے انگارے موجود تھے۔

کافی پینے کے دوران آکاش نے بوڑھے سے دریافت کیا۔

"آپ کا نام کیا ہے......؟ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں؟"

"میرا نام نیکی سادھو ہے...... میں نیکی ہوں...... میری زندگی اور میرا مشن بدی سے لڑنا ہے...... میں بدی کی تلاش میں رہتا ہوں تاکہ اس کا کریا کرم کروں...... اس دنیا میں نیکی اور انسانیت برائے نام ہے۔ بدی کہاں نہیں ہے...... ہر جگہ ہے۔ بدی نیکی سے بہت طاقتور تو ہے لیکن پھر بھی وہ نیکی سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتی ہے...... تم نے دیکھا...... امرتا بھی بدی تھی۔ لیکن میں نے کس طرح سے اس پر قابو پاکر اسے سنسار سے دفع کردیا۔"

کافی پینے کے دوران ان کے درمیان ایک بوجھل سا سکوت طاری ہوگیا۔ آکاش بڑا جذباتی ہوکر اپنے ماضی کے بارے میں سوچنے لگا تھا...... اس کا پہلا جنم بھی دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ نیلم جو خوش تھی۔ محبت تھی اسے اور نیلم کو پدما نے ڈسنا چاہا تھا لیکن ان دونوں نے

زہر پی لیا...... پھر ایک صدی بعد اتفاق سے ان دونوں نے ایک ہی ودیس بنگال میں دوسرا جنم لیا...... ان کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ پھر ان دونوں نے شادی کرلی...... پدما جو پہلی صدی میں جنم میں اس سے عشق کرنے لگی تھی اس کا عشق ان کے دوسرے جنم میں رقابت بن گیا۔ پھر اس نے نیلم کو ڈس لیا...... وہ اسے ہم جنس بن کر اپنی دنیا میں لے جانا چاہتی تھی...... پدما حسین روپ کی لڑکیوں میں آئی تھی۔ لیکن اس نے پدما کے حسن اور عشق سے نفرت کی تھی...... وہ نیلم کی موت کا انتقام لینے پر تلا ہوا تھا کہ امرتا ایک حادثاتی واقعے سے اس کی زندگی میں آگئی تھی۔ پھر اس بوڑھے نے امرتا سے اسے نجات دلا دی تھی...... اس پر بوڑھے نے بھید کھولا تھا کہ امرتا بھی پدما کی جنس ہے۔

وہ بڑا دکھی ہو رہا تھا...... پھر اس نے بوڑھے کو اپنی رام کہانی سنانا چاہی تو وہ بولا۔

"اچھے لڑکے...... میں تمہارے پہلے جنم اور دوسرے جنم کے بارے میں تم سے زیادہ ہی جانتا ہوں...... اس لئے مجھے تم سے بے پناہ ہمدردی اور محبت ہے۔ تم اپنی زندگی سے اتنے مایوس، دکھی اور جذباتی نہ ہو۔ تمہاری محبت...... اور نیلم سے عشق امر ہے۔ کبھی عشق...... اور محبت نہیں مرتی...... پدما نے ایک صدی قبل تم سے عشق کیا...... رقابت اور حسد و جلن ہونے کے باوجود تم سے عشق کرتی رہی...... ایک صدی بیت جانے کے باوجود...... جب عورت عشق کرتی ہے تو وہ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھتی ہے...... وہ وصال کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اس لئے اس نے نیلم کو ڈس لیا۔"

"آپ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر جانتے ہیں......؟" آکاش مبہوت سا ہوکر بولا۔

"میں بہت ساری پراسرار قوتوں کا مالک ہوں۔" بوڑھے نے کہا۔ "تمہارے عشق میں نہ صرف پدما اور امرتا اور بھی ناگنیں پاگل ہیں۔ وہ عشق کی آگ میں جل رہی ہیں...... چوں کہ وہ پراسرار قوتوں کی مالک نہیں ہیں جس سے وہ دنیا میں آکر تمہارا من اور شریر جیت سکیں...... تمہاری خوب صورتی اور وجاہت کے چرچے کہاں نہیں ہیں۔"

"میرے عشق میں اور بھی ناگنیں دیوانی ہیں......؟" آکاش کی حیرت دوچند ہوگئی۔ "بن دیکھے......؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ایک تو تمہاری خوب صورتی کے چرچے سن کر...... دوسرا کہ جب وہ یہاں سے گزریں تو انہوں نے تمہیں اور تمہاری جھلک دیکھی تھی...... یہ عشق بری بلا ہے۔ تمام جان دار عشق کرنا چاہتے ہیں اور مریض بھی ہیں۔"

"ایک بات بتاؤں بیٹے......؟" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "کیا تم میری بات کا یقین کرو گے؟"

"کیوں نہیں......؟" آکاش نے سر ہلایا۔ "مجھے آپ پر بسواس ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بولیں گے۔"

"تو پھر سنو......" بوڑھے نے کہا۔ "نیلم مری نہیں...... وہ زندہ ہے......؟"

"کیا......؟" آکاش اچھل پڑا۔ "وہ کیسے زندہ ہے......؟ اسے تو پدما نے ڈسا تھا...... میں نے اس کی قبر کھودی تھی...... میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اتار کر منوں مٹی میں دبایا تھا...... پھر اس کی قبر بنائی تھی۔"

"پدما بھی دھوکا کھا گئی تھی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "وہ نیلم نہیں تھی۔ وہ نیلم کے بہروپ میں کوئی اور تھی اور اس نے نیلم بن کر پدما سے بات کی تھی...... پدما کے تمہارے گھر میں گھسنے سے قبل وہ پراسرار طور پر غائب ہوگئی تھی یا غائب کردیا گیا تھا۔ وہ نیلم کی جڑواں بہن کی مانند تھی......"

"اوہ بھگوان......!" آکاش نے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔ پھر وہ حیرت اور خوشی سے بولا۔ "میری نیلم زندہ ہے......؟ اگر وہ زندہ ہے تو بتائیں کہ کہاں ہے...... اگر وہ آکاش پر ہے......؟ موت کے منہ میں بھی ہو تو اسے نکال کرلے آؤں گا...... میں اس کے لئے اپنی جان اور

زندگی بھی بھینٹ کردوں گا۔"

"وہ ایک ایسی پراسرار، خوفناک اور خطرناک دنیا میں موجود ہے اور تمہارے انتظار میں تڑپ رہی ہے......" بوڑھا اسے بتانے لگا۔ "وہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں قدم قدم پر موت کی عفریت منہ کھولے کھڑی ہے۔"

"کوئی بات نہیں...... مجھے اس دنیا کے متعلق بتادیں...... میں موت سے نہیں ڈرتا ہوں۔" وہ جذباتی ہوگیا۔ "وہ دنیا کہاں ہے...... میں ابھی اور اسی وقت جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو......؟ بوڑھا سادھو اسے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "تمہاری عجلت بازی سے سارا معاملہ الٹ ہوجائے گا...... تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے جس سے تمہارا نکلنا ناممکن ہوجائے گا...... لینے کے دینے پڑجائیں گے...... اور تمہاری نیلم تمہارے انتظار میں اپنی جان دے دے گی......"

"پھر مجھے کیا کرنا ہوگا......؟" آکاش نے اپنی بے چینی اور بے تابی کو دباتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"عقل سے کام لینا ہوگا...... عقل ایسی تدبیر ہے اور ایسا ہتھیار ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑا جادو، خطرناک اور مہلک ہتھیار بھی ناکارہ ہوجاتا ہے...... اپنے ہوش اور عجل پسندی کو قابو میں رکھو گے تو ناممکن بھی ممکن ہوجائے گا۔"

بوڑھے سادھو کے سنسنی خیز انکشاف نے اس میں ایک نئی شکتی پھونک دی تھی...... ایسی شکتی تھی کہ اس نے اپنے وجود میں ایک نئی زندگی محسوس کی تھی۔ اس کی نس نس میں خون رقص کرنے لگا...... "میری نیلم زندہ ہے......؟ زندہ ہے......" وہ حیرت، خوشی اور سرشاری سے جیسے دیوانہ ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ رقص کرنے لگے...... اب اس میں اتنا حوصلہ آگیا تھا کہ وہ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرسکتا تھا...... ایک نہیں دس پدما کو بھسم کرسکتا تھا۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ، دیوار اور پتھر نہیں آسکتا تھا۔

"میں تمہیں بتاؤں کہ اس دھرتی پر ایسا کوئی جہان، خطہ اور چپہ نہیں ہے جن کے رازوں اور اسرار سے میں واقف اور آگاہ نہیں ہوں...... میں دیکھنے میں ستر برس کا لگتا ہوں...... لیکن درحقیقت میری عمر تین سو برس سے زیادہ ہے...... اس لئے کہ میں نے ایسی جڑی بوٹیاں کھائی ہیں کہ جنہوں نے میری عمر طویل کردی...... مجھ میں اٹھارہ برس کے نوجوان سے کہیں زیادہ طاقت ہے...... یہ لاٹھی...... دراصل جادو کی لاٹھی ہے...... میں یہ بتارہا ہوں کہ بھگوان نے مجھے ایسے رازوں سے کامیابی سے سرفراز کیا جو انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہیں...... تم اس حسین لڑکی کو امرتا سمجھتے رہے نیلم کی ہم شکل تھی...... اس نے تمہیں اعتماد میں لینے کے لئے جھیل پر ناٹک رچایا تھا...... وہ بدمعاش جن سے تم نے امرتا کی آبرو بچائی تھی وہ اس کے مہرے تھے۔ دراصل وہ تمہیں اپنے حسن وشباب کے طلسم اور جسمانی دل فریبیاں اور نیلم کے ہم مشابہہ سے پھانس لیا تھا...... تم نے جن بدمعاشوں کو تیزاب سے جھلسایا وہ محفوظ رہے تھے۔ اصل بدمعاش نہ تھے۔ امرتا نے ان بدمعاشوں کو دہشت زدہ کرکے گاؤں فرار کرادیا تھا۔ وہ تم پر ہزار جان عشق کرنے لگی۔" بوڑھے نے سانس لینے کو توقف کیا تو آکاش نے کہا۔

"عشق میں تو پدما بھی مبتلا ہے اور ایک دو برس سے نہیں...... ایک صدی سے...... اور پھر اس نے امرتا کو بھی میرے عشق کے جنون میں مبتلا دیکھ کر اسے راستے سے ہٹایا کیوں نہیں؟"

"اس لئے کہ دیوتاؤں نے جن ناگنوں کو ہر طرح کا اختیار دے رکھا ہے وہ جس سے چاہیں عشق کریں اور اپنے سب کا دل جیت لے...... اپنی ملکیت بنالے...... اپنی صلاحیت سے...... ہر کسی کو حق حاصل ہے...... اب دونوں میدان میں مقابلہ کررہی ہیں...... امرتا بھی پدما سے کسی طرح کم نہیں ہے...... پدما اس

انتظار میں کب اس کا راز تم پر افشا ہوتا ہے...... کب تم اسے جھلسا کر ماردیتے ہو...... راستہ صاف کردیتے ہو...... لیکن پدما اور امرتا دونوں ایک دوسرے کو ختم نہیں کرسکتی ہیں لیکن وہ کسی اور ذریعہ سے رقیب کو ختم کردیتی تو ان سے باز پرس نہیں ہوگی۔"

"آپ کی باتیں بڑی عجیب غریب اور پراسرار ہیں اور الجھا دینے والی بھی۔" آکاش نے کہا۔ "مجھے صرف اور صرف نیلم کی ضرورت ہے...... مجھے نہ تو پدما اور نہ امرتا کے عشق سے دلچسپی ہے اور نہ ہی ان کے حسین جسموں سے...... لیکن سوال یہ ہے کہ نیلم کو کس طرح سے غائب کیا گیا......؟"

"تمہاری بیوی نے جس سانپ کو تیزاب سے جھلسایا تھا اور جو مچھلی کے پیٹ سے نکلا تھا...... اس کے نر نے انتقام لینے کے لئے نیلم کو ڈسا تھا۔ لیکن اس کا زہر انسان کے لئے مہلک نہیں ہوتا ہے۔ اس زہر کے اثر سے بدن میں خون کا دوران ان چوبیس گھنٹوں کے لئے رک جاتا ہے۔ بعض اوقات چند ہفتوں تک...... اس وقت چوں کہ گلابی ناگن...... امرتا گلابی ناگن کہلاتی ہے...... ناگنیں، سفید، سیاہ اور سنہری ہوتی ہیں...... لیکن صرف ایک امرتا ہی گلابی رانی ہے ناگنوں کی...... امرتا...... پدما کے مقابلے میں نرم دل واقع ہوئی ہے۔ چوں کہ وہ تمہارے عشق میں گرفتار تھی...... اسے اس بات کا علم تھا کہ تم اور نیلم میاں بیوی اگلے جنم میں تھے اور اس جنم میں ہیں...... تم دونوں انتہائی شدید محبت جنون کے انداز سے کرتے ہیں...... پدما نے جب نیلم کو ڈسنے کے لئے جھلسے سانپ کو آمادہ کیا تو گلابی ناگن نے...... نیلم کے بہروپ میں کسی اور لڑکی کو بھیج دیا۔ اتفاق سے پدما کو ہوا تک نہیں لگی۔

میں تمہاری معلومات میں اس بات کا اضافہ کردوں کہ سانپوں کے کان نہیں ہوتے ہیں یہ آوازوں سے پیدا ہوتی زمین کے ارتعاش اور دھمک کو خوب پہچانتے ہیں۔ چوں کہ امرتا تمہارے عشق میں مبتلا ہوگئی تھی اس نے پدما کا جادو چلنے نہیں دیا۔ ورنہ وہ تمہیں کسی نہ کسی تمہارا خون پی کر اپنے خون کے اثر سے ہم نسل بنالیتی صدیوں کے لئے...... برسوں صدیوں کے سیوا سے ناگ دیوتا سانپوں اور ناگنوں کو پراسرار، ماورائی اور خطرناک قسم کی قوتیں دے دیتا ہے...... چوں کہ دشٹ اور اس کے چیلے ان کے ساتھی ہوتے ہیں۔ زیر اثر ہوتے ہیں اس لئے ان سے سفلی علوم سے خوب فائدہ اٹھاتی اور انہیں اس سے سرفراز بھی کرتے رہتے ہیں...... ان ناگنوں کو ہم نسل نر سانپوں کے مقابلے میں انسان بہت پسند اور مرغوب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ انسانوں کی دنیا میں پھیل جاتی ہیں...... انہیں بنگال کی سرزمین کے خوب صورت، تندرست اور جوان مرد ہمیشہ سے بہت پسند اور ان کی کمزوری رہے ہیں...... وہ ایسی حسین، جوانوں اور پرکشش لڑکیوں عورتوں کا روپ دھار لیتی ہیں کہ وہ اپنا دل دے بیٹھتی ہیں...... چوں کہ نشاط انگیز لمحات میں وہ غیر محسوس انداز سے خون پینے لگتی ہیں اس لئے مرد اپنی خوب صورتی، مردانہ وجاہت، طاقت اور جوانی غیر محسوس انداز سے کھوتے رہتے ہیں...... اصل طاقت اور خوب صورتی اور زندگی کا تعلق خون سے ہوتا ہے...... پھر ان کا زہر آہستہ آہستہ بدن میں پھیل کر دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے۔ پھر ایک دن ان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ ایسی ناگنوں جنہیں ناگ دیوتاؤں کی آشیر باد حاصل تھی وہ اس دنیا میں نوجوان لڑکوں عورتوں کو شکار کرتی تھیں۔

پھر تمہاری زندگی میں سروجا آئی اپنا راز آشکار ہوتے ہی فرار ہوگئی...... پھر امرتا تمہاری زندگی میں ناٹک کھیل کر آئی۔ چوں کہ وہ تم سے سچا عشق کرنے لگی۔ اس لئے اس گلابی ناگن نے پدما کی طرح تمہیں ڈسا نہیں...... وہ اس دنیا میں ہی تمہاری پتنی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میں نے آکر اس کے عشق کا سارا کھیل بگاڑ دیا...... لیکن ایک بات یاد رکھو...... موذی جانور بہت خطرناک ہوتا ہے...... مارآستین...... اس پر بسواس نہیں کیا جاسکتا...... نہیں...... کب، کس دن اور وقت تمہارا جی سر سے بھر جائے...... تم سے کوئی اور خوب

صورت مرد پسند آتا اور تم ڈس لئے جاتے......"

"اگر گلابی ناگن واپس آئے اور مجھے پدما کی طرح اپنی دنیا میں لے جائے؟" آکاش خوف زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ "سادھو بابا! میں تو اس خیال اور تصور سے ہی کانپ رہا ہوں کہ جس لڑکی کے حسین بدن کو پتنی کا سمجھ کر اس کی معیت میں وقت گزاری کرتا رہا وہ انسان نہیں ایک عورت کے روپ میں ناگن تھی۔ اس کی رعنائیوں سے نیلم کی جدائی کا جو غم تھا دور کرتا رہا یہ سمجھ کر وہ نیلم کا عکس ہے...... اگر وہ زہریلی گلابی ناگن پھر اس دنیا میں آجاتی ہے...... اور پھر وہ اب کہاں ہے......؟ کیا اس بات کا امکان ہے کہ مجھے ڈس لے......؟ پھر میں کس کس زہریلی ناگن سے لڑتا رہوں گا؟"

"تم اس کی چنتا نہ کرو۔" پھر اس نے اپنی اندرونی جیب سے ایک ایسا پتھر جو نہایت صاف و شفاف کسی ہیرے کی مانند چمکتا ہوا تھا۔ اس نے آکاش کی طرف بڑھایا۔ "اسے رکھ لو......"

"یہ کیا ہے......؟" آکاش نے الٹ پلٹ کر حیرت سے اس پتھر کو دیکھا۔

"یہ منکا ہے۔" سادھو نے جواب دیا۔ "جس وقت میں اسے زمین میں غرق کر رہا تھا اس سے چھین لیا ہے۔"

"وہ کس لئے......؟"

"جب کسی ناگن کو انسان سے عشق ہو جاتا ہے...... اسے مردوں کا چسکہ پڑ جاتا ہے تو وہ اپنی بد چلنی، حرکتوں اور عیاشی سے باز نہیں آتی ہے...... یہ منکا گلابی ناگن کا ہے۔ جس شخص کے پاس یہ منکا ہوگا اس کا کیا کسی بھی ناگن کا زہر اثر نہی کرے گا۔ میں نے اسے منتروں سے بڑا زوردار بنا دیا ہے...... عموماً ہوتا ہے کہ جس ناگن کا منکا ہو اس کا زہر اس پر اثر نہیں کرتا ہے...... وہ تمہارے پاس اپنے یا کسی بھی روپ میں آسکتی ہے...... اس لئے کہ تمہارے قرب اور عشق نے اسے دیوانہ بنا رکھا ہے...... لیکن اب معاملہ برعکس ہے۔ اب تمہیں اسے تلاش کرنا ہوگا...... اس لئے کہ اس کی مدد کے بغیر تم نیلم کو پا نہیں سکتے......؟"

"کہاں......؟" آکاش نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

"کالی راج دھانی......!" اس نے جواب دیا۔

"کالی راج دھانی......؟" آکاش کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ کیسا نام ہے جو میں پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"اس کا نام کالی راج دھانی اس لئے ہے کہ دس ہزار صدیوں سے کالا ناگ دیوتا کی حکومت ہے...... اس کا راج ہے...... یہ دنیا کی سب سے خطرناک راج دھانی ہے...... بڑی پراسراری ہے...... ہر کسی انسان کو نظر نہیں آتی ہے...... اسے آج تک کوئی دیکھ نہیں پایا ہے...... میں صرف اپنے قیاس سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بنگال کی دنیا میں ہے...... بنگال کی دنیا اتنی بڑی ہے کہ اس کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا...... ہاں...... یہ شاید ہے کہ کوئی وہ انسان ہے جو جہاں جادوگر اور کسی گرو مہاراج نے دیکھا اور جانتا ہو...... میں نے دس برس تک اس کا کھوج لگایا لیکن ناکام رہا...... مجھے افسوس ہے میرے بچے! میں تمہاری کوئی مدد یا رہنمائی نہیں کر سکتا...... لیکن صرف اتنا جانتا ہوں کہ کالی راج دھانی میں ایک جہان آباد ہے...... اس سرزمین پر کروڑوں سانپ، ناگ، ناگنیں اور اژدھے بسے ہوئے ہیں...... تمہاری نیلم وہیں قید ہے۔"

"اتنا کچھ بھی آپ نے کیسے اور کیوں کر معلوم کر لیا......؟" آکاش نے سوال کیا۔

"میری عمر بظاہر ستر اسی برس کی دکھائی دیتی ہے...... لیکن جب میں ایک سو ساٹھ برس کا تھا۔ تم سے کہیں خوب صورت اور کڑیل مرد...... مجھ پر ایک ناگن مرمٹی تھی۔ وہ میرے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ایک نوجوان ناری سمجھا تھا۔ اس سے خوب فائدہ اٹھایا...... میں نے اس قدر شدید عشق کیا کہ وہ مجھے اپنی راج دھانی میں اپنا بنا کر لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نشاط انگیز لمحات میں اس کی کچھ حرکات پراسرار اور عجیب و غریب قسم کی ہو جاتی ہیں۔ وہ میری گردن میں اپنے رسیلے ہونٹ پیوست کرتی تو اس کے دانت سوئی کی طرح چبھتے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے اسے ایک حسین، نوجوان اور بے سہارا لڑکی سمجھ کر اپنی پتنی بنا لیا تھا۔ اس وقت تک میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ ناگن ہے۔ پہلے تو میں نے اس کی حرکت کو جذباتی اور خود سپردگی سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مجھ میں کمزوری اور نڈھال پن پیدا ہو جاتا ہے۔

اتفاق سے میرے ملاقات ایک سنیاسی سے ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھتے ہی مجھ سے کہا کہ...... "یہ ایک زہریلی ناگن ہے جو تمہارے عشق میں مبتلا ہے...... اس سے ہوشیار رہنا، یہ بہت خطرناک ہے۔ اس سے جتنا جلد چھٹکارا پا سکتے ہو پا لو...... ورنہ یہ تمہیں اپنا ہم جنس بنا کر اپنی دنیا میں سدا کے لئے لے جائے گی۔"

میں نے ایک روز اس سے شدید جذباتی محبت کا اظہار کر کے ایسا خوش کیا اور اعتماد میں لیا کہ اس نے اعتراف اور اقرار کیا کہ وہ ایک ناگن جو اس کے عشق میں دیوانی ہو گئی ہے۔ اسے اپنا جیون ساتھی بنا کر اپنی راج دھانی میں لے جانا چاہتی ہے۔ کیوں کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی...... اگر اسے عشق نہ ہو گیا ہوتا تو وہ کچھ دنوں تک دل بہلانے اور خون پینے کے بعد ڈس کر چلی جاتی...... اس کی زندگی میں کوئی تیس مرد آچکے ہیں۔ اسے ان میں سے ایک بھی پسند نہ آیا اور نہ ہی ان میں کسی سے بھی عشق ہوا......

میں نے ایک روز دودھ میں زہر ملا دیا۔ وہ ایسا مہلک اور خطرناک زہر تھا کہ وہ پیتے ہی مر گئی۔ اسے پل بھر کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے یہ دودھ ایک برتن میں رکھا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ رات کے وقت جب مجھے گہری نیند میں پاتی تھی تو بستر سے نکل کر باورچی خانے میں جاتی۔ پھر وہ ناگن کا روپ دھار کر دودھ پی جاتی تھی۔ پھر میں نے اسے بھسم کر کے اس کی راکھ دریا میں بہا دی...... اس سے علم بھی ہوا تھا کہ ان موذی جانوروں کی ایک راج دھانی ہے جس کا نام ہے کالی راج...... یہ بہت بڑی دنیا ہے۔

مجھے پراسرار اور سفلی علوم کا بہت شوق تھا۔ نادیدہ طاقتوں کو اپنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی اسے سیکھنے میں صرف کر دی۔ بنگلا کے ایک بہت بڑے جادوگر جس نے تین سو برس کی عمر پائی تھی۔ اس کی شاگردی کر لی۔ پھر میں افریقہ، ہندوستان، مصر بھی گیا۔ یہ جنون اور تجسس لے جاتا رہا۔ میرے استاد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی زندگی میں بدی کے خلاف لڑنے میں وقف کر دوں۔ میں آج بھی نیکی کے لئے زندہ ہوں اور بدی کے خلاف برسرپیکار رہوں۔ اس کارن بھی میں نے تمہیں امرتا سے نجات دلائی...... اس کالی راج دھانی کا ہر موذی جانور ایسا ہے کہ اس کے کاٹے کا پانی بھی نہیں مانگتا...... بہرحال یہ منکا جب تک تمہارے پاس ہے تم ہر موذی جانور اور زہریلے کیڑوں سے بھی محفوظ ہو۔ میں اس سے زیادہ تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

"پھر بھی آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ کالی راج دھانی کہاں ہوگی......؟ مصر، افریقہ...... یا ہندوستان میں؟" آکاش نے کہا۔ "اس لئے کہ میں جلد از جلد نیلم کو وہاں سے لانا چاہتا ہوں...... اور پھر امرتا کو بھی تلاش کرنا ہوگا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ یہ بنگال، آسام اور ہندوستان کے درمیان آباد ہوگی...... امرتا نے جن لڑکوں کو ڈسا دل بہلا کر ان کا تعلق بنگال اور آسام سے تھا۔ ان میں صرف ایک ہندوستانی تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں امرتا کو تلاش کرنے میں تمہیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ امرتا تمہارے عشق میں دیوانی ہو چکی ہے وہ خود ہی تلاش کرتی آئے گی۔ تم اس سے اس قدر جذباتی انداز سے پیش آنا کہ شاید وہ تم پر ترس کھا جائے۔"

بوڑھا سادھو اسے سمجھاتا رہا کہ گلابی ناگن کو کس طرح سے اعتماد میں لے کر اور عشق کے جال میں جکڑ کر نیلم کی بازیابی کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے...... اگر

اسے کالی راج دھانی جانا پڑے تو چلے جانا...... ڈرنا نہیں......اس خطرناک مہم کو سر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا......

سادھو اس سے باتیں کرتے کرتے اچانک اور ایک دم سے اس کی نظروں سے اپنی لاٹھی سمیت غائب ہوگیا۔

آکاش بھونچکا سا ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک وہ سکتے کی سی حالت میں بیٹھا رہا۔ اسے یقین نہیں آیا اور ایسا لگا تھا جیسے اس نے جاگتے میں کوئی سپنا دیکھا ہو۔ وہ بڑی دیر تک حیران اور خوش ہوتا رہا تھا کہ...... بھگوان نے اس کی غیبی مدد کی۔ اس نے پرکھوں سے سنا تھا کہ جو کوئی کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرتا ہے تو وہ ضائع نہیں ہوتی۔ کام ضرور آتی ہے۔ اگر اس بوڑھے سادھو کا دیا ہوا منکا نہ ہوتا تو وہ اسے ایک سپنا ہی سمجھتا......

آکاش نے ساری رات اس گلابی ناگن اور نیلم کے بارے میں سوچتا رہا۔ پہلے تو اس کے سامنے ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ امید کی ایک کرن تک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ نیلم کی موت سے زیادہ اس بات پر حیران تھا کہ نیلم کی لاش کس نے اور کیوں غائب کی......؟ قبر کو کس نے ہموار کر کے نام و نشان تک مٹا دیا تھا...... بوڑھا سادھو بھی بتا نہ سکا...... اس کے ان سوالوں کا جواب بھی وہی دے سکتی تھی...... امرتا سے کب...... کس دن اور وقت...... اور کہاں ملاقات ہو سکتی ہے...... ہوگی......؟ وہ نہیں جانتا اور اندھیرے میں تھا...... اب امرتا کو کہاں تلاش کرے...... سادھو نے تو اسے پاتال کی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا...... وہ جلد از جلد امرتا کو تلاش کر کے کالی راج دھانی جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

اس نے کئی دنوں تک امرتا کو ہر جگہ تلاش کیا...... بازاروں...... محلوں میں...... تفریحی مقامات اور دریا اور جنگلات میں بھی...... اگر اس کے پاس سادھو کا منکا نہ ہوتا تو وہ امرتا کی تلاش میں خوار نہ ہوتا...... امرتا کے بارے میں سوچتا تو اس کا من کہتا کہ امرتا بے وفا نہیں ہے...... اس نے اپنے آپ کو نیلم کی سی سچی ثابت کیا تھا۔ ٹوٹ کر عشق کیا تھا...... اسے اس بات کی آشا تھی کہ وہ کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی روپ میں اس سے ضرور ملے گی۔

چوں کہ وہ سارا سارا دن امرتا کی تلاش میں نکلتا تھا اور دن ڈوبنے سے پہلے گھر لوٹتا تھا اس لئے اسے گھر کی صفائی اور کھانا پکانے کے لئے ایک نوکر کی ضرورت تھی...... اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ دس بارہ برسوں تک کوئی کام گزارہ آسانی سے کیا ٹھاٹ باٹ سے بھی کر سکتا تھا...... نواحی بستی میں اس کا ہم جماعت نریش رہتا تھا...... اس کا ہم جماعت کا ایک دور کا ایک رشتہ دار پردیپ تھا...... وہ چالیس برس کا ایک صحت مند اور چاق و چوبند شخص تھا۔ اس کی بیوی اور ایک لڑکا ندی میں کشتی الٹنے سے مر چکے تھے۔ وہ کلکتہ کے ایک ہوٹل میں باورچی رہ چکا تھا۔ وہ اب کلکتہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ بے روزگار بھی تھا۔ اس کے دوست نے پردیپ کی بڑی تعریف کی تھی وہ نہ صرف اچھا باورچی ہے بلکہ محنتی اور ایمان دار بھی ہے۔ آکاش کو ایسے ہی نوکر کی ضرورت تھی۔ اس کے دوست نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی مزے دار کھانے میں ماہر تھا۔ محنتی اور نفاست پسند بھی تھا۔ صاف صفائی ایسا کرتا تھا کہ گھر آئینے کی طرح چمک اٹھتا تھا۔ جوانوں کی طرح صحت مند اور توانا لگتا تھا۔

اس نے ایک روز آکاش کو مشورہ دیا۔ "بنگال سینما میں ایک فلم سات بھائی چمپا لگی ہے...... نہ صرف اس فلم کی کہانی بہت اچھی ہے بلکہ اس کے سات گانوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔ ایک برس سے فلم لگی ہوئی ہے۔ اب بھی لوگ بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی ایسا ہو جس نے کئی بار یہ فلم نہ دیکھی ہو...... میں بھی سات مرتبہ دیکھ چکا ہوں...... آپ بھی دیکھ آئیں۔ دل بہل جائے گا۔ وقت بھی اچھی طرح گزر جائے گا۔"

پردیپ نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی اس فلم کی بڑی شہرت اور مقبولیت تھی۔ اس نے فلم دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ آکاش سینما ہال پر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب

ہوا کہ ایک برس سے فلم کی نمائش ہو رہی ہے اس کے باوجود مردوں، لڑکوں، لڑکیوں، عورتوں کی ایک بڑی تعداد فلم دیکھنے آرہی ہے۔ وہ ٹکٹ لے کر بالکنی میں آ گیا جس میں ایک بکس تھا۔ اور ایک بڑا صوفہ بھی تھا۔ بکس بڑا مہنگا تھا۔ اس بکس میں بوڑھے بیٹھ کر فلم دیکھتے تھے۔ فلم کم دیکھتے تھے۔ پیار و محبت کی باتیں اور عہد و پیمان کرتے، جذباتی ہوتی اور بہکتے بھی رہتے۔ کیوں کہ تیسرا کوئی مخل نہیں ہو پاتا۔ عموماً بڑے گھرانوں اور کالج کی لڑکیاں اور لڑکے بکس میں فلم دیکھتے تھے۔ اس میں فلم سکون اور آرام سے دیکھا جا سکتا تھا۔

فلم شروع ہونے تک کوئی نہیں آیا تھا۔ سات بھائی چمپا کی کہانی اس وقت کی تھی جب انسانیت نے تہذیب کو چھوا نہیں تھا۔ چمپا جو فلم کا مرکزی کردار تھی جس کے گرد ساری کہانی گھومتی تھی اس کے بدن پر جو لباس تھا اس میں حجاب نہیں تھا۔ اس کی ہیروئن شعلہ مجسم تھی۔ وہ ایک راج کمار کے عشق میں مبتلا تھی۔ جب ان کی کسی ویرانے میں ملاقات ہوتی تو وہ جذباتی ہو جاتے تھے۔ ہیروئن جتنی حسین تھی اتنی ہی پر کشش...... ایک منظر میں وہ تالاب کے کنارے سو رہی ہوتی ایک راکشش اسے اٹھا کر اپنے محل میں لے جاتا اور اس کی بے حرمتی کی کوشش کرتا اس وقت اس کا عاشق راج کمار اپنی محبوبہ کو بچانے پہنچ جاتا اور راکشش کا سر قلم کر دیتا۔

اس دوران آکاش نے محسوس کیا کہ کوئی خاموشی سے اس کے پاس آ کر بیٹھی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی لڑکی یا جوان عورت ہے۔ کیوں کہ سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک نے اسے معطر کر دیا۔ اس نے ایک منظر کی سفید روشنی میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے لڑکی سے ہٹ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو لڑکی سے اس کا ہاتھ ٹکرا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے جلتے توے پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔ لڑکی نے اس دل کش انداز سے مسکرا کر دیکھا۔ آکاش کو خیال آیا کہ کہیں یہ امرتا تو نہیں جو اس روپ میں آئی ہو۔

امرتا کا خیال آتے ہی اس نے لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرلیا تو وہ لڑکی سرگوشی میں بولی۔ "باہر چلیں۔"

لڑکی نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا وہ بکس سے نکل گئی۔ جب وہ باہر آیا تو اس وقت وقفہ ہوا تھا۔ وہ لڑکی برآمدے میں اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ پھر لڑکی نے اسے خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ "چلیے گھر چلیں۔"

"اب اس کے لئے اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ یہ امرتا ہی ہے۔ وہ اس لئے گھر چلنے کی دعوت دے رہی ہے...... اس نے بالکل ہی ایک نئی لڑکی کا روپ دھار رکھا ہے۔ ایک سائیکل رکشہ روک کر دونوں اس میں سوار ہوگئے۔

آکاش کو یاد آیا کہ یہ لڑکی ہو بہو اس کی ہم جماعت لڑکی لاجونتی کی طرح ہے۔ اس کا شمار کالج کی حسین لڑکیوں میں کیا جاتا تھا۔ رکشہ چلانے والا ایک بوڑھا تھا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا اور سرگوشی میں بولی۔

"آکاش صاحب......! آپ میرے ساتھ رات بھر رہیں گے یا پھر جلدی چلے جائیں گے؟"

"کیا مطلب...... امرتا......؟" آکاش نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"میں امرتا نہیں لاجونتی ہوں۔" وہ سنجیدہ ہوگئی۔

"لاجونتی......؟ تم امرتا نہیں ہو......؟ سچ سچ بولو......" آکاش چکرا گیا۔

"آپ میرے گھر چلیں......" لاجونتی بولی۔ "میری ماں اور معذور باپ گواہی دے گا کہ میں لاجونتی ہوں...... حیرت ہے آپ مجھے بھول گئے۔ نیلم کی موت نے صدمے سے آپ کے دماغ کو متاثر کیا ہے۔ یہ امرتا کون ہے......؟ ہماری کلاس میں اس نام کی کوئی لڑکی نہ تھی...... یاد آیا؟"

آکاش تذبذب میں پڑ گیا...... اسے یقین نہیں آیا کہ لاجونتی غلط راستے پر چل پڑی ہے۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم غلط راستے پر چل پڑو گی...... جب کہ تم ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو؟"

"بات یہ ہے آکاش صاحب......!" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "کوئی گھریلو لڑکی یہ گھناؤنا پیشہ اپنانا نہیں چاہتی...... پتا جی کو ایک بدمعاش نے ایذا اور تشدد سے اس لئے معذور کردیا کہ اسے میرا رشتہ دینے سے انکار کردیا...... پتا جی کی ملازمت جاتی رہی...... پھر میں نے ملازمت کی کوشش کی...... ملازمت دینے کے بہانے مجھے بے آبرو کیا گیا...... اور پھر ایک دفتر میں ملازمت ملی تو اس شرط پر میں مالک کو گاہے گاہے خوش کرتی رہوں...... وہ مجھے ہراساں کرتا اور تنخواہ بھی تنگ کرکے قسطوں میں دیتا تھا...... پھر میں نے یہ راستہ اختیار کیا...... آپ کو سینما ہال میں دیکھ کر خوشی ہوئی...... کالج میں میرا دل کرتا تھا کہ میں نیلم کی جگہ ہوتی...... جب آپ نے فلم کے دوران میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے قریب کیا تو یقین نہیں آیا کہ آپ شریف آدمی ہیں...... پھر خیال آیا کہ نیلم کی موت اور جدائی نے آپ میں عورت کی طلب اور خواہش پیدا کردی...... اب مجھے خیال آیا کہ آپ امرتا سمجھ کر غلط فہمی میں آگئے؟"

"ہاں......" آکاش نے سر ہلادیا۔ "امرتا تمہاری ہم شکل ہے۔ میری منگیتر ہے۔ وہ کسی بات پر ناراض ہوکر چلی گئی تھی۔ معاف کرنا لاجونتی......! میں تمہارے ساتھ وقت نہیں گزار سکتا......"

"آج آپ نے میری شام خراب کردی...... دو سو روپے...... ٹکٹ کے تین روپے...... اور رکشہ والے کے پانچ روپے...... آج پہلی بار نقصان اٹھا رہی ہوں...... چلئے...... کوئی بات نہیں...... آپ کا قرب اس سے کہیں......"

"لاجونتی......!" آکاش بولا اور اس نے رکشہ رکوایا۔ پھر جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "اسے رکھ لو۔ ایک دوست کی طرف سے......"

لاجونتی نے لینے سے انکار کیا تو وہ اس کے گریبان میں ٹھونس کر اتر گیا۔ جب وہ ایک خالی رکشہ کی طرف بڑھا تو اس نے لاجونتی کی سسکیاں سنیں۔ وہ ان کے درمیان کہہ رہی تھی۔ "آکاش! تم جتنے خوب صورت ہو اتنے اچھے اور عظیم انسان بھی ہو۔

☆......☆......☆

دوسرے دن اچانک رات کے وقت مغرب کی سمت سے کالی آندھی اٹھی اور طوفان میں تبدیل ہوگئی۔ پھر بارش شروع ہوگئی۔ طوفان اور بارش نے تباہی مچادی۔ اس وقت پردیپ اپنے کمرے میں تھا۔ کسی نے دروازے کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ آکاش نے دروازہ کھولا تو ایک نوجوان لڑکی دندناتی ہوئی اندر گھس آئی۔ وہ اور اس کا لباس بارش میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آکاش نے اس لڑکی کو اس حالت میں دیکھا تو ترس گیا۔ پھر اس نے صندوق سے نیلم کا ایک جوڑا نکالا اور تولیہ دیتے ہوئے کہا۔ "برابر کے کمرے میں جاکر کپڑے بدل لو...... جسم اور بال بھی خشک کرلو۔"

لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا۔ لڑکی نے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے آگے بڑھا...... اس لمحے آسمان پر بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ رات دن کی سی روشنی میں نہا گئی۔

اس نے دیکھا لڑکی نے جو اپنا لباس اتار دیا تھا اس روشنی میں اس کا بدن نہا گیا۔ نہ صرف چہرہ بلکہ بدن بھی گلابی تھا...... ایسا گلابی بدن کب کسی عورت کا ہوتا ہے......؟ ایک عجیب اور انوکھا بدن......

گلابی ناگن امرتا...... اس لڑکی کے روپ میں آگئی...... اب نیلم تک اس کی رسائی کیا ہوجائے گی......؟ کیا امرتا اس بات کو پسند کرے گی کہ...... وہ اس کے بجائے نیلم کی محبت میں اسے بھول جائے......؟

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ایسی کیا خطا ہوئی تھی مجھ سے جو اس نے مجھے بے وفا کہا
اس کی خاطر ہی تو میں نے سارے زمانے سے بے وفائی کی تھی
(صبا محمد اسلم...... گوجرانوالہ)

سزا یہ ملی کہ آنکھوں سے نیند چھین لی اس نے
جرم یہ تھا کہ اس کے ساتھ جینے کا خواب دیکھا تھا
(قیصر جمیل پروانہ...... فیصل آباد)

وہ آئے ہماری قبر پر اپنے ہمسفر کے ساتھ نوری
کون کہتا ہے کہ یہ مسلمان کو جلایا نہیں جاتا
(غلام نبی نوری...... قصور)

کسی کی وفا کا کوئی اعتبار نہیں
ہمیں بھی اپنے دل پہ کوئی اختیار نہیں
نذرانہ دے گیا وہ ہمیں آنسوؤں کا
ہم سے بھول کر کرتا کوئی پیار نہیں
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

کانٹے میری انا کے، مجھے روکتے رہے
میں بن کے تیری گلی سے تماشا گزر گیا
وہ شخص کون تھا جو "حقارت" کی آنکھ سے
دریا کو دیکھتا ہوا "پیاسا" گزر گیا
(انتخاب: ساحل دعا بخاری...... بصیر پور)

کسی کو محبت کی سچائی مار ڈالے گی
کسی کو محبت کی گہرائی مار ڈالے گی
اس محبت سے کوئی نہیں بچے گا
جو بچ گیا اسے تنہائی مار ڈالے گی
(ساجد جاوید...... نارووال)

میرا چشمہ نخلستان سائیں میرا بادل سرسبز بنجر
تو میرا تخت میرا تو ہی بخت میرا تو تاج میرا تو گھر
میں پنچھی ایک دعا مانگوں تو کر منظور اگر
پنجرہ پنجرہ شام نہ دے یا کاٹ دے میرے پر
(انتخاب: راحل بخاری...... بصیر پور)

تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آکر تو دیکھو
تڑپنے پہ میرے نہ تم پھر ہنسو گے
کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو
(محسن عزیز حلیم...... کوٹھ کلاں)

محبت کو میری بے جان کرگئے
جس کو سمجھا اپنا وہ حیران کرگئے
ٹوٹ کر دل کے ٹکڑے اس دل میں ہی چبھ گئے
دل توڑ کر یوں گئے جیسے احسان کرگئے
(انتخاب: ملیحہ احمد...... کراچی)

کرو تلاش تو کوئی مل ہی جائے گا
مگر وہ کون تمہیں ہماری طرح چاہے گا
تمہیں ضرور کوئی چاہت کی نظر سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا
(محمد عارف...... گوجرانوالہ)

وعدے کرکے لوگ بھلا کیوں دیتے ہیں
اب کے میں بھی ایسا کرکے دیکھوں گا
(انتخاب: محمد اسحاق انجم...... کنگن پور)

وہ بھی کیا شخص ہے کھلتا ہی نہیں بھید اس کا
جب بھی دیکھوں اس دنیا سے خفا ہی دیکھوں
(انتخاب: طارق حلیم...... کوٹھ کلاں)

ہے کس کا انتظار، کہاں دھیان ہے لگا
کیوں چونک پڑتے ہو آواز پا کے ساتھ
(انتخاب: مسکان...... قصور)

مدت سے تھی کسی کے ملنے کی آرزو
خواہش دیدار میں سب کچھ گنوادیا
کسی نے دی خبر کہ وہ آئیں گے رات کو
اتنا کیا اجالا کہ گھر تک جلادیا
(انتخاب: ہاشم...... کراچی)

تیری پلکوں کے آنسوؤں سے عقیدت مجھے بھی ہے
تیری طرح زندگی سے محبت مجھے بھی ہے
تو اگر نازک ہے تو میں بھی نہیں پتھر
تنہائی میں رو دینے کی عادت مجھے بھی ہے
(انتخاب: شہریار ملک...... کراچی)

☆☆

ویران آنکھوں میں خواب اب بستے بھی نہیں
ایسا رلایا ہے تو نے کہ ہم ہنستے بھی نہیں
یونہی لگتا تھا جی نہ پائیں گے جو تم نہ ملے
کیسے کم بخت ہیں ہم اب تیرے بن مرتے بھی نہیں
پھر بھی آتا ہے تو یاد مجھے اکثر کیوں
تیرے پیار کے دیپ میرے دل میں اب جلتے بھی نہیں
آج بھی اجڑی ہوئی امیدوں پر اشک بہاتے ہیں ہم
زخم جفاؤں کے نجانے کیوں بھرتے بھی نہیں
کہیں پھر نہ جاگ اٹھے تیری آرزوئے دید
اسی ڈر سے تیرے کوچے سے ہم گزرتے بھی نہیں
اس ستم زدہ ہستی کو کوئی سنبھالے کیسے
ایسا بکھیرا ہے تو نے کہ ہم سمٹتے بھی نہیں
بہت بے چین سے رہتے ہیں ہم ہر لمحہ
عجب اندیشے ہیں جو ذہن سے ہٹتے بھی نہیں
تیرے بعد ہمیں کوئی بھایا ہی نہیں پر کیا کریں
راستے زندگی کے تنہا ہم سب اب کٹتے بھی نہیں
(شائستہ سحر......راولپنڈی)

عشق والوں کی ملاقات بری لگتی ہے
ہم کو دنیا کی یہی بات بری لگتی ہے
مجھ کو آتا ہے تیرے ریشمی آنچل کا خیال
کب ستاروں سے بھری رات بری لگتی ہے
شہر آنے کے لئے دل تو بہت کرتا ہے
کیا کروں صورت حالات بری لگتی ہے
مجھ سے پوچھے تو سہی آکے میرے بارے میں
شہر میں جس کو میری ذات بری لگتی ہے
جانے کیا بات ہے عاطر کہ مجھے اس کے بغیر
یہ مہکتی ہوئی برسات بری لگتی ہے
(رانا حنیف عاطر......جھنڈو)

میرے دل کے سوئے سے جذبے جگادو
مجھے اتنا چاہو کہ پاگل بنادو
میرے دل کی دھرتی ہے پیاسی بہت ہی
مری جان یوں برسو کہ جل تھل بنادو
مجھے اس کی راہیں سجانا ہیں لوگو
کہیں سے ذرا تم بہاروں کو لادو
میں ہر پل تمہارے ہی بارے میں سوچوں
مجھے ایسا رنگیں سا وقت لادو
میرے ہاتھ میں جس قدر ہیں لکیریں
فقط اپنا ہی نام ان پر لکھادو
ہمیں اب کوئی بھی جدا کر نہ پائے
چلو راستے سے زمانہ ہٹادو
خدا سے فقط تم کو مانگوں میں خانم
ہتھیلی سے اپنی ہتھیلی ملادو
(فریدہ خانم......لاہور)

وہ اصل تابش مہر و قمر سے خوب واقف ہیں
جو اس زمانہ وحشت اثر سے خوب واقف ہیں
ہوا ہے خون غریباں سے قصر نو تعمیر
ہم استواری دیوار و در سے خوب واقف ہیں
ہمارے سامنے بدلی فضائے بزم وطن
ہم اس نظام کے زیر و زبر سے واقف ہیں
الم زدوں سے نہ کر کوئی پاس وفا عہد وفا
وہ رازداں اگر ہیں ہم ان سے خوب واقف ہیں
جہاں کے تلخ حقائق سے سابقہ ہے ہمیں
ہم اقتضائے سرشت بشر سے خوب واقف ہیں
وہ خوب جانتے ہیں واجد وسعت نظر اس کی
جو لوگ اب شواہد بشر سے خوب واقف ہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

کسی کی آنکھوں میں خواب سجا کے ہم
پیار کی تعبیر ڈھونڈتے رہے ہیں ہم
جو کھوگیا تھا تیز ہواؤں میں تو پھر

رہ رہ کے اسے تلاش کرتے رہے ہیں ہم
شب کے آنگن میں اندھیرا ہے مدت سے
آنسوؤں کے چراغ جلاتے رہے ہیں ہم
اس کے پیار کی انتہا ہوگئی تھی آج
گزرے ہوئے ایام یاد دلاتے رہے ہیں ہم
ہجر میں جل کے اس کا یہ دل راکھ ہوا
اسے تنہائی میں قصہ غم سناتے رہے ہیں ہم
اس کا کیا ذکر کریں بچھڑ گیا جو بہار میں جاوید
روٹھے ہوئے دوست کو مناتے رہے ہیں ہم
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

مجھ سے بچھڑ کے اب وہ مغرور ہوگیا ہے
پھر بھی لگتا ہے وہ زخموں سے چور ہوگیا ہے
اب تو اس سے بات بھی کرو تو جواب نہیں دیتا
مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت مغرور ہوگیا ہے
سارا شہر جسے کہتا تھا بے وفا کبھی!
اب وہ بے وفا کے نام سے مشہور ہوگیا ہے
شاید میری وفا کو اس نے اپنے قابل نہ سمجھا
یا اس کی زندگی میں شامل کوئی اور ہوگیا ہے
(صبا محمد اسلم......گوجرانوالہ)

تم ایک بار میرے پیار پہ یقیں تو کرو
ہم اپنے دل میں تمہارے سارے غم چھپالیں گے
لبوں پر تمہارے سجا کر جہان کی خوشیاں
تمہارے سارے ستم ہنس کے ہم اٹھالیں گے
قسم ہے تم کو ہمارے لئے نہ یوں اداس رہو
ہمارے دل میں چھپی دھڑکنوں کے پاس رہو
وہاں پہ کوئی بھی غم تم کو چھو نہ پائے گا
جو آگیا تو اسے اپنا ہم بنالیں گے
چھپاؤ مجھ سے نہ تم اپنی داستان غم
نہیں ہو تنہا کبھی تم تمہارے ساتھ ہیں ہم
جو رنج تیرے نصیبوں میں لکھ دیئے رب نے
انہیں لکیروں میں اپنی ہی ہم لکھالیں گے
تم ایک بار میرے پیار پہ یقین تو کرو
ہم اپنے دل میں تمہارے غم چھپالیں گے
(انتخاب: عائشہ محمد عادل......گوجرانوالہ)

وہ میرے بارے میں سوچتی ہے یہی بہت ہے
اس کو میں دیکھوں تو وہ دیکھتی ہے یہی بہت ہے
وہ خود کو میرا نہیں سمجھتی تو کوئی غم نہیں
وہ مجھ کو اپنا تو مانتی ہے یہی بہت ہے
حقیقتوں میں ملاپ اس کا نہیں ضروری
وہ مجھے خوابوں میں مل رہی ہے یہی بہت ہے
اگر وہ میری نہیں ہوئی تو یہ میرا مقدر
مگر میں تو اس کا ہوں یہی بہت ہے
وہ مجھے نہیں چاہتی تو کوئی غم نہیں
میری محبت کو تو مانتی ہے یہی بہت ہے
"ہاں بس یہی بہت ہے"
(انتخاب: علی احمد......کراچی)

لو اپنا جہاں دنیا والوں ہم اس دنیا کو چھوڑ چلے
جو رشتے ناطے جوڑے تھے وہ رشتے ناطے توڑ چلے
کچھ سکھ کے سپنے دیکھ چکے کچھ دکھ کے سپنے جھیل چکے
تقدیر کی اندھی گردش نے جو کھیل کھلائے کھیل چکے
ہر چیز تمہاری لوٹادی ہم لے کر نہیں کچھ ساتھ چلے
پھر دوش نہ دینا اے لوگو ہم دیکھ لو خالی ہاتھ چلے
یہ راہ اکیلی کٹتی ہے ہاں ساتھ نہ کوئی یار چلے
اس پار نہ جانے کیا پائیں اس پار تو سب کچھ ہار چلے
(عثمان ساحل......کنگن پور)

ترے رخسار کا غازہ تو اک اکسیر انمول ہے
جہاں بھر کے خزانوں سے تری تصویر انمول ہے
جہاں کے قید خانوں سے تو قیدی چھٹتے دیکھے ہیں
مگر اس عشق کا زندان اور زنجیر انمول ہے
ستم تیری نگاہوں کے سدا جھیلے ہیں دل پر ہی
جہاد عشق میں نظروں کی یہ شمشیر انمول ہے

کئی نقصان سہہ کر بھی محبت کررہے ہیں ہم
سکون قلب ملتا ہے کہ یہ تقصیر انمول ہے
وضاحت تو کبھی تم کربلا سے پوچھو الفت کی
جدا مفہوم ہے اس عشق کا، تفسیر انمول ہے
ردا اوڑھی ہے میں نے شام ڈھلتے ہی اداسی کی
اسد مالک بنا اشکوں کا یہ جاگیر انمول ہے
(عمران اسد......کامل پور موسیٰ)

اندر سے میں ٹوٹ گیا ہوں
اذیت سے میں چھوٹ گیا ہوں
تباہی عشق کی ایسی پھیلی
وقت سے پہلے میں لٹ گیا ہوں
اب میں تم سے نہیں بولوں گا
جاؤ تم سے میں روٹھ گیا ہوں
دل بدن جگر جل رہا ہے
عشق میں کھا گہری میں چوٹ گیا ہوں
سینے پہ بوجھ ہے سانس پھول گئی ہے
دم گھٹنے سے میں پھوٹ گیا ہوں
تیرے بے رخی سہہ کر جاناں
ارمانوں کا گلا میں گھونٹ گیا ہوں
پیار و محبت میں جنگ جائز ہے ذاکر
پیار میں بول پہلا میں جھوٹ گیا ہوں
(محمد ذاکر......ہلاں آزاد کشمیر)

نہ پوچھ مجھ سے میری داستاں
تمہارے آنسو چھلک پڑیں گے
یوں نہ چھینو بچوں سے ان کی خواہش
کہ وہ بچارے بلک پڑیں گے
ایک تم ہو کہ ہماری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کرتے
مگر یہ جان لو ہم اگر بازار میں نکلے تو چہرے جھلس پڑیں گے
ہمیں پتہ ہے تو کسی اور سے ملتا ہے
مگر ہر دل سے نکال کر ہم یہ دیکھنے سے جل پڑیں گے
رضا یہ زمانہ ہے کہ ملنے نہیں دیتا ہمیں
کیونکہ اگر ہم ملے تو ان کے آنسو نکل پڑیں گے
(سکندر علی رضا......فیصل آباد)

فصیل جسم پہ تانی ہے کرب کی چادر
ہم اہل درد سے پوچھ کہ زندگی کیا ہے
وہ میرے دل کی ستوں میں حلول کی خاطر
فصیل جسم میں کتنے شگاف کرتا ہے
وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لئے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھالیا مجھے
ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک میرے زخم کے سلے بھی نہیں
دکھ کی یکسانیت سے یہ لگتا ہے
ایک رات پلٹ کے آتی ہے
(محمد فواد......ضلع صوابی)

عشق اگر تجھ کو جناب ہوجائے
ہجر کا تو بھی نواب ہوجائے
روز مر مر کے تو جیے اے منیر
لمحہ لمحہ تیرا عذاب ہوجائے
جسے تو چاہے زندگی کی طرح
وہ اور آنکھوں کا خواب ہوجائے
تو اسے ڈھونڈتا رہے ہر دم
ختم تیرا بھی شباب ہوجائے
اے تو دیکھے ہزار آنکھوں
چہرہ مگر اس کا سراب ہوجائے
آنکھ میں تیرے ہو جو آنسو
عشق میں وہ بھی تیزاب ہوجائے
تو بنائے فرشتہ اس کو مگر
منیر وہ بھی خراب ہوجائے
پھر مقدر تیرا بھی اے میرے ہمدم
جام و ساغر شراب ہوجائے
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)
☆☆

یہ شام و سحر
یہ پودے، شجر
صحرا و گلستاں
زمین و زماں
وہ دریا، سمندر
وہ گلشن کا منظر
وہ قادر، کریم
وہ معطی، حلیم
وہ ہر اک کا رازق
وہ نعمت کا خالق
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

دکھ محبت کے سہہ گئے آخر
ہم اکیلے ہی رہ گئے آخر
تم محبت سے آشنا ہی نہیں
جاتے جاتے وہ کہہ گئے آخر
دن گزاروں میں کس سہارے پہ
مجھ سے یادیں بھی لے گئے آخر
دل مچلتا تھا دیکھ کر جن کو!
چین دل کا وہ لے گئے آخر
چاند دیکھا ہے جب بھی شام ڈھلے
اشک آنکھوں سے بہہ گئے آخر
جن سے رکھی تھی پیار کی امید
غم کی دولت وہ دے گئے آخر
(حکیم خان حکیم......کامل پور موسیٰ)

اشک تھے بے حساب آنکھوں میں
کتنے اترے عذاب آنکھوں میں
آج بھی ہیں تمہاری یادوں کے
مہکے مہکے گلاب آنکھوں میں
عکس ہے اس کا سامنے ایسے
جیسے ہو ماہتاب آنکھوں میں
اس نے کھولی نہیں زبان تو کیا
تھا وفا کا جواب آنکھوں میں
وہ کیا بھیگا ہوا تھا بارش میں
آگیا انقلاب آنکھوں میں
ڈگمگائے گئے تھے ہم رانا
تھا نشہ پرشباب آنکھوں میں
(قدیر رانا......راولپنڈی)

اک عشق نگر کی وادی تھی
جہاں پیار کی ندیا بہتی تھی
کچھ دل والے بھی رہتے تھے
جو پیار کی باتیں کرتے تھے
جب بہار کا موسم آتا تھا
اور پھول پیار کے کھلتے تھے
ان مست نشیلی شاموں میں
پیار سے دو دل ملتے تھے
اک روز وہ بستی اجڑ گئی
اور پیار کی بستی بکھر گئی
پھر ہر اک دل کو سوگ لگا
اور جیون بھر کا روگ لگا
دیوانے پھرتے رہتے ہیں
اور ہر اک سے یہ کہتے ہیں
اقرار کسی سے نہ کرنا
تم پیار کسی سے نہ کرنا
ہاں پیار کسی سے نہ کرنا
سچ ہے! پیار کسی سے نہ کرنا
(تحریر: محمد وارث آصف......واں بھچراں)

دل تیرے غم کی بارگاہ میں ہے
جیسے قیدی حضور شاہ میں ہے
شہر والوں کو کچھ خبر ہی نہیں
کیسا سیلاب آج راہ میں ہے
تعلق تو ایک سادہ لفظ ہے
پھر جو بھی ہے، نگاہ میں ہے
حادثہ ہوچکا کہ ہونا ہے
بھیڑ کیسی یہ شاہراہ میں ہے
ہم کسی تیسرے کی منزل ہیں
دل کسی دوسرے کی راہ میں ہے
نارسا بخت کا گلہ کیسا؟
سفر ہی تمام راہ میں ہے
کب سے میں نے پلک نہیں جھپکی
کوئی امجد میری نگاہ میں ہے
(انتخاب: راحل بخاری......بصیر پور)

اک روز کوئی تو سوچے گا
فرزانوں کی بستی میں
اک شخص تھا پاگل پاگل سا
وہ باتیں ٹھیک ہی کہتا تھا
بارش کی طرح پر شور نہ تھا
دریا کی طرح چپ رہتا تھا
دنیا نے اسے کچھ بھی نہ دیا
پر اس نے جگ کو پیار دیا
جاں روتے روتے کھو بیٹھا
دل ہنستے ہنستے ہار دیا
کس چاہ پہ تن من وار دیا
کس رنج نے اس کو مار دیا
اک روز کوئی تو سوچے گا
اور پہروں بیٹھ کے روئے گا......!
(شگفتہ حسین......کراچی)

کیوں بھول گئے ہم کو
رشتہ تو پرانا تھا
اک یہ بھی زمانہ ہے
اک وہ بھی زمانہ تھا
کیوں ہم سے خفا ہو تم
کیوں ہم سے جدا ہو تم
کیا جرم ہوا ہم سے
اتنا تو بتانا تھا
تیری نفرت سے بھری نظریں
میری جان ہی نہ لے بیٹھیں
ٹکڑے بھی اتنے کیے دل کے
کیا خوب نشانہ تھا
(ملیحہ احمد......کراچی)
☆☆

زندہ آتما

شہزادہ چاندزیب عباسی۔کراچی

بلوان اور مہان شکتی شالی پجاری کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا، وہ اپنے آپ میں مست تھا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا ہر کسی کو حقیر کیڑے سے بھی بدتر سمجھتا تھا کہ اچانک اس کے گلے میں پھولوں کا ایک ہار پڑتے ہی……

جنم جنم کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش دماغ کو لرزہ براندام کرتی عجیب کہانی

رات ساڑھے بارہ کے قریب رام اور اکبر دبے قدموں کالی کے قدیم مندر میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ دونوں چور تھے۔ ہیرے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیا چرانا ان کا معمول تھا۔ انہیں کہیں سے بھنک پڑی تھی کہ اتر پردیش کی اس قدیم مندر میں ہیرے جواہرات اور سونا چاندی وافر مقدار میں موجود ہے۔ وہ گزشتہ روز دن میں اس مندر میں ٹورسٹ کے بھیس میں داخل ہوئے تھے۔ اس مندر کا مہا پجاری بھگوان دھرم داس اسّی سالہ ضعیف العمر تھا وہ برہم پجاری تھا۔ دھرم کی سیوا کے لئے اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی پچاس سالہ رگھویر بھی اسی مندر کا پجاری تھا۔ ان کا خاندان سو برسوں سے اس مندر کی سیوا میں مصروف تھا۔

ٹورسٹ کے بھیس میں ان دونوں چوروں کی نظر میں مندر کا تہہ خانہ آ گیا۔ بھگوان داس نے ان کے استفسار پر اس تہہ خانے کے بارے میں بتانے سے سختی سے انکار کردیا۔ وہ اس وقت مندر سے رخصت تو ہو گئے لیکن دوسرے روز رات کو دوبارہ آنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ مندر کے ہال سے ہوتے ہوئے بائیں جانب کالی کے قد آور مجسمے کے قریب پہنچے۔ رام نے کالی کے چرنوں میں نصب کوئی خفیہ بٹن دبایا تو سرر کی آواز کے ساتھ فرش میں ایک دروازہ کھل گیا نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر ہال نما کمرے میں جا پہنچے۔ ان کے اندر جاتے ہی تہہ خانے کا خفیہ راستہ خودکار طریقے سے بند ہو گیا۔

تہہ خانے میں چاروں طرف ہندوانہ دھرم کے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں موجود تھیں۔ ہال نما کمرے کے عین وسط میں کالی کا دیوہیکل مجسمہ تھا جس کے قدموں میں ایک سنہری تابوت موجود تھا۔ شاید یہ تابوت طلائی تابوت تھا۔ رات کی تاریکی کے باوجود وہاں عجیب قسم کی روشنی تھی۔ چاروں اطراف دیواروں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی پیٹیاں تھیں۔ وہ جیسے جیسے پیٹیاں کھولتے چلے گئے، ان کی آنکھیں لالچ سے چمکنے لگیں، ہیرے، جواہرات، سونا جو بھی ہاتھ میں آیا اپنے بیگوں میں ڈالتے چلے گئے لیکن یہ خزانہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسے اٹھانا ان دونوں کے بس سے باہر تھا۔ وہ اپنے بیگ بھر کر مڑے ہی تھے کہ رام ٹھٹک کر رک گیا، اس کی حریص نظریں طلائی تابوت پر جمی ہوئی تھیں۔

"رک کیوں گئے؟ یہاں سے جلدی نکلو، یہ نہ ہو کہ پجاریوں میں سے کوئی جاگ کر ادھر آ جائے؟" اکبر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں ہوتا، میں ہندو ہوں یہ میرے دھرم کے دیوی دیوتا ہیں۔ مجھے کچھ نہیں کہیں گے، کالی ماتا کے قریب قیمتی طلائی تابوت ہے اسے کھول کر دیکھتے ہیں، اس میں

ضرور کوئی بہت ہی قیمتی چیز ہوگی۔" رام حریص لہجے میں بولا اور تابوت کی طرف بڑھا۔

دونوں نے مل کر تابوت کا بھاری بھرکم ڈھکن اٹھایا تو ششدر رہ گئے، ڈر اور خوف سے ان کے مساموں سے پسینہ بہنے لگا۔ تابوت میں ایک دراز قد دیوہیکل سادھو کی لاش پڑی تھی۔ اس کا سر گردن کے اوپر سے کٹا ہوا تھا اور لاش کے سینے پر موجود تھا۔ سب سے خوفناک بات لاش کے سینے پر موجود سر کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔ وہ سرخ آنکھیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

اکبر سخت دہشت زدہ ہوچکا تھا۔ جبکہ رام کی نظریں لاش کے قریب رکھے ایک چھوٹے سے طلائی ڈبے پر تھیں، اس نے تیزی سے وہ طلائی ڈبا اٹھا کر اپنی قمیض کی سائیڈ کی جیب میں ڈال لیا۔

اچانک ہی تابوت سے ایک لرزہ خیز چیخ کی آواز سنائی دی تو وہ دونوں تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بھاگے اور تابوت کا ڈھکن خود بخود بند ہوگیا۔ تہہ خانہ پراسرار چیخوں سے گونج رہا تھا۔ رام نے جلدی سے خفیہ راستہ کھولا۔ چیخوں کی آوازیں ان کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں، وہ بھاگتے ہوئے تہہ خانے سے باہر نکلے اور ایک طرف دوڑنے لگے۔ مندر کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز سن کر انہوں نے اپنے بھاگنے کا رخ بدلا اور دوسرے راستے سے مندر سے باہر نکل گئے۔

تہہ خانے کی طرف بھاگ کر آنے والے بھگوان داس اور رگھویر تھے۔ وہ تہہ خانے سے چیخوں کی آواز سن کر نیند سے جاگ کر تہہ خانے کی طرف بھاگے تھے۔ "رگھویر مندر کے تہہ خانے کا خفیہ دروازہ کھولا گیا ہے۔" بھگوان داس تہہ خانے کے قریب آ کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

وہ دونوں تہہ خانے میں داخل ہوئے تو بھگوان داس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی، اس نے بآواز بلند اشلوک پڑھنا شروع کردیئے، کچھ ہی دیر میں چیخ و پکار کی آوازیں تھم گئیں۔ ان دونوں نے لرزتے ہاتھوں سے تابوت کا ڈھکن کھولا۔ "ہائے رام مہاراج کا لاکٹ اور انگوٹھی بھی غائب ہے۔" بھگوان داس خوفزدہ لہجے میں بولا۔ اور تابوت کا ڈھکن بند کردیا۔

"یہ تابوت میں کون ہے؟" رگھویر نے پوچھا اس نے زندگی میں پہلی بار اس تہہ خانے میں قدم رکھا تھا۔ تہہ خانے میں سوائے بھگوان داس کے کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔

"یہ مہاراج کیشوری لال ہیں۔ انہوں نے کالی کے قدموں میں خود اپنی بلی دی تھی، ہمارا خاندان تقریباً سو سال سے اس مندر کی سیوا کررہا ہے، آج نہ جانے کس اپرادھی نے یہ حرکت کی ہے۔ وہ بھاگ کر جہاں بھی گیا ہے۔ اسے اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔ یہ مہان شکتی اس سے پہلے چھ جنم لے چکے ہیں۔ آنے والے کسی بھی سے مہاراج کشوری لال زندہ ہوجائیں گے۔" بھگوان داس نے کہا اور رگھویر حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

ادھر دونوں چور مندر سے چوری کرکے دلی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ چند روز بعد انہوں نے ایک جیولر جگن ناتھ جو چوری کے زیورات خریدتا تھا۔ اس کے ہاتھوں نصف قیمت پر فروخت کردیئے۔ لاکٹ اور انگوٹھی البتہ اب تک رام کے پاس ہی موجود تھی۔ انہیں جواہرات فروخت کرنے سے لاکھوں روپے ملے تھے۔ اس روز وہ اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے کہ چیخوں کی آواز سن کر اکبر کی آنکھ کھل گئی، اس نے رام کے بیڈ کی طرف دیکھا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، چیختے چلاتے رام کا جسم ساکت ہوچکا تھا۔

دراز قد دیوہیکل سادھو جس کے دھڑ پر سر موجود نہیں تھا۔ رام کے بیڈ کے قریب کھڑا تھا بلاشبہ یہ وہی سادھو تھا۔ جس کی لاش انہوں نے مندر کے تابوت میں دیکھی تھی۔ اکبر ڈر اور خوف سے اپنی جگہ دبکا رہا۔

وہ سر کٹا سادھو چند لمحے رام کے بیڈ کے قریب کھڑا رہا پھر ایک طرف چلتا ہوا دیوار میں غائب ہوگیا۔

اکبر کافی دیر خوف سے اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہورہی تھی کہ بیڈ سے اترے لیکن آخر کب تک، بالآخر لرزتی کانپتی ٹانگوں سے رام کے بیڈ کے قریب پہنچا۔ رام کی بے نور آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں اور شہ رگ کٹی ہوئی تھی۔ بیڈ شیٹ اس کے خون سے لت پت ہورہی تھی۔ اکبر کو مندر سے چرائی گئی انگوٹھی اور لاکٹ کی تلاش تھی۔ یہ دونوں چیزیں اسے طلائی ڈبے سمیت تکیے کے نیچے سے ملیں۔ اس نے انہیں اپنی جیب میں منتقل کیا۔

رام کے بریف کیس سے رقم نکال کر اپنے اٹیچی کیس میں منتقل کی اسے اس بات پر حیرت تھی کہ رام کی اس قدر تیز چیخ و پکار کے باوجود ہوٹل انتظامیہ کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں ایسا شاید اس لئے تھا کہ یہ ماورائی قوت کا کام تھا۔

وہ اور رام دونوں کالی کے قدیم مندر سے نوادرات چوری کرنے کے جرم میں ملوث تھے رام کا خاتمہ ہوچکا تھا، گویا اب اس کی باری تھی۔ اس کے علاوہ صبح ہوتے ہی اس کمرے سے رام کی خونچکاں لاش برآمد ہوتے ہی اس سے باز پرس کی جاتی اور وہ قانون کے شکنجے میں آجاتا۔ اب اس کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ وہ کسی بھی ملک میں آرام و آسائش سے زندگی بسر کرسکتا تھا۔ اس نے سوچا اب یہاں سے فرار ضروری ہے بلکہ اسے یہ ملک ہی چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ رام کی موت کے بعد یہ پراسرار ماورائی قوت اس کی جان لے لے۔" وہ اپنا سامان سمیٹ کر خاموشی سے ہوٹل سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

اس کا نام نوید اختر تھا۔ گھر والے اور یار دوست پیار سے نومی کہتے تھے۔ اس کی رہائش لاہور کے ایک پسماندہ علاقے میں تھی۔ اس کی زندگی کی کہانی عجیب تھی۔ اس کے آباؤ اجداد کا تعلق انڈیا سے تھا۔ اس کے پردادا رام چند کی کوئی اولاد نہ تھی۔ سینکڑوں چڑھاوے چڑھائے۔ مگر کوئی بھی امید کی کرن نہ نظر آئی۔ شادی کو بیس برس گزر چکے تھے۔ ٹھاکر رام چند اب بڑھاپے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس روز وہ اپنی زمینوں میں گھوم رہا تھا کہ ایک مجذوب نے اس کا راستہ روک دیا۔ "کیا بات ہے باباجی؟" اس نے عقیدت و احترام سے پوچھا۔

"رام چند تیری مراد پوری ہونے کا وقت آگیا ہے۔" مجذوب نے کہا اور اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا، اب مجذوب کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک سیب نظر آرہا تھا۔ "یہ آدھا سیب تم کھانا اور آدھا اپنی بیوی کو کھلانا، تمہارے ہاں اولاد نرینہ ہوگی۔" رام چند نے مجذوب سے سیب لیا ہی تھا کہ وہ چشم زدن سے اپنی جگہ سے غائب ہوگیا۔ وہ ششدر رہ گیا۔

مجذوب کا کہنا سچ ثابت ہوا، حویلی میں عرصے بعد چراغاں کیا گیا اس کی پتنی حاملہ ہوچکی تھی۔ وہ آنے والے ننھے مہمان کا انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ وقت آہی گیا۔ اس کے گھر ایک خوب صورت بچے نے جنم لیا۔ نومولود بچے کو دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی وہاں حیرت بھی تھی، بچے کی پیدائشی ختنہ ہوئی ہوئی تھی، بچے کا نام وکرم رکھا گیا وہ ایک ذہین بچہ تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ پرورش پاتے ہی اس کی ذہانت کے جواہر سب پر کھلنے لگے، وہ مختلف قسم کے سوالات کرکے رام چند کو زچ کردیتا۔ اس کے سوالات اس قسم کے ہوتے۔ "سورج مشرق سے کیوں نکلتا ہے اور مغرب میں کیوں غروب ہوتا ہے؟ بارش کیوں ہوتی ہے؟ یہ بت جنہیں ہم بھگوان کہتے ہیں۔ یہ نہ ہی ہل جل سکتے ہیں نہ ہی کسی کو کچھ دے سکتے ہیں، ہم ان کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟"

وہاں کے لوگ اس کی اس طرح کی باتیں سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے اور کہتے۔ "وکرم کی وجہ سے اس گاؤں پر ضرور کوئی آفت آئے گی۔"

ان دنوں اس کی عمر دس سال تھی جب اس کی ماتا کا دیہانت ہوگیا۔ رام چند نے دوسری شادی نہ کی۔ وکرم نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول سے حاصل کی۔ پھر رام چند نے اسے مزید تعلیم کے لئے شہر بھیج دیا۔ ان دنوں اس کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ وہ شہر کے بہترین کالج میں زیر تعلیم تھا۔

اس گاؤں پر قہر ٹوٹ گیا۔ شدید قسم کے زلزلے کے جھٹکوں نے اس گاؤں کو تباہ و برباد کرڈالا۔ اس سانحے کا علم ہوتے ہی وہ گاؤں پہنچا۔ حویلی اور گاؤں کے بہت سے گھروں کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ رام چند سمیت حویلی میں کوئی بھی ذی نفس زندہ نہ بچا تھا۔ سیکڑوں افراد پر مشتمل اس گاؤں میں زندہ بچنے والے خوش نصیب بہت کم تھے۔ جو وکرم کو اس مصیبت کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ

"یہ زلزلہ وکرم کی باتوں کی وجہ سے آیا ہے۔"

وہ دل شکستہ ہوگیا۔ گاؤں والے بپھرے ہوئے تھے اور اسے جان سے مارنے کے درپے تھے وہ بمشکل وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔ رام چند کی دولت اب اس کی ملکیت تھی۔ زمین وجائیداد فروخت کرڈالی۔ وہ سیلانی بن گیا۔

نگر نگر ملک ملک گھومتا رہا۔ اسے حق کی تلاش تھی وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کائنات کا اصل تخلیق کار کون ہے؟ وہ کون ہے جو ہر قسم کی مخلوق کو رزق دیتا ہے؟

وہ پاکستان کے ایک سرسبز و شاداب گاؤں میں جا پہنچا۔ وہاں ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے اس کے سوالات کے تسلی بخش جواب دیئے۔ اس نے اسلامی کتب کا مطالعہ کیا۔ قرآن پاک ترجمے کے ساتھ سنا۔ اسلام کی سچائی اس پر روشن ہوچکی تھی۔ وہ مسلمان ہوگیا۔

اس کا نام محمد لقمان رکھا گیا وہیں گاؤں کی ایک عائشہ نامی لڑکی سے شادی کی، جس سے اس کا بیٹا خوشی محمد پیدا ہوا، بیٹے کے جوان ہوتے ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ خوشی محمد کا بھی ایک ہی بیٹا تھا۔ کلیم اختر جس نے والدین کے فوت ہوتے ہی لاہور کا رخ کیا۔ کلیم اختر اور اس کی بیوی کو اللہ نے سعادت مند اولاد سے نوازا۔ ان کے دو بیٹے تھے نوید اختر اور چھوٹا وسیم اختر ان دونوں سے بڑی بیٹی فرزانہ تھی۔ جس کی شادی ہوچکی تھی۔ نوید فطرتاً شریف اور کم گو تھا۔ وہ خیالات میں گم رہنے والا نوجوان تھا۔ اس کی زندگی کالج اور اپنے دوستوں تک محدود تھی۔

افشین اس کے ماموں کی بیٹی تھی، جو اس کے نام منسوب تھی۔ وہ ایک گرلز کالج میں زیر تعلیم تھی۔

نوید پچھلے کچھ عرصے سے ذہنی طور پر اپ سیٹ تھا۔ اسے روزانہ ایک پراسرار خواب دکھائی دیتا۔ وہ خواب میں دیکھتا۔ ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی قدیم زمانے کے ہندوانہ لباس میں کھڑی اس سے کہتی ہے صدیوں سے جاری اس لڑائی کا انت ہونے والا ہے ہمارا ساتواں جنم ہوچکا ہے اب مہاراج کیشوری لال ہمیں ایک ہونے سے نہیں روک سکتے، ہم اپنے اس جنم میں ہمکل ہوجائیں گے۔ پھر وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی۔

وہ اس خواب کی وجہ سے سارا دن پریشان رہتا۔ وہ جس سے بھی اپنا یہ خواب بیان کرتا وہ اس کا مذاق اڑاتا، اور کہتا۔ "ہوسکتا ہے۔ پچھلے جنم میں تم ہندو رہے ہو۔" اور وہ شرمندہ ہوجاتا۔

اب تو اس نے دوسروں کے سامنے اپنا خواب بیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس روز وہ کالج سے جیسے ہی گھر پہنچا تو اسے پتہ چلا افشین اس کے گھر پر آئی ہے اور اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا وہ اسے گھورتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ افشین صوفے پر پریشان بیٹھی تھی۔ "امی کہاں ہیں؟" نوید نے افشین کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں ابھی آئی ہوں وسیم کہہ رہا تھا۔ ان کے سر میں درد ہے اور وہ سو رہی ہیں۔ میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے افشین تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟"

"وہ پچھلے کچھ روز سے ایک لڑکا روزانہ مجھے تنگ کرتا ہے میری سمجھ میں نہیں آرہا کیسے اس مصیبت سے جان چھڑاؤں، اگر گھر پر بتاتی ہوں تو ہوسکتا ہے ابو میرا کالج جانا ہی بند کروادیں۔" وہ پریشان لہجے میں بولی۔

"کون ہے وہ لڑکا؟" نوید نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"میں تو اسے نہیں جانتی تھی پر میری کلاس فیلو شہلا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کسی سیٹھ ساجد کا بیٹا کاشان ہے۔ وہ اکثر وائٹ کار میں آتا ہے۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تم فکر مت کرو کل میں چھٹی کے وقت تمہارے کالج آؤں گا۔" دوسرے روز وہ چھٹی کے وقت افشین کے کالج کے باہر موجود تھا۔ ابھی چھٹی ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر کالج کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ ادھر چھٹی ہوئی ادھر وائٹ ہنڈا کار کالج کے گیٹ کے قریب آکر رکی۔ کالج کے گیٹ سے لڑکیاں باہر نکل رہی تھیں۔ پھر اسے سہمی سہمی سی افشین کالج گیٹ سے نکلتی دکھائی دی۔ کار سے نکلنے والے باڈی بلڈر ٹائپ

نوجوان کو دیکھ کر افشین کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ "جانو کہاں بسوں میں دھکے کھاتی پھرو گی۔ میری شاندار گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" کاشان لوفرانہ انداز میں بولا اور غصے میں کھولتا ہوا نوید تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا گریبان پکڑلیا۔ "آئندہ اگر تم نے ایسی کوئی گھٹیا حرکت کی تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔"

"اوئے یہ تیری بہن ہے میں تو اسے......"

کاشان نے افشین کے بارے میں فحش الفاظ استعمال کیے۔ تو نوید اس سے گتھم گتھا ہوگیا۔ "تمہاری تو۔" کاشان نے گالی دیتے ہوئے اس کے جبڑے پر گھونسہ مارا۔ اس اثنا میں وہاں موجود چند افراد نے دونوں کو پکڑ کر ایک دوسرے سے الگ کیا۔

"تم مجھے نہیں جانتے میں تمہارا حشر خراب کردوں گا اور تمہاری اس بہن کو کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔" کاشان خود سے لپٹے افراد کی گرفت میں اچھلتے ہوئے بولا۔

"اب اگر تو نے اسے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" نوید نے جوابی دھمکی دی۔

کچھ دیر بعد کاشان اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جاچکا تھا۔ نوید نے افشین کو اپنی موٹر سائیکل پر گھر چھوڑا۔ کچھ روز حالات معمول پر رہے، کاشان نے کالج گیٹ پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے سمجھا اس نے افشین کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ نوید کالج جاتے وقت افشین کو کالج تک چھوڑ جاتا اور واپسی پر اسے ساتھ لے جاتا۔

اس روز بھی وہ افشین کو اس کے کالج سے لے کر اس کے گھر کی طرف جارہا تھا کہ ایک نسبتاً سنسان سڑک پر ایک ہائی لیکس نے تیزی سے اسے اوورٹیک کیا اور ایک دم آگے آکر ان کا راستہ بلاک کردیا۔ نوید نے موٹر سائیکل کو بریک لگا کر خود کو ممکنہ حادثے سے بچایا، ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ ہائی لیکس سے کاشان اور ایک دوسرا نوجوان تیزی سے باہر نکلے ان کے ہاتھوں میں ریوالور موجود تھے۔ کاشان نے آگے بڑھ کر زوردار فرنٹ کک نوید کے سینے پر ماری وہ پشت کے بل سڑک پر گرا، ابھی اٹھا ہی تھا کہ کاشان نے ریوالور کا دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کردیا وہ لہراتا ہوا گرا اور ہوش وخرد سے محروم ہوگیا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے بیڈ پر پڑے پایا، قریب ہی بنچ پر اس کے والد کلیم اختر متفکر بیٹھے تھے ان کے ساتھ اس کے ماموں کفیل احمد بھی موجود تھے۔ "کیا ہوا بیٹا خیریت تو ہے۔ تمہیں چند راہ گیروں نے اسپتال پہنچایا تھا، ان کا کہنا تھا کہ تم سڑک پر بے ہوش پڑے تھے انہوں نے ہی تمہارے موبائل سے میرا نمبر لے کر مجھے کال کی تھی اور افشین کہاں ہے؟" کلیم اختر نے استفسار کیا۔

نوید کے سر میں ہلکا سا درد ہورہا تھا۔ جہاں پسٹل کا دستہ مارا گیا تھا وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نوید نے مختصر الفاظ میں انہیں خود پر بیتی کتھا سنا ڈالی۔

کچھ دیر بعد وہ علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ایس ایچ او کے سامنے موجود تھے۔ سیٹھ ساجد کے بیٹے کاشان کا نام سنتے ہی وہ کرسی سے دو فٹ اوپر اچھلا۔ "اوئے کسی معزز شہری پر بغیر ثبوت الزام لگانا اچھی بات نہیں۔ میں نے روزنامچے میں نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کرلیا ہے۔ آپ لوگ اب جائیں ہم تفتیش کے بعد ایف آئی آر درج کرلیں گے۔"

SHO صاحب کاشان نے میری نظروں کے سامنے افشین کو اغوا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص بھی تھا۔ انہوں نے ریوالور کا دستہ میری کنپٹی پر مار کر مجھے بے ہوش کیا تھا۔ اور پھر میں نے ہائی لیکس کا نمبر بھی آپ کو بتادیا ہے۔ اس سے بڑا اور کیا ثبوت آپ چاہتے ہیں۔" نوید نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اوئے چڑی مار کی اولاد، مجھے قانون مت سکھاؤ اور آرام سے بات کرو، یہ پولیس اسٹیشن ہے تمہارے باپ کا ڈرائنگ روم نہیں۔" SHO بھڑک اٹھا۔

وہ تینوں خاموشی سے اٹھے اور گھر آگئے، رات انہوں نے جاگ کر بسر کی۔ صبح نو بجے کے قریب نوید کے موبائل فون پر کال آئی۔ "آپ لوگ فوراً پولیس اسٹیشن آجائیں۔" دوسری طرف SHO تھا۔

وہ تھانے پہنچ گئے۔ ایس ایچ او انہیں دیکھتے ہی

بولا۔ ”شہر کے ایک پارک سے ایک نوجوان لڑکی کی لاش ملی ہے۔ آپ لوگ شناخت کے لئے میرے ساتھ چلیں۔“

وہ ایس ایچ او کے ساتھ اسپتال کے مردہ خانے پہنچے۔ لاش دیکھتے ہی فرطِ غم سے ان کی حالت غیر ہوگئی۔ لاش افشین کی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت نائن ایم ایم پسٹل کی گولی لگنے سے ہوئی تھی۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھی۔ اسے قتل سے پہلے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بیٹی کی لاش دیکھتے ہی کفیل احمد کو دل کا دورہ پڑا۔ انہیں فوری طور پر ایمرجنسی میں پہنچایا گیا۔ لیکن ڈاکٹر ان کی جان بچانے میں ناکام رہے۔

کفیل احمد کی تدفین کے بعد نوید افشین کے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ لیکن پولیس سیٹھ ساجد کی دولت اور اثر رسوخ کے آگے بے بس تھی۔ مجبوراً نوید نے عدالت کا رخ کیا۔ ہائی کورٹ کے حکم پر پولیس کو مجبوراً کاشان کے خلاف رپورٹ درج کرنا پڑی۔ مدعی مقدمہ کے طور پر نوید کا نام لکھا گیا۔ کاشان کے نام ایف آئی آر درج ہوتے ہی کاشان گھر سے غائب ہوگیا۔

نوید کے سینے میں آتش انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ لیکن وہ سیٹھ ساجد کے بیٹے کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ اس روز وہ معمول کے مطابق موٹر سائیکل پر کالج روانہ ہوا۔ ایک سڑک پر ہنڈا کار نے اس کا راستہ روک دیا، کار کے دروازے کھلے اور کاشان دو مسلح افراد کے ساتھ کار سے اترا۔ ”تم نے میرے خلاف مقدمہ درج کروا کر اچھا نہیں کیا، میں تمہیں برباد کردوں گا۔“ کاشان نے کہا اور ان تینوں نے مل کر اسے مارنا شروع کردیا، اس نے مزاحمت کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والا ایک شریف انسان تھا جبکہ اس کے مدمقابل اسٹریٹ فائٹر اور اس وقت مسلح بھی تھے۔ ان کی لاتیں اور گھونسے اس کے جسم پر پڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ زخموں سے چور سڑک کے کنارے پڑا تھا۔

”نوید تمہارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے، تمہاری محبوبہ کی عزت لٹ گئی اور تم کچھ نہیں کرسکے، ہاں البتہ ایک کام تم اب بھی کرسکتے ہو، یہ پسٹل لو اس میں صرف ایک گولی ہے ہمارے جانے کے بعد خودکشی کرلینا۔“ کاشان نے اس کے قریب پسٹل پھینکا اور ہنستا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل گیا، ان کے جانے کے بعد نوید بمشکل اٹھا۔ اس کے پورے بدن میں درد کی ٹیسیں سی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

کاشان کے کہے ہوئے جملے اس کے ذہن میں گونج رہے تھے، اس نے بے اختیار پسٹل اٹھایا اور اس کی نال کنپٹی سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ”سچ کہا ہے اس کمینے نے ایسی ذلت بھری زندگی سے موت بہتر ہے۔“ وہ زیرلب بڑبڑایا۔ اور ٹریگر پر انگلی رکھ دی، وہ مایوسی کی انتہا پر پہنچ چکا تھا، اسی وقت کسی گاڑی کے بریک چرچرائے، دروازہ کھلنے کی آواز اور کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

اسی وقت اس کی پسٹل والے ہاتھ کی کلائی کسی نے تھامی، ایک جھٹکا سا لگا اور فضا میں فائر کی ہولناک آواز گونجی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کی جان بچانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ نوید نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، وہ پینتیس سالہ درمیانی قد و قامت کا ورزشی جسم کا نوجوان تھا۔ کلین شیو آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور کھلتی ہوئی گندمی رنگت، اس نے ٹراؤزر کے اوپر ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

”دوست زندگی بہت قیمتی ہے۔ اسے یوں سرِ راہ ضائع کرنا اچھی بات نہیں۔ مسئلے مسائل کس کے ساتھ نہیں ہوتے، میرے ساتھ بھی ہیں۔ ہالی ووڈ کی دو بڑی ہیروئنیں ہاتھ پاؤں دھو کر میرے پیچھے پڑی ہیں، دن رات میری خاطر ایک دوسرے سے لڑتی ہیں، میں ان دونوں کے بیچ صلح صفائی کروا کروا کر عاجز آچکا ہوں۔ اس کے باوجود بھی اس قسم کے احمقانہ اقدام کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔“ وہ شرارتی انداز میں بولا۔ ”چھوڑو مجھے یہ دنیا مجھے جینے نہیں دیتی۔ اور تم مرنے نہیں دے رہے۔ آخر میں کیا کروں؟“ نوید سسک پڑا۔

”حوصلہ رکھو میرے دوست ادھر آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے سہارا دے کر جدید ماڈل کی اسپورٹس کار میں بیٹھا چکا تھا۔

”تم زندگی سے اس قدر بیزار کیوں ہو؟“ اس بار اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ نوید اپنی سرگزشت سنانے لگا وہ اس کی داستان سننے کے دوران نوید سے اس کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہا۔

”میرا نام زاہد آفریدی ہے ہمارے درمیان سب سے بڑا رشتہ انسانیت کا ہے، ویسے تم مجھے اپنا دوست بھی سمجھ سکتے ہو۔ سیٹھ ساجد انتہائی دولت مند اور اثر رسوخ کا حامل ہے، بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ جرائم پیشہ ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں کاشان اور فرحان دونوں باپ کے غیر قانونی کاموں میں اس کے شریک ہیں۔“

باتوں کے دوران گاڑی ایک پرائیویٹ اسپتال کے قریب رک چکی تھی۔ اس نے نوید کی مرہم پٹی کروائی اور اس کے منع کرنے کے باوجود فیس بھی ادا کردی۔ ”اب میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ رہا ہوں، اپنا موبائل نمبر مجھے دے دو۔“ زاہد آفریدی نے کہا اور نوید نے اپنا نمبر اسے بتایا۔ زاہد آفریدی نے اس کے نمبر پر مس کال دی۔ ”تم بھی میرا نمبر سیو کرلو۔“ وہ نوید کو اس کے گھر کے قریب اتار کر آگے بڑھ گیا۔

کلیم اختر اس کی ماں جمیلہ اور وسیم اسے زخمی دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ”یہ چوٹیں کیسے لگیں اور تمہاری موٹر سائیکل کہاں ہے؟“ کلیم اختر نے پوچھا۔

”معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔“ نوید نے جھوٹ بولا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ لگتا ہے کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔“ جمیلہ نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

رات کو کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج خلاف توقع وہ جلد ہی سو گیا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا کہ اسے خواب دکھائی دیا۔

اس بار وہ خود بھی ایک گھنے جنگل میں ایک لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ نوید نے زمانہ قدیم کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اور میان میں تلوار بھی موجود تھی۔ اس لڑکی کا ہاتھ نوید کے ہاتھ میں تھا، پھر اس نے دیکھا ایک درخت کی آڑ سے ایک خنجر سنسناتا ہوا آیا اور لڑکی کے سینے میں پیوست ہوگیا۔

”نندنی!“ وہ چیختا ہوا لڑکی کی طرف بڑھا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”راج کمار میرا انتظار کرنا...... اگلے جنم...... میں ملیں گے۔“ نندنی نے کہا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اسی وقت درخت کی آڑ سے ایک دراز قد دیوہیکل سادھو باہر نکلا اس کے گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں موجود تھیں۔ ”کیشوری لال، مہاراج آپ؟“ اس کے لہجے میں دکھ اور بے یقینی دونوں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی نوید کی آنکھ کھل گئی۔ پھر اسے کافی دیر بعد دوبارہ نیند آئی، دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ جلدی سے اٹھا نہا کر تیار ہوا اور ناشتہ کرنے کے بعد کالج جانے کے لئے کمرے سے باہر نکلا اپنی موٹر سائیکل گھر پر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وسیم نے بتایا رات گیارہ بجے کے قریب کوئی اسمارٹ سا شخص موٹر سائیکل لایا تھا۔ اس نے جو حلیہ بتایا تھا وہ زاہد آفریدی کا تھا۔

وہ کالج کے لئے روانہ ہوگیا۔ دوسرے روز شام سات بجے کے قریب اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ زاہد آفریدی کا نمبر تھا۔ ”نوید میں کیفے ٹیریا کے باہر موجود ہوں۔ جلدی آجاؤ مگر موٹر سائیکل پر نہیں آنا کسی ٹیکسی یا رکشہ میں آجاؤ۔“ زاہد آفریدی نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

وہ کیفے ٹیریا کے قریب پہنچا تو اسے زاہد آفریدی دور سے ہی نظر آگیا وہ اپنی اسپورٹس کار میں موجود تھا۔ نوید کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

”کہاں جارہے ہو؟“ نوید نے پوچھا۔

”بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے، تم تو باندھو گے نہیں مجھے ہی باندھنی پڑے گی۔“ زاہد آفریدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان کی گاڑی ایک ویران علاقے میں داخل ہوچکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑی سی عمارت سے کچھ فاصلے پر رکے۔ ”تم گاڑی میں ہی بیٹھے رہو میں آتا ہوں۔“ زاہد آفریدی نے کہا اور گاڑی سے اتر کر ایک طرف بڑھ گیا۔ اس کی واپسی تقریباً نصف گھنٹے بعد ہوئی، وہ آتے ہی ڈرائیونگ

سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”تم کہاں گئے تھے بڑی دیر لگادی؟“
”یہ سیٹھ ساجد کا گودام ہے۔ یہاں کروڑوں کی اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن اور چرس رکھی ہوئی ہے۔ میں ان کی نظر میں آئے بغیر اندر گیا تھا۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا، یہ اس قدر ہولناک دھماکہ تھا کہ عمارت کے اردگرد کی زمین لرز اٹھی اور عمارت سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ زاہد آفریدی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے اس علاقے سے دور نکل گیا۔ ان کے عقب میں مسلسل دھماکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ”یہ سب کیا تھا؟“ نوید نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے برائی کے اس اڈے کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ میں نے عمارت کے اندر جا کر ٹائم بم فٹ کردیا تھا۔ سیٹھ ساجد اب پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچتا پھرے گا۔“ زاہد آفریدی نے کہا اور نوید اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ معصوم صورت شخص اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے سیٹھ ساجد جیسے خطرناک شخص کے منشیات کے گودام کو بم سے اڑادیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زاہد آفریدی بھی کوئی خطرناک شخص تھا۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی ایک پوش علاقے میں ایک بنگلے کے گیٹ پر رکی، زاہد آفریدی نے ہارن بجایا گیٹ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ گیٹ کھولنے والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ”چاچا کریم میرے کمرے میں چائے بھجوادیں۔“ زاہد آفریدی نے کہا۔ اور اسے لئے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔

”نوید تم بیٹھو میں ٹی وی آن کرلوں۔“ زاہد آفریدی ٹی وی کی طرف بڑھا اور ٹی وی آن کیا۔

ایک نجی چینل پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ عمارت بم دھماکے سے تباہ ہوچکی تھی، اس وقت عمارت میں سیٹھ ساجد کے بیٹے فرحان سمیت چار افراد موجود تھے جو اس بم بلاسٹ میں موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے تھے۔ پھر نوید چونک پڑا، نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”فیکٹری کی عقبی دیوار کے قریب سے سپر ماسٹر کے مخصوص نشان والا کارڈ ملا ہے۔ یہ اسی تنظیم کی کارروائی لگتی ہے جو ملک بھر سے جرائم کے اڈے اور جرائم پیشہ افراد کو کیفر کردار تک پہنچارہی ہے۔“

”یہ تو بہت غلط ہوگیا۔ چار افراد کی جان چلی گئی۔“ خبر سن کر نوید کو ذہنی شاک لگا۔

”اس میں کیا غلط ہے، اس عمارت میں منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ فرحان اور اس کے کارندے کوئی معصوم نہیں، یہ ہمارے ہم وطنوں کی رگوں میں منشیات کی صورت میں زہر اتار رہے تھے۔ فرحان کے اوپر ایک طالبہ سے ریپ کا الزام تھا۔ بعد میں اس لڑکی نے خودکشی کرلی جب کہ وہ اپنے اثر رسوخ سے بچ گیا۔“ زاہد آفریدی تلخ لہجے میں بولا ان کی باتوں کے دوران ایک دوسرا ملازم چائے لے کر آگیا تھا۔

”یہ سپر ماسٹر کی کیا کہانی ہے؟“ نوید نے پوچھا۔

”اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔“ زاہد آفریدی نے اسے ٹال دیا۔

”چلو نوید تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ چائے پینے کے بعد زاہد آفریدی نے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی گاڑی میں بنگلے سے باہر نکلے۔ اس نے نوید کو اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر اتارا اور کار کو ریورس کرکے واپسی کے لئے ٹرن لیا۔

اچانک ایک طرف سے ایک پراڈو تیز رفتاری سے آئی اور زاہد آفریدی کی گاڑی کے سامنے رک گئی۔ پراڈو کے دروازے کھلے، دو رائفل بردار نیچے اترے اور کار پر فائرنگ شروع کردی۔ فضا فائر کی ہولناک آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔ نوید نے دیکھا۔ گاڑی کے شیشے چکنا چور ہوگئے، گاڑی گولیوں سے چھلنی ہوچکی تھی۔ پھر ایک گولی کار کے پیٹرول ٹینک میں لگی اور کار میں آگ بھڑک اٹھی۔ نوید پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا دوست اس کا محسن اس کی آنکھوں کے سامنے دردناک موت کا شکار ہوچکا تھا۔

اسی وقت ایک تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”دوسرا وہ رہا۔“ یہ نوید کے بارے میں کہا گیا تھا۔ اسے خطرے کا احساس ہوا تو اپنے گھر کی طرف بھاگا اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی، خوش قسمتی سے دروازہ جلدی کھل گیا۔ دروازے پر کلیم اختر موجود تھے۔ ”کیا ہوا بیٹا خیریت تو ہے باہر سے گولیوں کی آوازیں آرہی تھیں؟“

”ابو جلدی اندر چلیں خطرہ ہے۔“ نوید نے کہا اور تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔

”خطرے کا لفظ سنتے ہی کلیم اختر نے بیرونی دروازہ اندر سے لاک کردیا۔“ ”امی کہاں ہیں؟“ نوید نے پوچھا۔

”وہ اوپر ہیں۔“ کلیم اختر نے جواب دیا، وہ سیڑھیاں چڑھ کر تیزی سے اوپر کمرے میں پہنچے، جمیلہ بیڈ پر پریشان بیٹھی تھی۔ ”باہر فائرنگ کیسی ہورہی ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”یہ شاید سیٹھ ساجد کے کارندے ہیں، وسیم کہاں ہے؟“ نوید نے ماں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ اس نے دیکھا اس کا جواب سن کر اس کے والدین کے چہرے کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ ”وسیم اپنے دوستوں کے ساتھ دن سے کہیں گیا ہوا ہے اور اب تک نہیں لوٹا۔“ کلیم اختر نے کہا اسی وقت گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے مین گیٹ پر گولیاں برسائی گئی ہوں، پھر دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ”لگتا ہے وہ لوگ مین گیٹ کا لاک توڑ کر اندر گھس گئے ہیں۔“ نوید گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا اور دروازے کی طرف بڑھا، اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور کاشان ایک رائفل بردار شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ رائفل بردار کی رائفل کی نال کا رخ ان کی طرف اور انگلیاں ٹریگر پر تھیں۔ ”ہاں تو مسٹر نوید کہا جاتا ہے بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ میں نے کہا تھا ناں کہ آنے والا وقت تمہارے خاندان پر بھاری گزرے گا۔“ کاشان سفاک لہجے میں بولا۔

اسی وقت ایک ادھیڑ عمر صحت مند شخص قیمتی تھری پیس سوٹ میں اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رائفل بردار شخص موجود تھا۔ ”مجھے سیٹھ ساجد کہتے ہیں۔ تم لوگوں نے کیا سمجھا تھا کہ میرا گودام تباہ کرکے بچ جاؤ گے۔ اس حادثے میں میرا جوان بیٹا بھی مارا گیا۔ لیکن تمہارا وہ ساتھی شاید نہیں جانتا تھا کہ عمارت میں ہر طرف کیمرے نصب ہیں۔ تمہارا ساتھی تو جہنم رسید ہوچکا ہے، پر اب میں تم لوگوں کو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔“ سیٹھ ساجد سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔ اور اپنے قریب کھڑے رائفل بردار سے رائفل لے کر اسے نال سے تھاما اور آگے بڑھ کر نوید پر رائفل کے دستے برسانا شروع کردیئے، کمرہ نوید کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

”رک جاؤ۔“ کلیم اختر اسے بچانے کے لئے آگے بڑھے۔

”او بڈھے خاموشی سے ایک طرف کھڑا رہ ورنہ تیری نظروں کے سامنے تیرے بیٹے کے جسم میں اتنے چھید کردوں گا کہ تو گن بھی نہ سکے گا۔“ کاشان اس کے سینے پر فرنٹ کک مارتے ہوئے بولا۔ کچھ دیر بعد نوید لہولہان ایک طرف پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کا پورا بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ ہلنے جلنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ کاشان نے اپنے ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور اس کی نال نوید کی کنپٹی سے لگادی۔

”کیوں بڈھے ٹپکادوں تیرے بیٹے کو۔“ وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ”نہیں خدا کے لئے اسے مت مارو۔“ جمیلہ نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میرے دشمن کے بوڑھے ماں باپ ہم یہاں جان لینے آئے ہیں اور کسی نہ کسی کی جان لے کر ہی جائیں گے۔ اور ہمیں جلدی بھی کوئی نہیں ہے اس غلط فہمی کو بھی دل سے نکال دو کہ یہاں کوئی تم لوگوں کو بچانے آئے گا۔ جب تک ہم اس علاقے میں موجود ہیں۔ پولیس ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گی۔ اب جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔ یہ خنجر لو اور اپنے سینے میں اتار لو، میرا وعدہ ہے کہ تم دونوں میاں بیوی کے مرتے ہی تمہارے بیٹے کو زندہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ کاشان نے کہا اور اپنی پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر جمیلہ کی طرف پھینک دیا۔

جمیلہ چند لمحے ساکت کھڑی خنجر کو دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر کانپتے ہاتھوں سے خنجر اٹھالیا۔ ”نہیں امی آپ اس کمینے کے کہنے پر کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کریں گی۔“ نوید نحیف آواز میں بولا۔ جب کہ کلیم اختر پتھرائی ہوئی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

”جلدی کرو بڑی بی آج ہم بھی تو دیکھیں کہ تمہیں اپنے بیٹے سے کتنا پیار ہے۔“ کاشان نے کہا۔ جمیلہ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا نیچے آیا اور خنجر جمیلہ کے سینے میں دستے تک پیوست ہوگیا۔ جمیلہ چیختی ہوئی فرش پر گرگئی، نوید چیختے چلاتے ہوئے ان لوگوں کو دھمکیاں دینے لگا اور اٹھنے کی کوشش کی مگر

اس کا بدن جگہ جگہ سے زخمی تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ گر پڑا۔

کاشان نے پسٹل کی نال کا رخ کلیم اختر کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی ان کے سینے میں عین دل کے مقام میں لگی وہ بھی ایک طرف گر گئے۔

نوید بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ سفاک درندوں نے اس کی نظروں کے سامنے اس کے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

”کاشان مجھے بھی مار ڈال، اگر میں زندہ رہا تو تم لوگ نہیں بچو گے۔“ نوید روتے ہوئے بولا۔

”نہیں میرے بچے اگر تمہیں مارنا ہوتا تو اب تک مار چکے ہوتے، تمہارے لئے یہی سزا کافی ہے، ہم نے تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے ماں باپ کو مار دیا اور تمہارے بھائی کو بھی اسی طرح مار دیں گے۔ اب تم ہر پل مرو گے اور چاہے تو ہمارے خلاف ایک اور ایف آئی آر بھی کٹوا لینا۔“ وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور نوید بے بسی سے رونے لگا، تقریباً آدھے گھنٹے بعد علاقہ پولیس موبائل کے ہوٹرز اور ایمبولینس کے سائرن سے فضا گونج اٹھی۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اسے اسپتال شفٹ کر دیا گیا۔ دوسرا روز اس کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ اس نے شدید زخمی حالت میں والدین کے جنازے میں شرکت کی۔ جب انہیں لحد میں اتارا گیا تو وہ چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال کے بیڈ پر تھا۔

سیٹھ ساجد کے اثر رسوخ کے سامنے قانون بے بس تھا۔ اس کی کہیں سنی نہ گئی۔ اس کا حال دیوانوں جیسا ہو چکا تھا۔ اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کے بعد سے وہ کالج بھی نہیں گیا، اس نے سیٹھ ساجد کے ڈر سے وسیم اور اپنی شادی شدہ بہن، بہنوئی اور اس کے بچوں کو گاؤں بھجوا دیا۔ وہ سارا دن ادھر ادھر مارا مارا پھرتا اور رات گئے گھر آ کر سو جاتا اسے زندگی سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب سیٹھ ساجد اور کاشان کا خوف بھی نہ تھا کہ وہ اسے مار دیں گے۔

اس روز وہ رات گئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اچانک ایک کار تیز رفتاری سے اس کے قریب سے گزری اس نے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے کوئی چیز پھینکی جو سڑک سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں جا گری۔ اسی وقت ایک دوسری تیز رفتار گاڑی کے بریک چرچرائے۔ نوید نے بمشکل چھلانگ لگا کر خود کو بچایا۔ یہ بڑے ٹائروں والی جیپ تھی۔ جس پر ڈرائیور سمیت پانچ مسلح افراد موجود تھے۔ جن میں سے دو نے مڑ کر نوید کی طرف دیکھا بھی تھا مگر وہ رکے نہیں۔ کار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

نوید فطری تجسس کے تحت ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں کار سوار نے کچھ پھینکا تھا۔ وہ چھوٹا سا ایک اٹیچی کیس تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا اس نے نیچے پڑا ایک پتھر اٹھایا اور تالے پر طبع آزمائی شروع کر دی، کچھ ہی دیر میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ تالا ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے اٹیچی کیس کھولا اندر چند کپڑوں کے جوڑے ایک ڈائری اور ایک عجیب ساخت کی انگوٹھی اور لاکٹ موجود تھا اس نے انگوٹھی انگلی میں پہنی وہ اسے اس طرح فٹ آ گئی جیسے اسی کے لئے بنائی گئی ہو، لاکٹ گلے میں ڈالا، ڈائری اٹھائی اور اٹیچی کیس اور کپڑے وہیں چھوڑ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک ہوٹل سے کھانا پیک کروایا اور گھر پہنچ گیا۔ بھوک بڑے زور کی لگ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد بیڈ پر لیٹا اور ڈائری کھول لی۔

پہلے صفحہ پر لکھا تھا۔ ”میرا نام اکبر ہے۔ بچپن محرومیوں میں گزرا ابھی میری عمر دس سال تھی کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے عدت گزارتے ہی دوسری شادی کر لی۔ سوتیلا باپ مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔ مجھے بھی اس سے نفرت تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سوتیلے باپ کی مار پیٹ سے تنگ آ کر میں نے گھر چھوڑ دیا۔ میرا بسیرا شہر کی سڑکوں کے فٹ پاتھ اور پارکوں میں ہونے لگا۔ یہ ایک الگ دنیا تھی میرے جیسے لاوارث لڑکے درجنوں کی تعداد میں تھے۔ جیب تراشی، چوری چکاری، اسٹریٹ کرائم ہم سب کا پیشہ تھا۔ ان ہی فٹ پاتھوں پر پل کر میں جوان ہوا۔ پھر میری رام سے ملاقات ہوئی۔

وہ انٹرنیشنل چور تھا۔ پہلے وہ اکیلا کام کرتا تھا۔ اس کی آفر پر میں بھی اس کا ساتھی بن گیا۔ اس نے میرا پاسپورٹ بھی بنوا لیا تھا۔ پھر ایک روز میں اس کے ساتھ انڈیا گیا۔ انڈیا میں ایک ریاست ہے اس ریاست میں

کالی کا ایک بہت ہی پرانا قدیم مندر ہے۔ ہمیں پتہ چلا کہ اس مندر کے تہہ خانے میں اربوں روپے کے قدیم نوادرات اور سونا، ہیرے جواہرات موجود ہیں، ہم چوری چھپے مندر کے تہہ خانے میں داخل ہوئے، اپنے بیگوں میں ڈھیر سارا خزانہ بھر لیا۔

رام کی نظر کالی کے بت کے قریب پڑے ایک طلائی تابوت پر پڑی۔ وہ لالچ میں آ گیا۔ ہم نے تابوت کا ڈھکن کھولا اور اندر ایک سر کٹے سادھو کی لاش موجود تھی۔ اس کا سر دھڑ سے الگ لاش کے سینے پر موجود تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا طلائی بکس رکھا تھا۔ جس میں انگوٹھی اور لاکٹ موجود تھے۔ ان پر سنسکرت زبان میں کچھ تحریر تھا۔ چھوٹا سا طلائی بکس اٹھاتے ہی مندر میں عجیب قسم کی چیخ و پکار شروع ہو گئی تھی۔ ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔ چوری کیا گیا سونا اور ہیرے جواہرات آدھی قیمت پر چور بازار میں فروخت کر دیئے۔ اسی روز نصف شب کے قریب ہوٹل کے کمرے میں وہی سر کٹا سادھو نمودار ہوا۔ اس نے رام کو بے دردی سے قتل کر دیا اور غائب ہو گیا، میں رقم انگوٹھی اور لاکٹ لے کر وہاں سے بھاگ نکلا اور بارڈر پار کر کے دوبارہ پاکستان پہنچ گیا۔ لیکن موت میرے تعاقب میں تھی۔ وہی سر کٹا سادھو راتوں کو اکثر میرے خوابوں میں آتا اور کہتا۔ ”کشوری لال کی امانت واپس کر دے۔“

میں نے اسے عام خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی پانچ افراد پر مشتمل ہندو پجاریوں کا گروہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں ان سے جان بچانے کے لئے جہاں بھی جا کر چھپتا وہ وہیں پہنچ جاتے، نہ جانے کیسے انہیں میری بھنک پڑ جاتی تھی۔“ آگے کے صفحات خالی تھے۔

نوید سوچ میں پڑ گیا اس کے خواب میں جو نندنی نامی لڑکی آئی تھی، اسے بھی کشوری لال نامی پجاری قتل کرتا تھا۔ وہ خود بھی اس خواب میں موجود تھا۔ پھر لاکٹ اور انگوٹھی کا ملنا اکبر کی کہانی میں کشوری لال کے بارے میں وہ جتنا بھی سوچتا اتنا ہی الجھ جاتا۔ اور پھر سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

رات کے پچھلے پہر اس کے خواب میں کشوری لال نامی وہی پجاری آیا جو کہہ رہا تھا۔ ”یہ انگوٹھی اور لاکٹ اتار کر میرے حوالے کر دے۔“ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔

اچانک اسے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں، وہ تیزی سے چلتا ہوا بالکونی میں پہنچا اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا، برآمدے میں کچھ سائے متحرک تھے، وہ جلدی سے بالکونی سے کمرے میں داخل ہوا۔ پانی کے پائپ کے ذریعے گھر کی عقبی سمت پہنچا اور دیوار پھلانگ کر ایک طرف بھاگنے لگا۔ گویا اکبر کی ڈائری کے مطابق پراسرار پجاریوں کا گروپ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے رام کی طرح اکبر کا خاتمہ بھی کر دیا ہو۔ اب اسے اپنی جان بچانے کے لئے ان پجاریوں کی پہنچ سے دور جانا تھا۔ وہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا مین روڈ پر پہنچا۔ سامنے سے آتی ٹیکسی کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی اس کے قریب آ کر رکی۔ ”ریلوے اسٹیشن چلو۔“ وہ پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اور ٹیکسی چل پڑی۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اس نے دور دراز کا ٹکٹ لیا۔ اس کے ذہن میں کوئی منزل نہ تھی۔ صرف یہ سوچ تھی کہ اسے ان خطرناک پجاریوں کی پہنچ سے دور جانا ہے۔

یہ سیٹھ ساجد سے بھی خطرناک لوگ تھے۔

ٹرین کے آنے میں ایک گھنٹہ تھا۔ وہ ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ ٹرین کے آتے ہی پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔ اس نے بک اسٹال سے وقت گزاری کے لئے ایک مشہور ہارر ڈائجسٹ خریدا اور ٹرین پر سوار ہو گیا۔ وہ دوسرے روز شام سات بجے کے قریب اس دور دراز کے پلیٹ فارم پر اترا یہ ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا، اس نے ٹی اسٹال سے چائے پی اور پلیٹ فارم سے باہر نکلا۔ باہر تانگہ والے یعقوب آباد کی آوازیں لگا رہے تھے۔ وہ ایک تانگہ میں سوار ہو گیا۔ چار مسافر پہلے ہی سے موجود تھے، اس کے بیٹھتے ہی تانگہ چل پڑا۔ ایک گھنٹہ بعد تانگہ ایک دیہات میں جا کر رکا۔ مسافر نیچے اتر کر ڈرائیور کو کرایہ دینے لگے۔ وہ بھی کرایہ دے کر ایک طرف چل پڑا۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہی علاقہ تھا۔ گاؤں دیہاتوں میں عموماً جلد ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ وہاں

بھی اسے راستے میں اکا دکا افراد ملے۔ ایک طرف ایک پرچون فروش کی دکان تھی جس میں ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ وہ دکان پر پہنچ گیا۔ ”باباجی یہاں قریب کوئی ہوٹل وغیرہ ہے، مجھے رہائش کے لئے کمرہ چاہئے۔“ نوید نے جھجکتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

”بیٹا یہ انڈین بارڈر سے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، گاؤں دیہاتوں میں ہوٹل نہیں ہوتے۔ یہاں اکثر مسافر گاؤں والوں کے گھروں پر مہمان بن کر قیام کرتے ہیں۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

بوڑھا حلیہ اور بات چیت سے ہندو معلوم ہو رہا تھا۔ واپس مڑتے وقت اس کی نظر دکان کے بورڈ پر پڑی اور اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی، بورڈ پر لکھا تھا رام چند کریانہ اسٹور وہ پیدل ہی آگے بڑھ گیا۔ وہ کافی دیر تک پیدل چلتا رہا، اب آبادی کا اختتام ہونے والا تھا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے دور سے شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں، اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہوگئے، وہ چار پانچ پجاری تھے۔ جو ہاتھوں میں رائفلیں لئے دوڑتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ نوید نے خود بھی ایک طرف بھاگنا شروع کردیا۔ وہ کافی دیر تک بھاگتا رہا۔ یہاں ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ بھاگتے ہوئے اسے ایک طرف کھنڈرات دکھائی دیئے۔ وہ کھنڈرات میں داخل ہوگیا۔ اور ایک طرف چھپ گیا۔ اب دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، شاید پجاری اس کے پیچھے یہاں تک آپہنچے تھے، پھر کھنڈرات کی طرف آتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ کسی نے اندر جھانکا۔ ”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ کسی نے کہا، کچھ دیر بعد خاموشی چھاگئی۔

وہ کافی دیر تک وہاں دبکا رہا۔ اچانک بادل گرجنے لگے تو وہ باہر نکلا۔ پجاری شاید وہاں سے جاچکے تھے۔

موسلا دھار بارش اچانک ہی برسنے لگی وہ کھنڈرات سے نکلا اور ایک طرف بھاگنے لگا۔ کافی دیر بھاگنے کے بعد وہ رکا اور ستانے کے لئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ بارش اب تک برس رہی تھی۔ بارش کے پانی میں بھیگنے سے اب اسے سردی بھی لگنے لگی تھی۔ اسی وقت اس کی نظر ایک طرف پڑی اسے ایسے لگا۔ جیسے کوئی مورچہ سا بنا ہوا ہے۔ اسی وقت بجلی چمکی اور وہ ششدر رہ گیا۔ بجلی کی چمک میں اسے صاف نظر آگیا تھا کہ وہ کوئی فوجی چوکی تھی۔ جس پر انڈین ترنگا لہرا رہا تھا۔ فوجی شاید بارش کی وجہ سے کہیں دبکے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ غلطی سے بارڈر پار کرکے انڈین حدود میں داخل ہوچکا تھا۔ اگر سیکورٹی فورسز کی نظر اس پر پڑجاتی تو وہ اسے بے دریغ گولی ماردیتے۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ مڑا اور ایک طرف بھاگنے لگا۔ کچھ دور ایک عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا عمارت کے دروازے پر پہنچا تب اسے معلوم ہوا یہ کوئی مندر ہے۔

اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، وہ جلدی سے مندر میں گھس گیا۔ مندر میں اس وقت کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ وہ بھاگتا ہوا مندر کے ہال نما کمرے میں پہنچا۔ یہاں ہر طرف ہندوانہ مذہب کی دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں نصب تھیں، ایک طرف کالی کا قد آور بت بھی تھا، اب قدموں کی آوازیں مندر سے آرہی تھیں، گویا اس کی جان کے دشمن مندر میں داخل ہوچکے تھے۔ نوید گھبرا کر ایک طرف راہداری میں بھاگا سامنے ہی محرابی دروازہ تھا۔ وہ محرابی دروازے سے جیسے ہی اندر داخل ہوا اسے ایسے لگا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو، وہ بلندی سے پستی میں گرتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ ہوش وحواس سے عاری ہوگیا۔ اسے نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سر کسی کی نرم ملائم آغوش میں موجود ہو، اس نے آنکھیں کھول دیں اور اردگرد کا جائزہ لینا چاہا مگر ناکام رہا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا ہو۔ ایک عجیب سا سرور اس کے تن بدن میں دوڑ رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ سوچنے لگا وہ کہاں ہے اور کس کی گود میں اس کا سر ہے، یہ گھپ اندھیرا کیسا ہے کہیں وہ مر تو نہیں گیا۔ اس نے کتابوں میں بھی پڑھا تھا اور بہت سوں سے سنا بھی تھا کہ قبر ایک تاریک گڑھا ہوتا ہے۔

”اپنی نندنی کو نہیں پہچانتے۔“ ایک مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی اور کہا گیا۔ وہی خوب صورت آواز وہی لب و لہجہ جو وہ خواب میں سنتا چلا آیا تھا۔ کیا پھر وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اس نے سوچا اور اپنی ہتھیلی کی پشت پر چٹکی بھری۔ تکلیف کا احساس ہوتے ہی معلوم ہوا۔

”یہ کوئی خواب نہیں حقیقت ہے۔“ کہاں کھو گئے راجکمار آکاش۔“ وہی خوب صورت آواز دوبارہ سنائی دی۔

”کون آکاش! میں نوید ہوں اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔“

”میں جانتی ہوں تم میرے جنم جنم کے آکاش ہو۔ پہلے جنم میں تمہارا نام آکاش، دوسرے جنم میں راہول، تیسرے جنم میں سنیل، چوتھے جنم میں پردیپ، پانچویں جنم میں گوپال، چھٹے جنم میں پریم اور اب ساتویں جنم میں نوید ہو، پرنتو گھبراؤ مت، اب اس جنم میں کشوری لال ہم پر قابو نہیں پاسکتا۔ وہ پچھلے چھ جنموں سے ہماری راہ میں رکاوٹ کھڑی کرتا رہا ہے۔ پرنتو پچھلے جنم میں وہ ایک بہت بڑی غلطی کرچکا تھا وہ اس جنم میں اس غلطی کی وجہ سے ضرور پھنسے گا اس بار ہم ضرور اس کا سروناش کردیں گے۔“ نندنی کی خوب صورت آواز سنائی دی۔

”پر میں اس وقت کہاں ہوں؟“ نوید نے پوچھا۔

”ہم نے پچھلے چھ جنموں میں ہندوستان میں جنم لیا تھا۔ یہ ہندوستان کی ریاست ساگران ہے۔“ نندنی نے جواب دیا۔

”یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔“ نوید گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم پچھلے دو دنوں سے میری گود میں سر رکھے بے ہوش پڑے ہو۔ رات کا سمے ہے۔ اس جنگل میں روشنی پر پروانے جمع ہوجاتے ہیں اسی لئے میں نے چراغ بجھا رکھا ہے۔“ نندنی نے جواب دیا۔ اور پھر اس کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد چراغ کی مدھم روشنی میں نندنی کو دیکھا، یہ وہی تھی جو اکثر اس کے خوابوں میں آتی تھی۔ انتہائی حسین وجمیل، بدن جیسے سانچے میں ڈھلا ہو۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”اس طرح غور سے کیا دیکھ رہے ہو، پہلے جنم میں بھی جب تم مجھ سے پہلی بار ملے تھے اسی طرح دیکھ رہے تھے۔“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔

”میں یہاں کیسے پہنچا؟“ نوید نے پوچھا۔

”یہ سب بھگوان کے کام ہیں، تم کشوری لال کے ساتھی پجاریوں سے بچنے کے لئے انڈین علاقے میں داخل ہوگئے اور پھر کالی کے مندر میں ایک سرنگ میں جاگرے، تم بے ہوش ہوچکے تھے۔ کالی کا وہ مندر اس جنگل کے قریب ہی ہے۔ مجھے جیسے ہی پتا چلا تو میں مندر میں جا پہنچی، تم میرے زیر اثر سحر زدہ چلتے ہوئے یہاں آپہنچے اور دوبارہ بے ہوش ہوگئے۔ اس لئے تمہیں کچھ یاد نہیں۔“ نندنی نے کہا۔

”تم ناقابل یقین باتیں کررہی ہو۔ اس سے یہی لگتا ہے کہ تم کوئی روح ہو۔“ نوید خوفزدہ ہوگیا۔

”آتما کا کوئی وجود نہیں ہوتا، تم مجھے چھو کر اپنی تسلی کرسکتے ہو۔“ نندنی بولی اور نوید نے ڈرتے ڈرتے اس کی کلائی تھامی تو اسے حوصلہ ہوا۔ اس کے گداز جسم میں حرارت موجود تھی۔ نوید نے اردگرد کا جائزہ لیا یہ جھونپڑی تھی، زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی، ایک طرف بستر پڑا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر کھانے پینے کے برتن اور مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا۔ جھونپڑی میں پینے کے پانی کا گھڑا بھی رکھا ہوا تھا یہ سب کچھ دیکھ کر نوید کو مزید حوصلہ ملا۔ ”بھلا روحوں کو کھانے پینے کی کیا حاجت ہوتی ہے۔“

”تمہیں اس ویران جنگل میں اکیلے ڈر نہیں لگتا اور تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟“ نوید نے پوچھا۔

”میرے ماتا پتا کا دیہانت ہوچکا ہے۔ میں کالی ماتا کے مندر کی داسی رہ چکی ہوں اس جنم میں دیوی نے مجھے بہت کچھ دان دیا ہے۔ ماتا پتا کے دیہانت کے بعد میں یہاں آبسی۔“ نندنی نے جواب دیا۔

”لیکن یہ کیا چکر ہے تم بار بار مجھے آکاش کیوں کہتی ہو؟ یہ کشوری لال کون ہے یہ جنم جنم کی کیا کہانی ہے ہمارے مذہب میں اس کا کوئی وجود نہیں اور نہ ہی میں ان خرافات کو مانتا ہوں۔“ نوید کا ذہن اب تک الجھا ہوا تھا۔

"پہلے بھوجن کرلو پھر میں تمہیں اپنی اور تمہاری جنموں کی کہانی سناتی ہوں۔" نندنی نے کہا اور اٹھ کر چولہے کے قریب گئی ایک طرف رکھی چند چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چولہے میں ڈالیں اور آگ جلادی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پلیٹ میں کچھ ڈال کر اس کے قریب لائی۔ نوید نے دیکھا وہ کھچڑی تھی۔ "چلو میں تمہیں پہلے کی طرح اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔" نندنی نے کہا اور اس کے منع کرنے کے باوجود وہ اسے اپنی مخروطی انگلیوں سے کھلانے لگی۔

پتہ نہیں یہ اس کے خوب صورت ہاتھوں کا کمال تھا یا کھچڑی اس قدر لذیذ تھی کہ نوید اس کے ہاتھوں سے کھاتا چلا گیا یہاں تک کہ کھچڑی سے بھری پلیٹ خالی ہوگئی، پھر وہ ایک طرف رکھے گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی بھر لائی، چشمے کا پانی نوید کو شربت کی طرح لگا، وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ "یہاں میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔" اس نے نوید کے منع کرنے کے باوجود اپنے زانو پر اس کا سر رکھا اور اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔ نوید سحر زدہ سا اس کا حسین چہرہ دیکھنے لگا۔ اسے اب بھی نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہو۔

"ادھر میری آنکھوں میں دیکھو۔" نندنی نے کہا اور نوید نے اس سے نظریں ملائیں۔ نندنی نے کہانی سنانا شروع کردی۔ اس کی خوب صورت آواز جھونپڑی میں گونجنے لگی۔ وہ اس کی کہانی کے سحر میں کھو گیا۔ سب سے حیرت انگیز بات اسے نندنی کی آنکھوں میں کہانی کے جیتے جاگتے کردار دکھائی دے رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔ نندنی کی اس کہانی میں وہ خود بھی موجود تھا۔

صدیوں پہلے ہندوستان کی اس پراسرار زمین پر ایک برہمن راجہ پرتاب بھوشن کی حکومت تھی۔ راجہ پرتاب کو نچلی ذات کے ہندوؤں سے سخت نفرت تھی۔ اس کے دور حکومت میں اچھوتوں اور دیگر نچلی ذات کے ہندوؤں کو برہمنوں کے مندر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ راج کمار آکاش اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ راجہ کی تو جیسے اس میں جان تھی۔ اس کی رانی بھی دن رات کسی بھی پل آکاش کو اپنی نگاہوں سے دور نہ جانے دیتی۔ پر راج کمار آکاش کو شکار اور سیر و سیاحت کا جنون کی حد تک شوق تھا وہ اکثر اپنے دوست وکرم اور سپاہیوں کے ساتھ شکار کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔ اس روز بھی وہ شکار کے لئے دور دراز کے ایک جنگل کی طرف جا رہے تھے کہ ایک بستی کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک طرف سے سامنے سے چند لڑکیاں آتی دکھائی دیں، انہوں نے مٹی کے گھڑے اٹھا رکھے تھے۔ وہ کنویں سے پانی بھر کر اپنی بستی میں جا رہی تھیں۔

وکرم اور راج کمار آکاش اپنے سپاہیوں سے کافی آگے نکل آئے تھے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک درمیانے قد و قامت کی لڑکی کو دیکھ کر راج کمار آکاش مبہوت رہ گیا۔ وہ تھی بھی اس قدر حسین جیسے کوئی اپسرا یا پرستان کی پری ہو۔ اس کا سانچے میں ڈھلا جسم گول گول چہرہ اور بلوری آنکھیں راج کمار اپنا دل ہار بیٹھا۔ لڑکیاں ان کے قریب سے گزر کر جا رہی تھیں۔ آکاش اور وکرم نے اپنے گھوڑے روک لئے تھے۔ راج کمار آکاش گھوڑے سے اترا اس نے تیر کمان میں لگایا اور نشانہ لے کر تیر کو چھوڑ دیا جو سیدھا اس حسین لڑکی کے گھڑے میں لگا اور پانی سے بھرا گھڑا ٹوٹ کر گر گیا۔

"ہائے رام یہ تم نے کیا کیا، اب میں ماتا جی کو کیا جواب دوں گی۔" لڑکی نے مڑ کر کہا۔ اب وہ اکیلی اس کے سامنے کھڑی تھی سکھیاں آگے نکل چکی تھیں۔

"اپسرا تمہارا تو گھڑا ٹوٹا ہے۔ جو مٹی کا تھا۔ ہم تمہیں ایسا ہی سونے کا بنا ہوا گھڑا بنوا دیں گے پر ہمارے دل کا کیا ہوگا جو تمہیں دیکھتے ہی ہمارے اختیار میں نہیں رہا۔" آکاش کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا اور لڑکی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"نام کیا ہے تمہارا اور کہاں رہتی ہو؟"

"میرا نام نندنی ہے اچھوتوں کی بستی میں رہتی ہوں، میرے پتا کا نام اشوک ہے پر آپ کون ہیں؟" اس نے شرمیلے انداز میں کہا۔

"یہ مہاراج راجہ پرتاب کے بیٹے راج کمار آکاش ہیں۔" وکرم نے آگے بڑھ کر آکاش کا تعارف کروایا۔

"رام رام اگر راجہ کو خبر ہوگئی کہ ایک اچھوت لڑکی نے راج کمار سے بات کی ہے تو ان کی سینا کے سپاہی ہم سب کو جان سے مار دیں گے پتا جی کہتے ہیں راجہ اچھوتوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔" نندنی سہم گئی۔

"نندنی ہم سب کو بھگوان نے اس سنسار میں بھیجا ہے۔ میں ذات پات کو نہیں مانتا اور سچے دل سے تمہیں چاہنے لگا ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کی مرمریں کلائی تھام لی اور چاہت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں ماتا جی پریشان ہوں گی۔" نندنی دھڑکتے دل سے بولی۔ اسے بھی راج کمار اچھا لگا تھا۔

"سنو کل میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ اکیلی آنا، آؤ گی ناں۔" آکاش نے آہستہ سے کہا اور نندنی اثبات میں سر ہلا کر بستی کی طرف چل دی۔

راج کمار کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جاتے جاتے اس کا دل بھی لے گئی ہو وہ اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ "اب چلیں راج کمار کب تک اس راہ کو دیکھتے رہیں گے۔ جانے والی جا چکی ہے۔" وکرم ہنسا۔

آکاش محل لوٹ آیا مگر اس کا دل وہیں اچھوتوں کی بستی میں رہ گیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح محل سے نکلا۔ سپاہیوں اور وکرم کے ساتھ لیکن آدھے راستے میں ان سے الگ ہو کر اکیلا اچھوتوں کی اس بستی کے قریب پہنچ گیا۔ نندنی پہلے ہی سے وہاں بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ وہ گھوڑے سے اترا اور نندنی کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ "راج کمار آپ مجھ سے دور رہا کریں میں اچھوت ہوں۔" وہ کسمسائی۔

"دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا۔" اس نے کہا اور نندنی کے گال پر اپنے ہونٹ رگڑنے لگا۔

"نہیں راج کمار یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" نندنی مخمور لہجے میں بولی، راج کمار کی چھیڑ خانیوں سے اس کے اپنے جذبات بھی منتشر ہونے لگے تھے۔

"گھبراؤ مت ہمارے پیار میں کوئی کھوٹ نہیں تم ہماری رانی بنو گی۔" آکاش نے کہا اور اس سے الگ ہو گیا۔

"آج میں آپ کے لئے اپنے ہاتھوں سے بھوجن تیار کر کے لائی ہوں۔ مگر آپ کسی اچھوت کے ہاتھ کا بنا......" آکاش کی خفگی کے لحاظ سے بات ادھوری چھوڑ گئی۔

"لاؤ مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤ۔" آکاش نے کہا اور نندنی نے قریب پڑا برتن اٹھایا۔ رومال کھولا اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگی، کھانا کھانے کے بعد وہ اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نندنی اس سے رخصت ہوگئی اور وہ راج محل آگیا۔ وہ نندنی کے پیار میں بھول چکا تھا کہ وہ ہندوستان جیسے ملک کا راج کمار اور مستقبل کا ہونے والا راجہ ہے جبکہ نندنی ایک معمولی سی اچھوت لڑکی ہے۔

ایک روز وہ جب نندنی سے ملا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ اداس ہے۔ "کیا بات ہے نندنی تم خلاف معمول خاموش اور اداس کیوں ہو؟"

"راج کمار ہم اچھوت ہیں ہمیں مندر میں بھی جانے کی اجازت نہیں۔" نندنی اداس لہجے میں بولی۔

"بس اتنی سی بات! آؤ آج ہم تمہیں خود مندر لے جائیں گے۔" آکاش نے کہا۔ وہ اسے اپنے آگے گھوڑے پر بیٹھا کر مندر لے گیا۔ برہمنوں کے اس بڑے مندر میں پوجا جاری تھی۔ مہاراج کشوری لال اس مندر کے مہا پجاری تھے۔ ایک اچھوت لڑکی کو مندر میں دیکھ کر ان کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہوگیا۔ اگر راج کمار آکاش کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو نندنی سمیت اسے اسی جگہ جان سے مار دیا جاتا مگر معاملہ دیش کے راج کمار کا تھا، آکاش کو راجہ نے اپنے دربار میں طلب کیا، آکاش دربار میں پہنچا۔ کشوری لال وزیراعظم کے قریب بیٹھا تھا، کشوری لال کا ایک مقام تھا۔ راجہ، وزیراعظم اور دربار کے دیگر ارکان کے علاوہ سیناپتی سے لے کر فوج کے سپاہی تک اس کا احترام کرتے تھے۔

"راج کمار آکاش مہاراج نے تمہاری شکایت کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ تم ایک اچھوت لڑکی کو لے کر مندر گئے اور دھرم کا اپمان کیا۔" راجہ پرتاب نے گونجدار آواز میں فرد جرم سنائی۔

"پتا جی اس سارے سنسار کو بھگوان نے بنایا ہے۔

سارے منش بھی اسی نے پیدا کیے ہیں۔ میں ذات پات کو نہیں مانتا، میں وچن دیتا ہوں کہ دیش کا راجہ بننے کے بعد یہ فرق مٹا دوں گا۔ نندنی میرا عشق ہے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" راج کمار آکاش نے کہا اور دربار میں سکوت چھا گیا۔

کشوری لال کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

"راج کمار آج کے بعد نہ ہی تم اس اچھوت لڑکی سے ملو گے اور نہ ہی اچھوتوں کی بستی میں جاؤ گے۔" مہاراج پرتاب نے حکم سنا دیا۔

آکاش پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔ اس کے محل سے باہر جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ وہ کئی روز سے نندنی سے نہیں ملا تھا اس کا چہرہ مرجھا گیا اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا، چند ہی ہفتوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، پھر ایک روز اسے بہت ہی تیز بخار چڑھا وہ اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ دیش کے ماہر ویدوں نے اس کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، تھک ہار کر ایک بہت بڑے وید نے راجہ پرتاب سے کہا۔

"مہاراج راجکمار کو کوئی روگ ہے۔ وہ بے ہوشی میں بھی نندنی نندنی پکارتے رہتے ہیں۔ اگر آپ ان کی زندگی چاہتے ہیں تو ان کی تمنا پوری کرنا پڑے گی۔"

راجہ تڑپ اٹھا۔ راج کمار آکاش میں اس کی جان تھی رانی بھی راجہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی راجہ کا دل نرم پڑ چکا تھا۔ اس نے نندنی اور آکاش کی شادی کا اعلان کر دیا۔ دیش بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایک نئی تاریخ رقم ہونے جا رہی تھی۔ ایک اچھوت لڑکی دیش کے مستقبل کے راجہ کی زندگی میں شامل ہونے والی تھی۔ مہاراج کشوری لال راجہ کے سامنے بے بس تھا، اچھوتوں کی بستی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اس وقت وہ نندنی کے ساتھ جنگل میں موجود تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے کہ اچانک ایک خنجر سنسناتا ہوا آیا اور نندنی کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ چیختی ہوئی گری۔

"نندنی۔" آکاش چیخا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"راج کمار میرا انتظار...... کرنا...... ہم اگلے جنم...... میں ضرور...... ملیں...... گے۔" نندنی نے کہا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اسی وقت ایک درخت کی آڑ سے کشوری لال نکلا۔

"کشوری لال مہاراج آپ۔" راج کمار آکاش کے لہجے میں دکھ اور بے یقینی تھی وہ لہرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ مختلف درختوں کی آڑ سے نصف درجن کے قریب پجاری نکل آئے تھے ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں تلواریں اور بعض کے ہاتھوں میں بھالے تھے۔ "راج کمار کو بحفاظت راج محل میں چھوڑ آؤ۔" کشوری لال نے حکم دیا اور راج کمار کو محل پہنچا دیا گیا۔

آکاش کے ہوش میں آتے ہی دیوانوں جیسی حالت ہو چکی تھی۔ صورتحال کا پتہ چلتے ہی راجہ پرتاب نے کشوری لال کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ لیکن کشوری لال کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔ وہ دیش سے غائب ہو چکا تھا۔

پھر آکاش نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ نندنی کی شاندار قسم کی سمادھی بنوائی۔ راجہ پرتاب کے دیہانت کے بعد آکاش راجہ بنا، وہ اپنے خاندان کا آخری راجہ ثابت ہوا کیوں کہ اس نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔

کئی صدیاں گزر گئیں وقت رکتا نہیں۔ چلتا ہی رہتا ہے۔

صدی بعد اس دیش پر راجہ بھگوان داس کی حکومت تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے بڑا بیٹا ونود اور چھوٹا بیٹا راہول، ونود بڑا بیٹا ہونے کے ناطے ولی عہد تھا۔ اسے حکومتی امور سے بھی دلچسپی تھی۔ جبکہ راج کمار راہول سیلانی فطرت انسان تھا۔ وہ اکثر اپنے دوست اکشے کے ساتھ سیر و سیاحت کی غرض سے نکل کھڑا ہوتا، اسے قصے کہانیاں سننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اکشے اس کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا داستان گو بھی تھا۔ وہ دونوں اکثر دور دراز کے علاقوں میں گھومنے نکل جاتے۔ جہاں راج کمار راہول سکون سے اس سے نت نئی کہانیاں سنتا۔ اور وہ پھر شام کو دیر سے محل پہنچ جاتے۔ اس روز راہول اور اکشے دور دراز کے ایک پرفضا مقام پر گئے۔ ایک درخت سے گھوڑے

باندھ کر بیٹھ گئے۔ اس دوران اکشے نے ایک نئی داستان سنانا شروع کر دی۔

اچانک راہول کی نظر ایک سمادھی پر پڑی۔ کچھ فاصلے پر واقع وہ صدیوں پرانی سمادھی عجیب سی لگ رہی تھی۔

"اکشے آؤ ذرا یہ سمادھی کو تو دیکھ لیں اس ویرانے میں یہ سمادھی حیرت انگیز ہے۔" راہول نے کہا۔ اور اس کے قدم بے اختیار سمادھی کی طرف اٹھنے لگے۔ اکشے نے بھی اس کی تقلید کی۔ ویرانے کے سبب سمادھی پر ایک عجیب پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا۔ اچانک چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ راج کمار راہول چونک گیا۔ "یہ کیسی آواز ہے، لگتا ہے ہمارے علاوہ بھی کوئی دوسرا یہاں بھی موجود ہے؟" راہول نے کہا۔ پھر نسوانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ہنسی اس قدر خوب صورت تھی کہ راہول اس کے سحر میں کھو گیا۔ "کون ہے یہاں؟" اس نے پکار کر پوچھا۔ جواب میں اس کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

ماحول پر پھر سکوت چھا چکا تھا۔ چند لمحوں بعد کسی کے قدموں کی چاپ سن کر وہ مڑے اور ششدر رہ گئے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔ راج کمار راہول بے خودی کے عالم میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی لڑکی اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ "تم کون ہو؟" راہول نے پوچھا۔

"کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا۔" لڑکی کے لہجے میں دکھ حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات تھے۔

"مجھے واقعی اس بات کا افسوس ہے کہ میں اس سے پہلے تم سے کیوں نہیں ملا؟" راج کمار راہول نے بے ساختہ کہا۔

"راج کمار آکاش میں تمہاری نندنی ہوں۔" لڑکی بولی۔

"راج کمار تو تم نے ٹھیک کہا مگر میرا نام آکاش نہیں راہول ہے۔"

"میں جانتی ہوں اس جنم میں میرا نام بھی کاجل ہے۔ مگر پچھلے جنم میں تم آکاش تھے اور میں نندنی تھی۔"

وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ "پچھلا جنم! کیسا پچھلا جنم! میں تو کچھ نہیں جانتا۔" اکشے ان دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ "ادھر میری آنکھوں میں دیکھو۔" راہول اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ کاجل کی سحر زدہ آنکھوں میں اسے پچھلے جنم کے مناظر دکھائی دینے لگے۔ کاجل کہانی سنائے جا رہی تھی۔

"مجھے یاد آ گیا۔ سب کچھ یاد آ گیا، وہ ہمارا دشمن کشوری لال کہاں ہے؟" راہول نے پوچھا۔

"وہ اس جنم میں گھنشام کے نام سے موجود ہے۔ برہمنوں کے مندر کا مہا پجاری اور اس جنم میں بھی میں اچھوت ہی ہوں۔" کاجل نے کہا۔ ادھر اکشے حیرت سے ان دونوں میں ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

"تم رہتی کہاں ہو؟" راہول نے پوچھا۔

"اس سمادھی سے کچھ فاصلے پر اچھوتوں کی بستی ہے وہاں رہتی ہوں، یاد کرو نندنی کی یاد میں یہ سمادھی بھی تم ہی نے بنائی تھی۔ پرنتو اس جنم میں کشوری لال ناکام رہے گا۔" کاجل کا لہجہ پریقین تھا۔ ان دونوں میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

"سمے بیت رہا ہے، اب میں چلوں گی۔" کاجل نے کہا۔

"پھر کب ملو گی؟" راج کمار راہول نے پوچھا۔

"کل میں اسی سمادھی میں تمہارا انتظار کروں گی۔" کاجل نے کہا اور وہاں سے چل دی۔ وہ کیا چلی گئی، راج کمار راہول کا چین سکھ سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی۔ "یہ سب کیا تھا راج کمار؟" اکشے نے حیرت سے پوچھا۔

"اکشے تم ایک داستان گو ہو، من گھڑت کہانیاں گھڑ لیتے ہو، جو سننے کو تو دلچسپ ہوتی ہیں، پر ان میں سچائی نہیں ہوتی، لیکن یہ میرے پچھلے جنم کی سچی کہانی ہے جسے میں بھولا ہوا تھا۔" راہول نے کہا اور اسے اپنے پچھلے جنم کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا اور اکشے حیرت سے سننے لگا اس نے اپنی زندگی میں سینکڑوں کہانیاں سنائی تھیں لیکن ایسی کسی کہانی کے بارے میں نہ ہی اس نے سنا تھا اور نہ ہی ایسی کہانی کسی کو سنائی تھی یہ ایک دلچسپ اور ناقابل یقین کہانی تھی۔ وہ ہندو ہونے کی حیثیت سے آواگون کے عقیدے پر

یقین رکھتا تھا لیکن دوبارہ جنم لینے والے کرداروں سے ملاقات کا اس کا پہلا موقع تھا۔ "چلو اکشے اب دیر ہو رہی ہے۔" راج کمار راہول نے کہا اور وہاں سے چل پڑے۔

اس کی کاجل کے ساتھ ملاقاتیں جاری تھیں۔ وہ اکثر راہول سے اسی سادھی کے قریب ہی ملتی۔ ان ہی دنوں راجہ کا دیہانت ہو گیا۔

راج کمار ونو دیش کا راجہ بنا۔ راج نیتی میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ ہاتھ میں آتے ہی انسان کی نظریں بدل جاتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ تخت و تاج کے لئے کئی مواقع پر بھائی نے بھائیوں کا خون کیا ہے۔ اس کی نظروں میں بھی بھائی کا وجود کھٹکنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ نہ ہو کسی سے راہول تخت و تاج کے لئے اس کے خلاف مسائل پیدا کر دے۔"

گھنشام سے راجہ بہت عقیدت رکھتا تھا۔

مہا گرو گھنشام کا اکثر اس کے دربار میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسے راجہ کے دربار میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ وہ اکثر راہول کو عجیب نظروں سے دیکھتا تھا، ایک روز راجا نے اس بارے میں اس سے استفسار کیا۔

"اس دیش اور دھرم کو راج کمار راہول سے خطرہ ہے۔" گھنشام نے اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا خطرہ مہاراج؟" راجا نے حیرت سے پوچھا۔

"سمے آنے دو پھر بتاؤں گا۔" گھنشام کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ادھر کاجل اور راہول کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ اس نے ایک روز کاجل سے کہا۔ "مہاراج گھنشام کا راجہ کے دربار میں اثر رسوخ بڑھ چکا ہے۔ وہ جب بھی مجھے دیکھتے ہیں عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہارے بارے میں جان جائیں ہمیں ایک ہو جانا چاہئے۔ راجہ کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں کبھی بھی ایک نہیں ہونے دے گا اور راجا کے ذریعے گھنشام بھی ہمارے بارے میں جان جائے گا۔ یہاں کے ایک مندر کا پجاری میرا احسان مند ہے کل میں بستی میں اسے لے کر آؤں گا۔ تمہاری بستی میں ہم اگنی کے گرد پھیرے لیں گے۔" راہول نے کہا اور کاجل کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر گئے۔

دوسرے روز وہ ایک ادھیڑ عمر پجاری کے ساتھ اچھوتوں کی بستی میں پہنچ گیا۔ کاجل کے ماتا پتا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بستی میں چراغاں کیا گیا۔ کاجل کو دلہن بنایا گیا بالآخر وہ وقت آ گیا جب کاجل کا پلو اس کے پلو سے باندھا گیا اب انہیں اگنی کے گرد سات پھیرے لینے تھے اگنی کے گرد سات پھیرے لیتے ہی وہ اس جنم میں گھنشام سے جیت جاتے۔

☆......☆......☆

گھنشام راجہ کے دربار میں گھنشام موجود تھا۔ اچانک مضطرب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہوا مہاراج؟" راجہ نے پوچھا۔

"راجہ آپ کے بھائی کی وجہ سے ہمارے دھرم کا اپمان ہونے والا ہے۔ اب سمے آ چکا ہے کہ اپنی فوج کے ساتھ اچھوتوں کی بستی میں پہنچو اگر دیر ہو گئی تو بہت بڑا انت ہو جائے گا اور تم اس دیش کے راجہ بھی نہ رہو گے۔" گھنشام کے الفاظ نے راجہ کو ڈرا دیا۔

راجہ نے اپنی فوج کا کچھ حصہ ساتھ لیا اور اچھوتوں کی بستی کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر آناً فاناً بستی کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ راستے میں راجا کو بھڑکانے کے لئے گھنشام نے سچ اور جھوٹ کے آمیزش سے راہول پر کاجل کے پچھلے جنم کے بارے میں کہانی سنائی۔ وہ سینا پتی اور درجنوں سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

راج کمار راہول اور کاجل نے اگنی کے گرد پھیرے لینے کے لئے ابھی پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ گھنشام کے حکم پر کاجل پر سپاہیوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ درجنوں تیر کاجل کے جسم میں پیوست ہو گئے وہ چیختی ہوئی گری راہول نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، گھنشام اور راجہ ان کے قریب پہنچ گئے۔ کاجل اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ "کشوری لال یاد رکھنا، میں پھر جنم لوں گی اور...... تم...... دیکھ لینا...... جیت ہمارے پیار کی ہوگی۔"

"میں ہر جنم میں تم سے پہلے موجود رہوں گا اور میرا وچن ہے کہ میرے جیتے جی تم کسی بھی جنم میں ایک نہیں ہو سکتے، تمہارے ساتوں جنم میں اس یودھ میں جیت کشوری لال ہی کی ہوگی۔" گھنشام نے ہنستے ہوئے کہا اور کاجل نے دم توڑ دیا۔

راج کمار راہول کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جہاں اس کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ وہ چند ماہ قید تنہائی میں رہا۔ بالآخر اس کا دیہانت ہو گیا۔

سمے بیتتا رہا، کئی صدیوں بعد اس دیش پر راجہ ہردیال کی حکومت تھی اس راجہ کی کئی رانیاں تھیں، مگر اولاد صرف ایک ہی تھی، راج کماری سیتا اکلوتی اولاد ہونے کے باعث راجہ اسے بہت چاہتا تھا۔ یہ راجہ بہت ظالم تھا۔ رعایا اس کے مظالم سے تنگ تھی، خاص کر نچلی ذات کے لوگوں سے اسے اتنی نفرت تھی کہ اگر کوئی غلطی سے بھی اس کے سامنے آ جاتا تو اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا جاتا۔ اچھوت راجہ ہردیال کے ڈر سے اپنی بستی سے باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ اگر انتہائی ضرورت کے تحت انہیں نکلنا بھی پڑتا تو ان پر نظر نہ پڑ جائے۔

راج کماری کو جب کہیں باہر نکلنا ہوتا تو وہ نصف درجن گھوڑوں پر مشتمل شاندار بگھی میں نکلتی، راج کماری سولہویں برس میں پہنچ چکی تھی۔ اسے ان دنوں عجیب قسم کے سپنے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے سپنوں میں ایک خوبرو نوجوان آتا تھا، جو صرف ایک ہی بات کہتا تھا، نندنی ہم تیسرا جنم لے چکے ہیں۔ ہم نے پچھلے دو جنموں میں جو کشٹ اٹھائے ہیں ان کا انت ہونے والا ہے۔ کشوری لال اب ہمیں ایک ہونے سے نہیں روک سکتا۔" وہ بہت پریشان تھی۔ اس نے اپنے اس سپنے کے بارے میں اپنی خاص سہیلی شکنتلا کو بتایا تو وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "ہم کل مندر جائیں گے۔ مہا گرو گردھاری لال بہت بڑے گیانی ہیں۔ تم ان سے اپنا سپنا بیان کرنا۔ وہ ضرور اس کا اپائے بتائیں گے۔

دوسرے روز وہ بگھی میں بیٹھ کر مندر گئیں۔ ان کی رکھشا کے لئے سپاہی بھی ساتھ تھے۔ گردھاری لال دراز قد اور دیو ہیکل تھے ان کے گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں تھیں۔ ان کے چہرے پر سب سے خوفناک چیز سرخ آنکھیں تھیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان سے نظر ملانا ناممکن تھا۔ راج کماری سیتا نے اپنا سپنا بیان کیا۔

گردھاری لال کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔

"یہ بہت برا سپنا ہے۔ اسے بھول جاؤ۔" وہ ناگوار لہجے میں بولے اور وہ دونوں انہیں پرنام کر کے مندر سے باہر نکل گئیں۔

"گویا نندنی اس جنم میں برہمن ہے اور آکاش اچھوت پرنتو میں دھرم کی رکھشا کروں گا۔ میرے ہوتے ہوئے اچھوت اور برہمن ایک نہیں ہو سکتے۔" گردھاری لال نے زیر لب کہا۔

ادھر راج کماری سیتا کی تسلی گردھاری لال کی باتوں سے نہ ہو سکی تھی۔ وہ اب بھی مضطرب تھی، کافی دنوں بعد اس کا دل سیر و تفریح کو چاہا تو وہ شکنتلا اور چند باندیوں کے ساتھ ایک پرفضا مقام پر گئی درجنوں کی تعداد میں سپاہی بھی ان کے ساتھ تھے۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی، ایک طرف خوب صورت نہر بہہ رہی تھی۔ سپاہیوں کو کافی فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا اور وہ سہیلیاں آپس میں اٹکھیلیاں کرنے لگیں۔ کافی دیر بعد وہ سستانے کے لئے نہر کے کنارے بیٹھ گئیں۔ راج کماری سیتا نے نہر میں پاؤں ڈالے ہوئے تھے جبکہ شکنتلا آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ "راج کماری تمہیں پھر تو وہ سپنا دکھائی نہیں دیا۔" شکنتلا نے پوچھا۔

"نہیں مہاراج گردھاری لال سے ملنے کے بعد پھر مجھے وہ سپنا دکھائی نہیں دیا لیکن ایک بات سچ ہے۔ میرے سپنوں میں آنے والا بہت خوب صورت تھا۔" راج کماری سیتا نے جواب دیا۔

اچانک اسے پاؤں کی پشت پر شدید تکلیف کا احساس ہوا یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں خنجر گھسیڑ دیا ہو۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ وہ چیختی جا رہی تھی اور بھگوان بھگوان پکارتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم میں نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ سپاہی ان سے کافی فاصلے پر تھے، اگر قریب بھی ہوتے تو اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

باندیاں بھی راج کماری کی چیخیں سن کر دوڑتی ہوئی قریب آ چکی تھیں۔ شکنتلا اور داسیاں بے بسی سے اسے تڑپتے دیکھ رہی تھیں۔

اچانک مخالف سمت سے ایک نوجوان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور راج کماری کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کی نظریں راج کماری کے چہرے سے ہوتی ہوئیں راج کماری کے پاؤں پر ٹھہر گئیں۔ وہاں سانپ کے دانتوں کے نشان نظر آ رہے تھے راج کماری کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔ وہ اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا۔ راج کماری سیتا کا پاؤں پکڑ کر ہلکا سا کٹ لگا کر اپنے ہونٹ زخم پر رکھے اور ہونٹوں کی پوری قوت سے زہریلا مواد نکال کر ایک طرف پھینکتا چلا گیا۔

کچھ دیر میں ہی راج کماری کی حالت بہتر نظر آنے لگی اس نے تڑپنا موقوف کردیا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی جان بچانے والا اور کوئی نہیں وہی سندر نوجوان تھا۔ جو اکثر اس کے سپنوں میں آتا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ نوجوان مسکراتا ہوا اٹھا۔ نہر کے پانی سے کلی کی اور منہ ہاتھ دھو کر اس کے قریب آ گیا۔ ”تم کون ہو؟ میں نے اکثر تمہیں سپنوں میں دیکھا ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ باندیاں اس کے اشارے پر کچھ فاصلے پر جا کر مودب ہو کر کھڑی ہو گئیں جبکہ شکنتلا ان دونوں کے قریب ہی موجود تھی۔ ”نندنی میں آکاش ہوں اور اس جنم میں میرا نام سنیل ہے۔“ نوجوان نے کہا۔

”میں نندنی نہیں راج کماری سیتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔ پچھلے دو جنموں میں، میں راج کمار اور تم اچھوت لیکن تم اب اس جنم میں راج کماری ہو اور میں اچھوت ہوں۔ پچھلے جنموں میں تم نے مجھے سب کچھ یاد کروایا تھا۔ اس جنم میں تمہیں میں سب کچھ یاد کرواؤں گا۔ ادھر میری آنکھوں میں دیکھو پچھلے جنم میں تم نے بھی مجھے اسی طرح یاد کروایا تھا۔“ سنیل نے کہا اور راج کماری نے اس سے نظریں ملائیں۔ وہ بولتا چلا گیا۔ راج کماری سنتی رہی۔ کہانی کے اختتام تک اسے اپنے پچھلے دونوں جنم یاد آ چکے تھے۔

”اس جنم میں ہمارا دشمن کشوری لال کہاں ہے؟“ راج کماری سیتا نے پوچھا۔ ”وہ اس جنم میں گردھاری لال کے روپ میں موجود ہے۔ تم اپنی غلطی سے اسے ہماری موجودگی سے آگاہ کر چکی ہو۔“ سنیل نے جواب دیا۔ سپاہی ان سے کچھ فاصلے پر آ چکے تھے، مگر راج کماری سے کچھ پوچھنے یا اس کے معاملے میں مداخلت کی، کسی میں ہمت نہ تھی۔

”سنیل اب ہم چلتے ہیں پھر ملیں گے اور اس جنم میں گردھاری لال ضرور ناکام ہوگا۔“ وہ اپنی باندیوں شکنتلا اور سپاہیوں کے ساتھ راج محل لوٹ گئی۔

پچھلے دونوں جنموں کی نندنی اس جنم میں رانی تھی۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں جنہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ راجہ اگرچہ راج کماری کو بہت چاہتا تھا مگر اس سے غافل بھی نہیں تھا۔ راج کماری کے محافظ دستے کے سپاہی راج کماری کی رکھشا کے ساتھ ساتھ اس کے ہر پل کی نقل و حرکت کی خبر راجہ کو دیتے تھے۔

اچھوت نوجوان کا راج کماری کو بچانا اور ان کے درمیان ہونے والی عجیب و غریب گفتگو بھی اس کے علم میں آ چکی تھی۔ وہ محتاط ہو گیا۔ راجہ نے سنیل کو ایک درباری کے ذریعے قیمتی انعامات بھی بھیجے جو راج کماری کو بچانے کا انعام تھا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، ایک معمولی اچھوت نوجوان نے شکریہ کے ساتھ اس کے تحائف واپس لوٹا دیئے۔ اور کہا۔ ”راج کماری کی جان بچانا اس کا فرض تھا۔“

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو راجہ ہردیال اسے اس کے خاندان سمیت قتل کروا دیتا۔ لیکن اس نے راج کماری کی جان بچائی تھی۔

راج کماری سیتا جب سے سنیل سے ملی تھی۔ بے چین تھی۔ کئی دنوں بعد وہ دوبارہ شکنتلا کے ساتھ اسی مقام پر گھومنے چلی گئی۔ جہاں سنیل سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی نظریں سنیل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بالآخر وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اس بار وہ جس راستے سے آ رہا تھا وہاں محافظ دستہ موجود تھا۔ سپاہیوں نے اسے

روکنے کی کوشش کی۔ مگر راج کماری کے اشارے پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہ راج کماری اور شکنتلا سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

”سنیل میں تم سے ملنے کے لئے بے تاب تھی۔ بڑی مشکل سے تم سے ملنے آئی ہوں۔“

”تم فکر مت کرو اب میں خود تم سے ملنے آیا کروں گا۔“

”مگر محل کے گرد بڑا سخت پہرہ ہوتا ہے۔“ راج کماری سیتا نے کہا۔

”اس کی تم فکر مت کر، پیار کی راہ میں لمبی لمبی دیواریں حائل نہیں ہو سکتیں۔ سیکڑوں پہرے دار بھی ہمیں ملنے سے نہیں روک سکتے۔“ سنیل پرجوش انداز میں بولا۔

وہ کافی دیر تک پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ پھر راج کماری محل واپس لوٹ گئی۔ اس ملاقات کی خبر راجہ کو ہو گئی۔

”راج کماری تم آئندہ اس اچھوت نوجوان سے نہیں ملو گی۔ اگر دوبارہ تمہاری شکایت آئی تو ہم اس اچھوت نوجوان کو اس کے خاندان سمیت تباہ و برباد کر دیں گے۔“ راجہ نے اسے سرزنش کی۔

راج کماری محتاط ہو گئی اس کا دور دراز کے علاقوں میں گھومنا پھرنا بند کر دیا گیا۔ اس وقت وہ شاہی محل کے باغ میں اکیلی چہل قدمی کر رہی تھی کہ اچانک پھولوں کی کیاری سے سنیل برآمد ہوا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچے؟“ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور سنیل اس کے دل کی دھڑکنیں سننے لگا۔ وہ پہلی بار راج کماری سیتا کے اس قدر قریب آیا تھا۔ ”سنیل اس سے پہلے کہ کشوری لال ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالے ہمیں ایک ہو جانا چاہئے۔“ راج کماری نے کہا۔

”تم فکر مت کرو جب تک کشوری لال کو ہمارے بارے میں معلوم ہوگا، ہم ایک ہو چکے ہوں گے۔“ سنیل نے سیتا کے چہرے پر بکھری اس کی زلفیں چومتے ہوئے کہا۔

راج کماری کا دل اس کی جسارت پر دھڑک اٹھا مگر اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی، کچھ دیر بعد سنیل اس سے رخصت ہو گیا۔

وہ ایک بہادر اور دلیر نوجوان تھا۔ انجام سے بے پرواہ کسی نہ کسی طرح اس سے ملنے پہنچ جاتا۔

ایک روز گردھاری لال راجہ کے دربار میں پہنچا اور تنہائی میں راجہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ راجہ کو تعجب تو ہوا لیکن وہ گردھاری لال کا دل سے احترام کرتا تھا۔ ”کہیے مہاراج؟“ اس نے گردھاری لال سے پوچھا۔

”راجہ تم بہت بڑی مشکل میں پڑنے والے ہو۔ مجھے اپنے گیان سے معلوم ہوا ہے کہ ایک اچھوت نوجوان راج کماری کو بہکا رہا ہے۔ اگر وہ راکھشش اپنے ارادوں میں مکمل ہو گیا تو بہت بڑا انت ہو جائے گا۔“ گردھاری لال نے کہا۔

یہ سن کر راجہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”اس کا اپائے کیا ہے؟“ راجہ نے پوچھا۔

”آج سے ہم یہیں ٹھہریں گے، پر اس کی خبر راج کماری سمیت کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں اس راکھشش کو رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے۔“ گردھاری لال نے کہا اور راجہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گردھاری لال کو محل کے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ایک دربان اس کے دروازے پر تعینات کر دیا گیا۔ جسے راجہ نے حکم دیا کہ اگر گردھاری لال کچھ کہیں تو راجہ کو اطلاع کر دی جائے۔ تیسرے روز دربان نے نصف شب کے قریب راجہ کے دروازے پر دستک دی۔ وہ محافظ دستے اور گردھاری لال کے ساتھ باغ میں پہنچے تو سنیل اور راج کماری سیتا وہاں موجود پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔ سنیل کا سر راج کماری کی آغوش میں تھا۔

راجہ غصے میں آ گیا۔ سنیل کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ راج کماری کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اسی روز رات کو گردھاری لال کے مشورے پر سنیل اور اس کے خاندان کو راجہ کے سپاہیوں نے قتل کر دیا۔ راج کماری یہ خبر سنتے ہی پاگل سی ہو گئی، اس کا کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ اسے بڑے بڑے ویدوں کو دکھایا گیا مگر وہ سنیل کے غم میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی بالآخر ایک روز اس کا بھی دیہانت ہو گیا۔ یوں تیسرے جنم میں بھی نندنی اور آکاش ایک نہ ہو سکے۔

☆......☆......☆

صدیوں بعد اس دیش پر راجہ پردیپ حکمران تھا۔ اس کی عمر محض بیس سال تھی۔ اس کے پتا راجہ امیت چند ماہ پہلے ہیضے کی بیماری سے دیہانت کر گئے تھے۔ راجہ پردیپ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لئے اس ملک کے تخت و تاج کا مالک تھا۔ وہ ایک خوبرو اور بہادر نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ رحم دل بھی تھا۔ اس کی انصاف پروری کی وجہ سے رعایا اسے چاہنے لگی تھی۔ گویا اس کے دور حکومت میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔

راجہ پردیپ شکار کا شوقین تھا۔ اکثر شکار کی غرض سے دیش کے جنگلات میں چلا جاتا۔ اس روز بھی وہ شکار کی غرض سے اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس جنگل میں آیا ہوا تھا کہ ایک ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے لشکر سے بہت آگے نکل گیا۔ ہرن کافی تیز طرار تھا۔ وہ چوکڑیاں بھرتا ہوا۔ بھاگتا رہا لیکن راجہ کے ہاتھ نہیں آیا۔ راجہ ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا رہا۔ بالآخر ہرن اسے چکمادے کر گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔ تب راجہ پردیپ کو احساس ہوا کہ وہ ہرن کے چکر میں اپنے لشکر سے بچھڑ کر کافی آگے آ چکا ہے، وہ اس بیابان جنگل میں تنہا تھا اور اسے پیاس بھی لگ رہی تھی، وہ گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ اسے چند جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی دکھائی دی۔ وہ ایک جھونپڑی کے قریب پہنچا اور آواز لگائی، اندر سے ایک کمزور سا بوڑھا نکلا۔ پھٹے پرانے کپڑے اس کی غربت کی حالت زار بیان کر رہے تھے۔ ”میں راستہ بھٹک چکا ہوں اور مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“ راجہ نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”بیٹا یہ غریب کی کٹیا ہے۔ تمہارے لائق تو نہیں لیکن جس قدر ہو سکا تمہاری سیوا کروں گا۔“ بوڑھا اس کے قیمتی لباس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ ایک درخت سے گھوڑا باندھ کر بوڑھے کے ہمراہ جھونپڑی میں داخل ہوا اندر پرانی سی چٹائی پر ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ پردیپ بے خود ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ لڑکی اسے دیکھ کر مسکرائی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”بیٹا تم حلیے سے کسی بڑے گھر کے دکھائی دیتے ہو یہ جگہ تمہارے بیٹھنے کے لائق تو نہیں لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔“ بوڑھا بے چارگی سے بولا۔

”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ کا خلوص میرے لئے سب سے قیمتی ہے۔“ پردیپ نے کہا اور کسی جھجک کے بغیر چٹائی پر بیٹھ گیا۔

”پوجا بیٹی مہمان کے لئے پانی لاؤ۔“

”پتا جی کیا یہ ہمارے برتن میں پانی پینا پسند کریں گے۔“ پوجا نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر جھونپڑی میں رکھے گھڑے کی طرف بڑھی۔ پردیپ سوالیہ نظروں سے بوڑھے کو دیکھنے لگا۔ اسے اس خوب صورت لڑکی کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ بوڑھا اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا۔ ”بیٹا میرا نام جگدیش ہے یہ میری بیٹی پوجا ہے پچھلے ورش میری پتنی کا دیہانت ہو گیا تھا اور یہ اچھوتوں کی بستی ہے اور ہم اچھوت ہیں تم شکل و صورت اور حلیے سے برہمن دکھائی دیتے ہو اس لئے پوجا نے پوچھا ہے کہ تم ہمارے برتن میں پانی پینا پسند کرو گے۔“ اس اثنا میں پوجا پانی لا چکی تھی۔

پردیپ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پانی لیا وہ اس قدر پیاسا تھا کہ لگاتار تین گلاس پانی پی گیا۔ ”ہم سب کو بھگوان نے اس سنسار میں بھیجا ہے میں کسی کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھتا۔“ پردیپ نے کہا۔

”تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ تم یہیں بیٹھو میرے پاس چند مرغیاں بھی ہیں، میں تمہارے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ جگدیش اس کے منع کرنے کے باوجود جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

پوجا دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”تم تو پانی دے رہی تھی اگر زہر بھی دیتی تو گنگا جل سمجھتا۔“ پرتاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں میرے راج کمار آکاش ایسا نہیں ہو سکتا۔ جنموں جنموں سے تمہارے وچار میرے لئے کسی دیوتا کی طرح ہیں۔“ پوجا نے کہا۔

”تمہارا اندازہ میرے بارے میں کچھ کچھ درست ہے، کچھ عرصہ پہلے میں راج کمار تھا۔ مگر اب اس دیش کا راجہ ہوں، پرنتو میرا نام آکاش نہیں راجہ پردیپ ہے۔“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

”میں جانتی ہوں اور بہت جلد تم بھی جان جاؤ گے کہ میں نندنی ہوں اور تم آکاش ہو۔ ہمارا ساتھ جنموں جنموں کا ہے۔ اس جنم میں تم پردیپ اور میں پوجا پہلے جنم میں تم آکاش تھے اور میں نندنی، اس طرح حیرت بھری نظروں سے مجھے مت دیکھو، ہم ہر جنم میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہی سچائی جان لیتے ہیں، یہ ہم پر بھگوان کی کرپا ہے، ادھر میری آنکھوں میں دیکھو تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔“ پوجا نے کہا اور پردیپ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ اپنے پچھلے تین جنموں کی کہانی بیان کرنے لگی۔ وہ سننے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں ان جنموں کے کردار دیکھ رہا تھا جن میں وہ خود تھا نندنی تھی۔ پوجا کی کہانی ختم ہوئی تو وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ ”پوجا اب تم فکر مت کرو، اس جنم میں، میں بے اختیار نہیں، اس دیش کا راجہ ہوں، کشوری لال اب ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میں اس سے تینوں جنموں کے بدلے گن گن کر لوں گا۔ میں دھوم دھام سے تمہیں بیاہ کر اس بستی سے لے جاؤں گا۔“ پردیپ نے کہا اور پوجا خوشی سے کھل اٹھی اس دوران جگدیش آ چکا تھا۔ پوجا کھانا پکانے چلی گئی۔

”بابا میرا نام پردیپ ہے اور میں اس دیش کا راجہ ہوں۔ ہرن کا شکار کرتے ہوئے اپنے لشکر سے بچھڑ کر آپ کی بستی میں آ گیا اتنا تو آپ جان ہی چکے ہوں گے کہ میں ذات پات کو نہیں مانتا، مجھے آپ کی بیٹی پسند آ گئی ہے اور میں اسے اپنی رانی بنانا چاہتا ہوں۔“ پردیپ نے اپنا مدعا بیان کیا تو جگدیش اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ جسے دولت مند برہمن سمجھا تھا وہ اس دیش کا راجہ تھا اور سب سے انہونی بات یہ کہ وہ اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

”راجہ صاحب اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو شما چاہتا ہوں، پرنتو اس دیش کے برہمن پنڈت پجاری اور اونچی ذات والے اسے اچھا نہیں سمجھیں گے۔“ وہ سہم گیا۔

”میں اس دیش کا راجہ ہوں کسی کی کیا ہمت ہے جو مجھے ٹوکے، یا آپ پر انگلی اٹھائے۔“ راجہ پردیپ نے کہا اور جگدیش اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

اگر پوجا رانی بن جاتی تو تاریخ میں ایک نئی کہانی رقم ہو جاتی، برہمنوں اور اچھوتوں میں جو فرق صدیوں سے تھا۔ وہ ختم ہو جاتا۔ اس نے حامی بھر لی کھانا کھا کر راجہ کچھ دیر بعد رخصت ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اسے اپنا لشکر راستے میں ہی مل گیا۔ جو خود اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ راجہ نے اپنے محل پہنچتے ہی دوسرے روز منادی کروادی کہ وہ ایک اچھوت لڑکی کو اپنی رانی بنانے والا ہے۔ اس نے باقاعدہ رشتہ طے کرنے کے لئے اپنے وزیراعظم اور درباریوں کو بھیجا۔ رعایا کے لئے خزانے کے منہ کھول دیا گیا۔ بڑے بڑے پجاری اونچی ذات کے لوگ اس کے درباری، وزیراعظم، غرض کہ کسی کو بھی یہ فیصلہ اچھا نہیں لگا، لیکن دیش کے راجہ کے سامنے اس کے فیصلے کی مخالفت کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ دوسرے روز دربار میں پجاریوں کا ایک گروپ آیا۔ مہا پجاری گنیش مہاراج ان کی قیادت کر رہا تھا۔

”راجہ صاحب اچھوت لڑکی کو رانی بنانے کا فیصلہ درست نہیں ہے۔ یہ دھرم کا اپمان ہے۔“ گنیش نے کہا۔

”میں تمہیں پہچان چکا ہوں، کشوری لال، پرنتو تم اس جنم میں بے بس ہو، میں اس دیش کا راجہ ہوں۔ تم اس جنم میں ہار جاؤ گے۔“ راجا پردیپ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”راجہ یہ تیری بھول ہے، میں نے برسوں تپسیا کی ہے، دیوی دیوتاؤں کا آشیرباد میرے ساتھ ہے۔“ مہاراج گنیش نے کہا اور پجاریوں کے ساتھ دربار سے چلا گیا۔

مہاراج گنیش کی شرانگیزی کے نتیجے میں دیش بھر کے پنڈت اور پجاری راجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، راجہ ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا لیکن اس نے اپنا ارادہ ملتوی نہیں کیا۔ ادھر اچھوتوں کی بستی میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ دوسرے روز راجہ پردیپ کی بارات نے آنا تھا۔ وہ اچھوتوں کا مان بڑھانا چاہتا تھا۔ شام کے قریب چند پجاری اچھوتوں کی بستی میں داخل ہوئے اور پوجا کی جھونپڑی میں پہنچ گئے۔ ایک پجاری نے جگدیش سے کہا۔ ”ہم تمہاری بیٹی کو مندر تک لے جانے آئے ہیں۔ راجہ کے حکم پر مہا پجاری اس کی جنم کنڈلی بنائیں گے۔ اس موقع

پر راجا اور اس کی ہونے والی رانی کی مندر میں موجودگی ضروری ہے۔" پوجا کو تیار کیا گیا۔

جگدیش بیٹی کے ساتھ ہی روانہ ہوا۔ پجاری دونوں باپ بیٹی کو ایک دور دراز کے علاقے میں واقع کالی کے قدیم مندر میں لے گئے۔ جگدیش کو ہال میں رکنے کا حکم دیا گیا جبکہ پوجا کو پجاری، مہا پجاری سے ملانے لے گئے۔ اسی وقت دو گرانڈیل پجاری تلواریں سونت کر جگدیش کے سامنے آگئے اور آناً فاناً اس کی ہتھیا کر ڈالی۔ ادھر پجاری پوجا کو لے کر جیسے ہی مہا پجاری کے سامنے پہنچے وہ ٹھٹک گئی، کالی کے بت کے قریب گنیش مہاراج موجود تھا وہ اس کے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ وہ ان کا جنم جنم کا دشمن کشوری لال تھا۔ "نندنی پہچانا مجھے، میں نے کہا تھا ناں کہ میں ہر جنم میں تم دونوں سے پہلے موجود ہوں گا۔ اور کبھی تمہیں ایک نہیں ہونے دوں گا۔" گنیش نے کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے کشوری لال اوش جیت ہمارے پیار کی ہوگی، اس جنم میں نہ سہی اس سے اگلے جنم میں۔" پوجا نے پرنرم لہجے میں کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے میں تمہیں اگلے جنم میں بھی سپھل نہیں ہونے دوں گا۔" گنیش نے کہا۔ پوجا کو اس کے حکم پر کالی کے قدموں میں لٹا دیا گیا۔ پجاریوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور گنیش تیز دھار خنجر لے کر اس کے قریب آگیا اور اس کی شہ رگ پر خنجر چلا دیا۔

دوسرے روز راجہ پردیپ بارات لے کر اچھوتوں کی بستی میں پہنچ گیا۔ وہاں اسے پتہ چلا گزشتہ روز کچھ پجاری پوجا اور جگدیش کو راجہ کا نام لے کر مہا پجاری کے پاس لے گئے تھے۔ راجہ پردیپ کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے اس معاملے سے سازش کی بو آرہی تھی۔ دیش بھر کے مندروں کی تلاشی لی گئی، کالی کے پرانے مندر سے پوجا اور جگدیش کی لاشیں مل گئیں۔ گنیش اور اس کے ساتھی پجاری غائب تھے۔ ان کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ راتوں رات فرار ہوگئے تھے۔ راجہ نے پوجا کی سمادھی بنائی وہ صرف ایک سال زندہ رہا بالآخر پوجا کے غم میں گھٹ گھٹ کر مر گیا۔

☆......☆......☆

صدی بعد اس دیش پر راجہ رام پرشاد کی حکومت تھی، رام پرشاد کی سو رانیاں تھیں، وہ ایک عیاش راجہ تھا۔ رانیوں کے علاوہ باندیاں بھی سینکڑوں کی تعداد میں تھیں، اسے دیش بھر میں جو بھی لڑکی پسند آتی زبردستی راج محل بلوالیتا۔ وہ ہر وقت شراب اور شباب میں مشغول رہتا۔ اس کی چھ بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا گنگا رام اور چھوٹا بیٹا گوپال ان دونوں کے برعکس تھا۔ وہ ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والا نوجوان تھا۔ عوام کی اکثریت راج کمار گوپال کو پسند کرتی تھی اور دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتے تھے کہ رام پرشاد کے بعد گوپال ملک کا راجہ بنے۔

گنگا رام اپنے باپ کی طرح عیاش اور ظالم تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا گوپال سے نالاں رہتے تھے گوپال خوابوں اور خیالوں میں رہنے والا نوجوان تھا۔ وہ اکثر کھویا کھویا رہتا۔ وہ دراصل ان دیکھی ہستی سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ ابھی اس کی عمر محض دس سال تھی کہ اسے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"راج کمار کیا کر رہے ہو؟"

وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ وہ لڑکی کہاں سے بول رہی ہے۔ مگر اس وقت اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ آواز سے وہ لڑکی اسی کی ہم عمر لگ رہی تھی۔

ایک مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی اور آواز گونجی۔ "تم مجھے دیکھ نہیں سکتے پرنتو ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں، میں تمہارے جنم جنم کی ساتھی ہوں اور مجھ سے باتیں کرنے کے لئے تمہارا بولنا ضروری نہیں، تم من ہی من میں باتیں کرو میں سن بھی لوں گی اور جواب بھی دوں گی۔" اس نے کہا۔

یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی۔ اس کی دیوانگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ ان دیکھی لڑکی سے باتیں کرتا اور لوگ اسے دیوانہ سمجھتے۔ راجہ رام پرشاد اور گنگا رام سمیت رانیاں بھی اس کا مذاق اڑاتیں، وہ لڑکی اسے اپنے جنم جنم کی کہانی سنا چکی تھی، اب وہ جوان ہو چکا تھا۔ لڑکی نے اپنا نام انجلی بتایا تھا۔ ایک روز گوپال کو بخار تھا۔ انجلی کی آواز اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ گوپال نے اسے بتایا کہ اسے بخار ہے تب انجلی نے کہا کہ اسے بھی بخار ہے۔

ایک روز اسے پاؤں میں چوٹ لگی تو انجلی نے اسے بتایا کہ اسے بھی چوٹ لگی ہے تب اس پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ان کا دکھ درد اور تکلیف مشترک ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک قسم کا ٹیلی پیتھی قسم کا رابطہ تھا۔

بعض اوقات خود گوپال کو بھی یہ گمان ہوتا کہ انجلی کا وجود اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ایک روز وہ تنہا گھومتا پھرتا ایک ویران علاقے میں جا پہنچا۔ اسے ایک سمادھی دکھائی دی۔ اس کے قدم بے اختیار سمادھی کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک اسے ایک مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی، اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ اسے ایک خوب صورت لڑکی دکھائی دی۔

"کون ہو تم؟" اس نے لڑکی کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پہچانا روز ہی تو مجھ سے باتیں کرتے ہو۔" لڑکی کی آواز سن کر وہ چونک پڑا یہ وہی آواز تھی جو وہ برسوں سے سنتا چلا آیا تھا۔

"ادھر میری آنکھوں میں دیکھو۔" انجلی نے کہا وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ چاروں جنموں کی کہانی اسے انجلی کی آنکھوں میں دکھائی دی وہ یہ کہانی تھی جسے اب تک انجلی اسے سناتی چلی آئی تھی یہ بھگوان کی ان دونوں پر کرپا تھی کہ وہ ہر جنم میں یہ کہانی ایکدوسرے کی آنکھوں میں پڑھ لیتے تھے۔ انجلی اپنے جنم جنم کی کہانی دہرا چکی تھی۔

"مہاراج کشوری لال اس جنم میں کہاں ہوں گے۔" راج کمار گوپال نے پوچھا۔

"جہاں کہیں بھی ہوں گے جیت ہماری ہی ہوگی۔" انجلی بولی۔

ان کے درمیان میل ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ وہ آنکھ کھلتے ہی محل سے نکل جاتا اور انجلی سے ملنے چلا جاتا۔ راجہ رام پرشاد ویسے بھی اس سے نالاں تھا۔ اس نے اس پر روک ٹوک کی ایک روز گوپال نے انجلی سے کہا کل وہ اسے مندر لے جائے گا جہاں ان دونوں کی شادی ہوگی مگر اس جنم میں بھی ان کا ملن ممکن نہ تھا۔

کشوری لال جو اس جنم میں دیال شنکر تھا۔ وہ اپنے پجاریوں کے ساتھ اچھوتوں کی بستی میں پہنچا۔ راجہ کے بہت سے سپاہی بھی اس کے ساتھ تھے۔ انجلی کو زندہ جلا دیا گیا، اچھوتوں کی بستی کو آگ لگا دی گئی، راج کمار گوپال نے یہ خبر سنتے ہی آتما ہتھیا کرلی۔

☆......☆......☆

صدیاں گزر گئیں، کئی صدیوں بعد اس دیش پر انگریز سازش کے ذریعے قابض ہوگئے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں بہت سے باغیوں نے جنم لیا جو ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان ہی باغیوں میں ایک باغی پریم بھی تھا۔ وہ ذات کا برہمن تھا۔ وہ انگریزوں کے لئے دردسر بنا ہوا تھا۔ وہ اور اس کے باغی ساتھی اچانک شب خون مارتے اور انگریز فوج کے سپاہیوں کو گھیر کر مار ڈالتے۔ انگریز فوج کے سپاہیوں پر ہر وقت اس کی ہیبت طاری رہتی۔ ہندوستانی عوام نے اسے دیوتا کا نام دے رکھا تھا۔ پھر ایک روز کسی غدار کی مخبری پر اسے گھیر کر گرفتار کرلیا گیا۔ اسے اس کے تین ساتھیوں سمیت جیل کی کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ جنرل ڈائر نے انہیں سولی پر چڑھانے کا حکم دے دیا۔

ایک روز اسے اور اس کے تین ساتھیوں سمیت جیل سے نکالا گیا۔ ان کے ہاتھ پشت پر مضبوط رسی سے بندھے ہوئے تھے اور وہ سپاہیوں کے گھیرے میں چل رہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف سینکڑوں ہندوستانی بے بس کھڑے تھے۔ لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کہ مداخلت کرتا۔ جنرل ڈائر نے اسے شہر کے چوراہے پر سولی چڑھانے کا حکم دیا تھا تاکہ دیگر ہندوستانی اپنے دیوتا کو سولی پر چڑھتے دیکھ کر عبرت حاصل کرتے۔

انگریز فوج کا کرنل رچرڈ، اور کیپٹن ہیری اس سے آگے سینہ تانے چل رہے تھے، ایک جگہ کرنل رچرڈ رکا اسے رکتا دیکھ کر کیپٹن ہیری اور دیگر سپاہی بھی رک گئے۔ کرنل رچرڈ نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور تحقیر آمیز نگاہوں سے سینکڑوں کی تعداد میں خاموش کھڑے نہتے ہندوستانیوں کو دیکھا۔ پھر با آواز بلند بولا۔ "ہندوستانیوں یہی وہ پریم ہے جسے تم اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو اور دیوتا کہتے ہو، دیکھو کیسا بے بس کھڑا ہے، اسے آج ہم تمہاری نظروں کے سامنے

سولی پر چڑھائیں گے تاکہ آئندہ کوئی انگریز سرکار سے بغاوت کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔"

اس کی تحقیر آمیز گفتگو سے ہندوستانی عوام میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن مسلح سپاہیوں کے سامنے نہتے ہندوستانی کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ یہ قافلہ دوبارہ چل پڑا۔ پریم کے دونوں اطراف دو سپاہی موجود تھے جو سپاٹ چہرہ لئے اسے دونوں اطراف سے پکڑے چل رہے تھے وہ شکل و صورت سے ہندوستانی لگ رہے تھے۔ لیکن یہ معمول کی بات تھی انگریز فوج میں کئی ہندوستانی بھی موجود تھے۔ جنہیں دھرم کی آزادی سے زیادہ انگریز سرکار کی خوشنودی اور دولت درکار تھی۔ اچانک پریم کو عجیب سا احساس ہوا اسے ایسے لگا کہ اس کے ہاتھوں کی بندش ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

"خاموشی سے چلتے رہو یہ کام میرا ہے جب تک مناسب وقت نہیں آتا۔ کسی کو احساس بھی نہیں ہونا چاہئے کہ میں نے تمہاری بندشیں ڈھیلی کردی ہیں۔" اس کے دائیں طرف موجود ہندوستانی سپاہی نے سرگوشی میں کہا اور وہ خاموشی سے چلتا رہا۔ قافلہ شہر کے مرکزی چوک پر جاکر رکا۔ چوراہے میں ایک طرف اسٹیج سا بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف تین چار فٹ کے قریب راستہ تھا۔ انہیں اسی راستے سے اسٹیج پر لایا گیا۔ اسٹیج پر کراس کی شکل میں تین چار لکڑیوں کی سولیاں موجود تھیں۔ اسے بھی ایک سولی کے قریب کھڑا کردیا گیا۔ کرنل رچرڈ اور ہیری اس سے کچھ فاصلے پر رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ مسلح رائفل بردار سپاہی بھی کھڑے تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں نہتے ہندوستانی اپنے اس دیوتا کو دیکھ رہے تھے جسے انگریز چند لمحوں بعد سولی پر چڑھانے والے تھے۔

"ہندوستانیوں اپنے ہیرو اور دیوتا کو آخری بار دیکھ لو۔" کرنل رچرڈ کی بھاری بھرکم آواز گونجی اور دو افراد ہاتھوں میں بھاری بھرکم ہتھوڑے اور کئی انچ لمبی کیلیں لئے اسٹیج پر چڑھ گئے۔ وہاں موجود تمام افراد جانتے تھے، سولی کے ذریعے موت بہت ہی اذیت ناک ہوتی، ملزم کو لکڑی کی سولی پر لٹا دیا جاتا تھا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھوں اور ٹخنوں میں کیلیں ٹھونک کر سولی کے ساتھ پیوست کردیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کے سینے میں خنجر اتار دیا جاتا تھا۔

پریم کو سولی کے اوپر لٹا دیا گیا اور جلاد اس کے قریب آگئے۔

اچانک ہلچل سی مچی۔ یہ درجن کے قریب مسلح نقاب پوش تھے جو بھاگتے ہوئے خاردار تاروں کی باڑ کے قریب آچکے تھے۔ ان کے آگے دو نوجوان تھے جو شاید ان کی قیادت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے لکڑی کا تختہ اٹھا رکھا تھا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں رائفل موجود تھی۔ رائفل بردار نوجوان دبلا پتلا اور درمیانے قد و قامت کا تھا۔ لکڑی کا تختہ اٹھائے ہوئے نوجوان نے تختہ ایک جگہ خاردار تاروں پر رکھا اور انگریز سپاہیوں نے رائفلیں سیدھی کرلیں۔ وہ تختہ پھلانگ کر اندر آنے لگے۔ خاردار تاروں کے قریب موجود سپاہیوں نے فائر کئے۔ ایک نوجوان سینے پر گولی کھا کر چیختا ہوا گرا جبکہ دوسروں نے خاردار تاروں سے اندر آتے ہوئے فائرنگ شروع کردی، کئی سپاہی سینے پر گولیاں کھا کر گرے اور تڑپنے لگے۔ انگریز سپاہیوں کے لئے یہ مزاحمت قطعی غیر متوقع تھی۔

چاروں طرف کھڑے سینکڑوں ہندوستانی یہ منظر دیکھتے ہی خالی ہاتھ سپاہیوں سے گتھم گتھا ہوگئے، افراتفری پھیل چکی تھی، جلاد پریم کو بھول کر ہکا بکا یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پریم برق سرعت سے اٹھا۔ اور دونوں ہتھوڑا بردار افراد کو اٹھا کر ایک طرف پٹخ دیا۔ ادھر اس کے دونوں ساتھی نیچے گرے ہتھوڑا برداروں پر پل پڑے۔ پریم کرنل رچرڈ پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ کیپٹن ہیری نے اس کی طرف رائفل سیدھی کی، دبلے پتلے نقاب پوش نوجوان نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی کیپٹن ہیری کی پیشانی میں لگی وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔

ادھر پریم نے کرنل رچرڈ سے رائفل چھین کر اس پر فائر کردیا۔ گولی کرنل رچرڈ کے سینے میں عین دل کے مقام میں پیوست ہوگئی۔ بساط کا رخ پلٹ چکا تھا۔ انگریز سپاہی مارے گئے، بچ جانے والے سپاہی سینکڑوں افراد کے مجمع کے سامنے بے بس ہوچکے تھے۔ "اب یہاں سے نکلو یہ نہ ہو

جنرل ڈائر بھاری نفری یہاں بھیج دے۔" ایک نقاب پوش چیخا اور وہ پریم سمیت وہاں سے نکل گئے۔

اس مقام سے کافی دور پہنچ کر نقاب پوش رک گئے۔

"پریم بابو اب ہمارے راستے جدا ہیں۔ ہمارا مقصد تمہیں انگریز سپاہیوں سے بچانا تھا۔ کیوں کہ تم دیش کی آزادی کے لئے ان سے برسرپیکار ہو۔" دبلے پتلے نقاب پوش نے کہا اور پریم چونک پڑا۔ اس کی دلکش آواز نسوانی تھی۔

"تم لڑکی ہو؟" پریم نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں کیا لڑکیاں دیش کی آزادی کے لئے جدوجہد نہیں کرسکتیں، راج کمار آکاش۔" لڑکی نے کہا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک طرف چل پڑی۔ اور وہ حیرت سے اسے جاتے دیکھنے لگا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ نقاب پوش لڑکی اور اس کے ساتھی کون ہیں اور اس لڑکی نے اسے جاتے جاتے راج کمار آکاش کیوں کہا تھا؟

وہ الجھا ہوا سا ایک طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کالی کے قدیم مندر کے تہہ خانے میں موجود تھا۔ یہ ان کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ اندر مہا گرو شیوا جی اور پریم کے ساتھی موجود تھے۔ پریم دوڑ کر شیوا جی کے سینے سے لگ گیا۔ "ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ تم انگریزوں کی لاشیں بچھا کر بھاگ نکلے ہو۔" وہ خوشی سے کپکپاتے لہجے میں بولا اور اس سے الگ ہوگیا۔

"مہاراج یہ سب کمال ایک لڑکی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ وہ نہ جانے کون تھے لیکن میری زندگی بچانے میں ان کا ہاتھ ہے۔" پھر اس نے بتایا کہ "کس طرح اس لڑکی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی جان بچائی۔"

"پریم اب تم اور تمہارے ساتھی کچھ دنوں کے لئے انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرو گے اس واقعے کے بعد جنرل ڈائر تم لوگوں کی تلاش میں زمین اور آسمان ایک کردے گا۔" مہا گرو شیوا جی نے کہا اور تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

شیوا جی پریم اور اس کے ساتھیوں کو پناہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں میں بھی شریک تھا۔ پریم کافی دنوں سے تہہ خانے میں فارغ پڑے رہنے سے اکتا چکا تھا۔ چند دنوں بعد وہ تہہ خانے سے باہر نکلا اور مندر میں پوجا پاٹ کے بعد چہل قدمی کی غرض سے مندر سے باہر آگیا۔ یہ مندر جنگل کے قریب تھا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ اسے کسی لڑکی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی وہ چوکنا ہوگیا، رائفل کندھے سے اتاری اور آواز کی سمت چل پڑا۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں نصف درجن افراد ایک خوب صورت لڑکی کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر وہ چونک پڑا وہ کیلاش تھا۔ انگریزوں کا مخبر اسی کی مخبری پر پریم پہلے بھی گرفتار ہوچکا تھا۔ پریم نے لاک پن ہٹائی۔ اور پے در پے کئی فائر کئے، کیلاش کے تین ساتھی سینے پر گولیاں کھا کر چیختے ہوئے گرے۔ اس کا نشانہ بے مثال تھا۔ کیلاش کے دوسرے ساتھیوں نے رائفلیں سیدھی کی ہی تھیں کہ دو گولیاں چلیں اور کیلاش کے وہ دونوں ساتھی بھی سینے پر گولیاں کھا کر چیختے ہوئے گرے۔ اپنے ساتھیوں کے مرتے ہی کیلاش وہاں سے بھاگ نکلا۔

پریم لڑکی کے قریب پہنچا۔ "تم کون ہو اور ان کے ہاتھ کیسے لگیں؟"

"میں رجنی ہوں، باپو کی طبیعت بہت خراب ہے، وید تلسی رام کو لینے ان کے گھر جارہی تھی کہ انہوں نے اسلحے کی زد پر گھیر لیا، اگر یہ مسلح نہ ہوتے اور تعداد میں زیادہ نہ ہوتے تو اتنی آسانی سے مجھے یہاں تک گھیر کر نہیں لاسکتے تھے۔" لڑکی نے کہا۔

اور وہ چونک پڑا۔ یہ آواز اور یہ لب و لہجہ اس لڑکی کا تھا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔

"تم وہی ہو ناں جس نے اپنے ساتھیوں سمیت انگریزوں پر دھاوا بول دیا تھا۔" اس نے رجنی کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میں وہی ہوں۔"

"پھر تم نے مجھے راج کمار آکاش کیوں کہا حالاں کہ میرے خیال میں تم جانتی ہو میں پریم ہوں۔"

"ادھر میری آنکھوں میں دیکھو۔" لڑکی بولی اور پریم نے اس سے نظریں ملالیں۔ "میں نندنی ہوں۔" اس نے کہا اور جنم جنم کی کہانی سنانے لگی، کہانی ختم ہونے تک وہ سب کچھ جان چکا تھا۔

"ہمارے اس جنم میں ہمارے پیار کا دشمن کشوری لال کہاں ہے؟" پریم نے پوچھا۔

"وہ جہاں کہیں بھی ہے ابھی ہماری موجودگی سے لاعلم ہے، ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا کیونکہ اس جنم میں بھی میں اچھوت ہوں، اور تم برہمن، کل مجھے ملنا میں تمہیں سادھو مہاراج کے پاس لے چلوں گی۔ وہ بہت بڑے گیانی ہیں، ضرور ہماری مدد کریں گے۔" رجنی بولی اور کچھ دیر بعد وہ اس سے رخصت ہوگئی۔

دوسرے روز پریم اس سے اسی جگہ ملا وہ اسے اچھوتوں کی بستی سے کچھ دور ایک کٹیا میں لے گئی جہاں ایک عمر رسیدہ سادھو موجود تھا۔ ان دونوں نے سادھو کو پرنام کیا اور ان کے اشارے پر بیٹھ گئے۔ "مہاراج یہ پریم ہے تحریک آزادی کا ہیرو۔" رجنی نے اس کا تعارف کروایا اور اپنی اور اس کی جنم جنم کی کہانی سادھو کے گوش گزار کردی۔ سادھو اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک طرف رکھے ٹین کے بکس سے کچھ نکال کر ان کے قریب آ گیا۔ "پریم یہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لو اور یہ لاکٹ اپنے گلے میں ڈال لو، جب تک یہ دونوں چیزیں تمہارے پاس موجود ہیں۔ کشوری لال تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" سادھو نے کہا۔ وہ کچھ دیر بعد سادھو سے آشیرواد لے کر کٹیا سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

گروشیوا جی پریم سے بہت خوش تھے مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی اچھوت ہیں تو انہوں نے کہا۔

"بالک تم نے دیش کی آزادی کے لئے جس یودھ کا آغاز کیا ہے ہندو دھرم کے لوگ تمہیں دیوتا کے نام سے پکارنے لگے ہیں۔ یہ لڑکی اور اس کے ساتھی اچھوت ہیں جبکہ ہم برہمن تمہارا یہ قدم تمہیں پستی میں گرادے گا یہ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔" مہا گروشیوا جی فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

"مہاراج ہر منش کو بھگوان نے پیدا کیا ہے پھر یہ فرق کیوں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ رجنی میرے جنم جنم کی ساتھی ہے۔" وہ اسے اپنے پچھلے جنموں کے بارے میں بتانے لگا۔

"شیوا جی کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات تھے۔ وہ کچھ نہیں بولے اور خاموشی سے پیچھے ہٹ گئے۔

پریم رجنی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ مہا گروشیوا جی تہہ خانے سے باہر جا چکے تھے۔ "پریم یہ تو کشوری لال ہے ہمارے پیار کے جنم جنم کا دشمن۔" رجنی خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ مہا گروشیوا جی ہیں اور دیش کی آزادی کی جنگ میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، میں نے انہیں تمہارے اور اپنے بارے میں بتایا تو خاموش رہے۔" پریم نے کہا۔

"نہیں پریم تم کشوری لال کا چہرہ بھول چکے ہو، پرنتو میں اسے نہیں بھول سکتی۔ یہ وہی ہے اور اس جنم میں شیوا جی کے نام سے موجود ہے۔" رجنی ہونٹ چباتے ہوئے بولی، پریم کے ساتھی بھی رجنی اور اس کے بستی کے نوجوانوں سے گھل مل گئے تھے۔ مہا گرو اس روز واپس نہیں لوٹے، دوسرے روز تہہ خانے میں آئے تو ان کے ساتھ پرکاش بھی تھا۔ "آپ اس غدار کو اپنے ٹھکانے پر کیوں لائے ہیں یہ انگریزوں کا مخبر اور دیش کا غدار ہے۔"

پریم اسے دیکھتے ہی بھڑک اٹھا۔ "بالک تم نہیں جانتے اب یہ ہمارا ساتھی ہے، میرے سمجھانے پر اس نے انگریز سرکار کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس کی شمولیت سے ہمیں بہت فائدہ پہنچ یگا۔ یہ ہمیں انگریزوں کے اہم ٹھکانوں تک پہنچائے گا، ہم شب خون مار کر ان کی قوت میں کمی کردیں گے۔" شیوا جی نے کہا۔

"مہاراج اس کے لئے انتظار کی ضرورت نہیں آبادی سے دور ایک قلعہ میں بھاری مقدار میں اسلحہ موجود ہے، میں قلعہ میں جانے کا خفیہ راستہ جانتا ہوں۔ ہم آج ہی نصف شب کے قریب اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ شب خون ماریں گے اور انگریز سپاہیوں کو مار کر اسلحہ لوٹ لیں گے۔" پرکاش نے پرجوش لہجے میں کہا۔

آدھی رات سے ایک گھنٹہ قبل وہ تہہ خانے سے باہر نکلے مہا گروشیوا جی اسے مندر کے ایک کمرے میں لے گئے۔ "پریم تم پرکاش پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرسکتے ہو۔" بولتے بولتے اس کی نظر پریم کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی

اور گلے میں موجود لاکٹ پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ "پریم یہ دونوں چیزیں مجھے دے دو، قلعہ میں جاتے سے ان کا تمہارے پاس ہونا ٹھیک نہیں واپسی پر مجھ سے لے لینا۔" مہا گرو نے کہا۔ اور پریم نے خاموشی سے دونوں چیزیں مہا گروشیوا جی کے حوالے کردیں۔ "اپنا خیال رکھنا۔" انہوں نے اسے گلے لگا کر پیٹھ پر تھپکی دی۔

وہ سب کے سب مسلح تھے۔ سب سے آگے پرکاش چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پریم اور رجنی اور ان سے پیچھے ان کے پچاس کے قریب ساتھی تھے۔ وہ پیدل چلتے ہوئے اس وسیع عریض قلعے کے قریب پہنچ گئے۔ پرکاش انہیں قلعے کے عقبی سمت لے گیا۔ عقبی سمت دیوار میں رخنہ موجود تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اس رخنے سے اندر داخل ہوگئے اور پرکاش کے پیچھے چلتے ہوئے مختلف راہداریوں اور غلام گردشوں سے ہوتے ہوئے وسیع وعریض میدان میں پہنچ گئے۔ انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ اب تک ان کا سامنا انگریز فوج کے کسی بھی سپاہی سے نہیں ہوا تھا۔ اس میدان کے چاروں اطراف اونچی عمارت پر جابجا مورچے بنے ہوئے تھے جو اس وقت خالی نظر آرہے تھے۔

اچانک کسی سمت سے چند فائر ہوئے اور ان کے ساتھ چلنے والے تین ساتھی چیختے ہوئے گرے اور تڑپنے لگے، ان میں افراتفری پھیل گئی، پرکاش دائیں سمت بھاگا اور وہ واپسی کے راستے کی طرف دوڑے، اور ششدر رہ گئے۔

وہ جس دروازے سے اس میدان میں داخل ہوئے تھے وہ باہر سے مقفل کیا جا چکا تھا۔ پریم نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اس کے ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ عمارت کی چھتوں پر موجود مورچوں میں رائفلیں لئے انگریز سپاہی نظر آرہے تھے۔ اور تو اور عمارت کی چھت چاروں اطراف سے انگریز سپاہیوں کے گھیرے میں تھی ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی، انہیں منظم طریقے سے گھیرا گیا تھا۔ "تمہارے فرار کے سب راستے بند کردیئے گئے ہیں۔ تم لوگوں نے انگریز سرکار کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ان کا حساب دینے کا وقت آچکا ہے۔ شاید تم لوگوں میں سے بہت سے مجھے نہیں جانتے۔ میں تم ہندوستانیوں کی موت جنرل ڈائر ہوں۔" ایک بھاری بھرکم آواز فضا میں گونجی۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔

چھت پر قوی ہیکل انگریز کھڑا قہر آلود نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پریم اور اس کے ساتھیوں نے رائفلوں کا رخ چھت کی طرف کر کے فائر کئے مگر انگریز سپاہی محفوظ مقامات پر مورچہ زن تھے۔ جنرل ڈائر نے فائر کا حکم دے دیا۔ چاروں طرف سے ان پر فائرنگ ہونے لگی۔ پریم کے ساتھی جسم پر گولیاں کھا کر چیختے ہوئے گرنے لگے۔

حیرت انگیز طور پر اب تک کوئی گولی پریم یا رجنی کی طرف نہ آئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میدان کے چاروں طرف اس کے ساتھیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جنرل ڈائر اور انگریز سپاہی چھتوں سے اتر کر ان کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے، وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔

اچانک ایک طرف سے دو افراد نکل کر جنرل ڈائر کے قریب کھڑے ہوگئے، پریم انہیں دیکھ کر حیرت سے اچھل پڑا، وہ پرکاش اور مہا پجاری شیوا جی تھے جو ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"مہاراج آپ بھی غدار نکلے۔" پریم کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا۔

"ہاں میں مہاراج شیوا جی اور پہلے جنم کا کشوری لال، یہ سب تمہارے کارن ہوا نہ تم اس اچھوت لڑکی کو مندر میں لاتے اور نہ ہی اس کی حمایت کرتے تو تمہیں آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" پجاری نے کہا۔

"اور مہا پجاری یہ بھی تو دیکھو انگریز سرکار کی مدد کرنے سے تمہیں کتنی دولت ملی ہے، اور اپنے دشمنوں سے نجات بھی پرنتو اپنا وچن یاد رکھنا۔ پریم کے مرنے کے بعد ایک رات کے لئے اس لڑکی کو میرے حوالے کردینا۔" پرکاش مکروہ انداز میں ہنسا۔

جنرل ڈائر نے اپنی جیب سے رومال نکالا، ہاتھ فضا میں بلند کر کے ایک جھٹکے سے نیچے کیا اور آواز لگائی۔ "فائر۔"

سپاہیوں نے ٹریگر دبا دیئے۔ چاروں طرف سے برسنے والی سینکڑوں گولیاں پریم کے جسم میں پیوست ہوگئیں

وہ گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

"پر کاش یہ لڑکی تمہارا انعام ہے۔" جنرل ڈائر نے کہا۔

"کشوری لال اس جنم میں تم سے بہت بڑی بھول ہوگئی ہے۔" رجنی بولی۔

"کیسی بھول؟" کشوری لال کے لہجے میں استعجاب آمیز حیرت تھی۔

"تمہاری سب سے بڑی بھول اچھوت نندنی سے پہلے پریم کی ہتھیا ہے اب اگلے جنم میں دیوی کے آشیرواد سے تمہارے مقابلے میں شکتی کے ساتھ آؤں گی، ساتواں جنم تمہارا انت کا ہوگا۔" رجنی نے کہا اور برقی سرعت سے اپنے لباس میں پوشیدہ خنجر نکال کر اپنے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست کردیا اور بنا چیخے پریم کے قریب گر گئی۔

آزادی کا ہیرو ہندوستانیوں کا دیوتا غداروں کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ کشوری لال مندر میں پہنچا اور ایک پجاری سے کہا۔ "میں کالی کے نام پر اپنی بلی دے رہا ہوں۔ تم میرے جسم کو تہہ خانے میں موجود طلائی تابوت میں بند کردینا اور یہ انگوٹھی اور لاکٹ بھی تابوت میں رکھ دینا۔" اس نے خود ہی تیز دھار خنجر اپنی گردن پر رکھ کر چلادیا۔ اس کی لاش کالی کے قدموں میں گر پڑی۔

پجاری نے اس کی وصیت کے مطابق اسے تابوت میں بند کرکے لاکٹ اور انگوٹھی بھی تابوت میں رکھ دی۔ آزادی کی تحریک چلتی رہی، مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوششوں سے دو ملک وجود میں آگئے۔

☆......☆......☆

بھارت کی اس ریاست میں کئی برس بعد اجیت کے گھر ایک لڑکی نے جنم لیا، جس کا نام نندنی رکھا گیا۔ اس کے ماتا پتا کا ایک حادثے میں دیہانت ہوگیا۔ وہ آشرم میں پلی اور پھر کالی کے مندر کی داسی بنی۔ پوجا اور تپسیا سے اسے معلوم ہوگیا کہ یہ اس کا ساتواں جنم ہے اور مہاراج کشوری لال کالی کے پرانے مندر میں تہہ خانے میں تابوت میں بند ہے اور زیادہ شکتی کے ساتھ اس کے مقابلے پر آئے گا۔ وہ مندر سے نکل کر اس جنگل میں آبسی۔ اس نے آکاش کے بارے میں جاننے کے لئے جاپ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ آکاش اس جنم میں مسلمان ہے۔ کشوری لال کی اس جنم میں دوسری سب سے بڑی غلطی اپنے تابوت میں انگوٹھی اور لاکٹ رکھنا تھا۔ جو چوری ہوکر نوید کے پاس کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے۔

وہ پجاریوں سے جان بچا کر بھاگتے ہوئے انڈیا کے سرحدی علاقے میں داخل ہوگیا اور مندر کی سرنگ میں جاگرا جہاں سے نندنی اسے نکال لائی، جنم جنم کی کہانی سنتے صبح ہوچکی تھی، نوید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تمہاری جنموں کی کہانی بہت دلچسپ تھی، وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ سب سے حیرت انگیز بات تمہاری آنکھوں میں نظر آنے والے وہ کردار تھے، مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں سینما اسکرین پر کوئی دلچسپ فلم دیکھ رہا ہوں۔" نوید اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ کوئی من گھڑت بے سروپا کہانی نہیں، تمہاری اور میری جنم جنم کی کہانی ہے، ہمارے اس ساتویں اور آخری جنم میں ہمارے پیار کا دشمن کشوری لال بھی موجود ہے اس کہانی کا سب سے بڑا ثبوت تمہاری انگلی میں موجود انگوٹھی اور گلے کا لاکٹ ہے، خطرے کے وقت نگینے کا رنگ گہرا سرخ ہوجائے گا، پرنتو جب تک یہ دونوں چیزیں تمہارے پاس ہیں، کشوری لال تمہیں کوئی جانی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی زبردستی انہیں کوئی تم سے چھین سکتا ہے۔ میری بات ہمیشہ یاد رکھنا، اسے کبھی بھی اپنی ذات سے جدا نہ کرنا، پچھلے جنم میں بھی کشوری لال نے دھوکے سے یہ دونوں چیزیں تم سے ہتھیائی تھیں، اس بار ہوشیار رہنا۔" نندنی نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو نندنی یہ سچ ہے کہ تم بہت خوب صورت ہو اور یہ بھی سچ ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ کشوری لال کے خلاف تمہارا ساتھ دوں گا، مگر میری ایک بات غور سے سن لو، الحمدللہ میں مسلمان ہوں، ہم مسلمان ان جنموں پر یقین نہیں رکھتے، ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد صرف ایک بار بروز قیامت زندہ کیا جائے گا اور وہ زندگی ہمیشہ کے لئے ہوگی جس کے اعمال صالح ہوں گے۔ اور اس نے مخلوق خدا کو کوئی تکلیف نہ

پہنچائی ہوگی وہ جنت میں جائے گا اور برے اعمال والے لوگ دوزخ میں جائیں گے۔" نوید بولتا چلا گیا۔ اور وہ حیرت سے سننے لگی۔

"کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ اس کا فیصلہ آنے والے سمے پر چھوڑ دو۔ اس وقت تو باہر چلو کھانے کے لئے کچھ شکار کریں۔" نندنی بولی اور ایک طرف رکھے تیر اور کمان اٹھالئے۔

وہ جھونپڑی سے باہر نکلے۔ نندنی ایک ماہر تیر انداز تھی اس نے دو خرگوش شکار کئے۔ نوید نے اسلامی طریقے کے مطابق خرگوش ذبح کئے، نندنی نے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع کرکے آگ جلائی۔ کچھ دیر بعد وہ آگ پر بھونے خرگوش کا گوشت کھا رہے تھے۔ یہ نوید کے لئے ایک دلچسپ تجربہ تھا۔

"تمہیں اس جنگل میں جانوروں سے ڈر نہیں لگتا۔ یہاں خطرناک درندے بھی ہوں گے۔" نوید نے پوچھا۔

"نہیں یہ درندے، چرند، پرند، سب میرے دوست ہیں۔ یہ انسانوں سے بہتر ہیں، دل میں کسی کے لئے بغض نہیں رکھتے۔" نندنی رسان سے بولی۔

نوید کے شب و روز اس جنگل میں گزرنے لگے۔ وہ بھی اس خوب صورت لڑکی کو چاہنے لگا تھا۔ ان کے پیار میں پاکیزگی تھی، ایک ہی جگہ دن رات تنہا رہنے کے باوجود ان کے درمیان فاصلہ تھا۔ اس روز وہ جنگل میں گھوم رہے تھے کہ نوید کی نظر اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کے نگینے پر پڑی، نگینے کی رنگت گہری سرخ ہورہی تھی۔ "نندنی ادھر دیکھو! انگوٹھی کا نگینہ گہرا سرخ ہورہا ہے۔"

نندنی نے انگوٹھی کے نگینے کو دیکھا تو ہراساں ہوگئی۔ "ہم کسی مشکل میں پڑنے والے ہیں۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

اسی وقت گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی گاڑی کی آواز تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے نصف درجن مسلح گھڑ سوار انہیں گھیرے میں لے چکے تھے۔ ایک بڑے ٹائروں والی جیپ بھی تھی جس میں دو رائفل بردار افراد موجود تھے۔ "کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟" نوید نے پوچھا، جیپ سے ایک دراز قد شخص اترا اور ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ "میں ونود شرما تمہیں جے چند کے پاس لے جانے آیا ہوں۔"

"کون جے چند! میں کسی جے چند کو نہیں جانتا۔" نوید نے کہا۔

"وہ یہاں کے ان داتا ہیں، اس علاقے کے مالک، جلدی چلو ہمارے پاس وقت بالکل نہیں، وہاں تمہارا بے چینی سے انتظار ہورہا ہے۔" ونود شرما نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ انہیں اسلحے کی زد پر جیپ پر سوار کروالیا گیا۔ جیپ اور گھوڑوں پر مشتمل قافلہ ایک شاندار قسم کی حویلی کے سامنے رکا۔ احاطے کی دیواریں کافی اونچی تھیں۔ عمارت کے بڑے گیٹ پر دو رائفل بردار گارڈز موجود تھے جنہوں نے جیپ کو دیکھتے ہی آہنی گیٹ کھول دیا۔ جیپ اندر داخل ہوگئی جبکہ گھڑ سوار باہر ہی رک گئے۔ احاطے کے اندر درجنوں مسلح افراد موجود تھے۔ وہ مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے ایک ہال نما کمرے میں پہنچے۔ اندر شاہانہ طرز کی کرسیوں پر چار افراد بیٹھے تھے۔ پہلی کرسی پر بڑی بڑی مونچھوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ والی کرسی پر ایک دراز قد قوی ہیکل شخص موجود تھا۔ اس کے گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں تھیں۔ تیسری کرسی پر بھی ایک ادھیڑ عمر صحت مند شخص بیٹھا تھا جبکہ چوتھی کرسی پر ایک پچیس تیس سالہ باڈی بلڈر ٹائپ نوجوان موجود تھا۔ نوجوان کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ ان دونوں کو مجرموں کی طرح ان کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ دیوہیکل پجاری انہیں دیکھ کر مسکرایا۔

"نندنی میں نے کہا تھا ناں کہ میں ہر جنم میں تم سے پہلے موجود ہوں گا، یہ تمہارا ساتواں جنم ہے، اب تمہاری جنم جنم کی کہانی کا انت ہونے والا ہے۔ اور اس نے نوید کی طرف اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھا۔ "اس جنم میں تم مسلے ہو، کالی کے مندر سے چوری ہونے والا لاکٹ اور انگوٹھی تمہارے پاس ہے۔ انہیں میرے حوالے کردو۔"

"نہیں نوید ایسی غلطی کبھی مت کرنا ان دونوں چیزوں کے اصل مالک تم ہی ہو، جب تک یہ تمہارے پاس ہیں کشوری لال تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور نہ ہی تم سے چھین سکتا ہے اور کشوری لال تم اس جنم میں اپنے مکروہ عزائم میں

کامیاب نہیں ہوسکتے۔" تندنی کشوری لال کی طرف دیکھتے ہوئے غضب ناک انداز میں بولی۔

"ناری تو بڑی مست چیز ہے۔" مہاراج دراز قد نوجوان نے کشوری لال کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے اس سال کے میلے میں یہ لڑکی تمہاری ہوگی۔" شاہانہ طرز کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

"نہیں جے چند یہ اپرادھی لڑکی ہے اب اس کے جنم جنم کے کھیل کا انت کرنا ہے، ہم آنے والی اماوس کی رات اسے دیوی ماں کے قدموں میں بلی چڑھادیں گے، اسے فی الحال اسی حویلی میں قید کرلو اور اس مسئلے کو بھی کسی کونے کھدرے میں ڈال دو، ایک دو دن میں اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔" کشوری لال نے کہا۔

ونود شرما نے نوید کو بازو سے پکڑا اور ہال نما کمرے سے باہر لے گیا۔ اسے ایک جیپ میں سوار کرایا گیا۔ تین رائفل بردار بھی جیپ میں بیٹھ گئے۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد جیپ کے سفر کا اختتام ایک عمارت کے سامنے ہوا۔ گیٹ پر دو رائفل بردار افراد موجود تھے۔ جنہوں نے ونود شرما کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ اور اسے اسلحے کی زد پر لئے عمارت کے اندر داخل ہوگئے۔ اندر بھی تین رائفل بردار افراد موجود تھے۔ نوید کو ایک کمرے میں دھکیل کر دروازہ مقفل کردیا گیا۔ کمرے میں کسی قسم کا ساز وسامان موجود نہ تھا۔ کمرے کی چھت سے لگی زنجیر سے ایک شخص الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے بے حس وساکت حرکت جسم سے اندازہ ہو رہا تھا یا تو وہ مر چکا ہے یا وہ بے ہوش ہے۔ اس کے زخمی چہرے پر جگہ جگہ لہو جما ہوا تھا۔ نوید ایک طرف ہوکر فرش پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا یہ چھت سے الٹا لٹکا شخص تھا جو زخمی وجود کے ساتھ کراہ رہا تھا۔ نوید اٹھا اور کوشش کرکے اسے کھول دیا اور احتیاط سے ایک طرف لٹایا وہ شخص کچھ دیر بعد اٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "تمہارا شکریہ نوجوان میں گزشتہ چھ گھنٹوں سے چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا، تم نے آکر مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔" نوجوان بلاشبہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا، زخمی ہونے کے باوجود چھ گھنٹے لٹکا رہا، پھر بھی اس اطمینان سے بات چیت کر رہا تھا۔

"تم اس علاقے کے تو نہیں دکھائی دیتے، کہاں سے آئے ہو؟" وہ نوید کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک سمجھے میرا نام نوید ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔" نوید نے کہا اور اپنی روداد اسے سناڈالی وہ حیرت اور دلچسپی سے اس کی کہانی سننے لگا۔

"تمہاری کہانی تو طلسم ہوشربا کی کہانی کی طرح ہے۔ پر تم اب بہت غلط جگہ پھنسے ہو۔ یہ اتر پردیش کا ایک دور دراز کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کا ان داتا جے چند ہے۔ جو ظالم اور عیاش شخص ہے۔ یہاں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں لیکن دونوں ہی جے چند سے نالاں ہیں۔ اس علاقے کی جو بھی لڑکی پسند آتی ہے اس کے آدمی اسے زبردستی اٹھا لاتے ہیں۔ کشوری لال نامی مہا پجاری اس کا دست راست اور پراسرار صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی لاش کالی کے مندر کے تہہ خانے میں تابوت کے اندر پڑی رہی، پھر وہ ایک اماوس کی رات زندہ ہوگیا۔ اندر جیت جے چند کا بیٹا اسی کی طرح ظالم اور سفاک ہے۔ اس نے اپنے علاقے کی کئی لڑکیوں کی عزت کو پامال کیا ہے۔ اسے مارشل آرٹ میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ہر سال علاقے میں ہونے والے مقابلوں کا فاتح ہوتا ہے لیکن یہ مقابلہ لڑتے وقت شرط رکھتا ہے کہ مقابلے کا اختتام کسی ایک فریق کی موت پر ہوگا۔

جے چند کی ایک بیٹی بھی ہے۔ جس کا نام لکشمی ہے۔ اس کے ایک ساتھی کا نام راجیش ہے جو ان کے غیر قانونی دھندوں میں شریک ہے۔ یہ بھی بے حد ظالم اور سفاک انسان ہے اور میں ہوں ان کا دشمن اور بقول ان کے ان کا باغی، میرا نام راہول ہے میرا پچیس تیس افراد پر مشتمل گروہ ہے جو ان کے مظالم کے خلاف سرگرم عمل رہتا ہے۔ ہم سب اچھوت ہیں جن سے یہ لوگ نفرت کرتے ہیں۔ ایک جھڑپ میں کل جے چند کے کارندوں نے مجھے پکڑ لیا اور تشدد کے بعد یہاں لاکر لٹکا دیا۔"

وہ ایک مخلص نوجوان تھا۔ جلد ہی نوید سے بے تکلف ہوگیا۔ کچھ گھنٹوں بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک رائفل بردار شخص اندر داخل ہوا۔ راہول کو آزاد دیکھ کر وہ چونکا اور نوید کی طرف دیکھا غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ راہول کو نوید نے آزاد کیا ہے۔ وہ دوبارہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی رائفل بردار اندر داخل ہوا اور فرش پر بیٹھے نوید کو لات رسید کرکے بولا۔ "چلو تمہیں اندر جیت صاحب نے بلوایا ہے۔"

نوید خاموشی سے اٹھا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اندر جیت برآمدے میں کرسی پر بیٹھا تھا اس کے اردگرد چند رائفل بردار گارڈ بھی موجود تھے وہ نوید کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں آج تمہارا زور بازو دیکھنے آیا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ تم بہت ہمدرد بھی ہو۔ تم نے راہول کو اذیت سے نجات دلائی تھی۔ ویل ڈن۔ یہ لو خنجر میں تم سے خالی ہاتھ لڑوں گا۔" اس نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر نوید کی طرف پھینکا جسے نوید نے اٹھا کر تیزی سے اس پر وار کیا۔

اندر جیت نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور زوردار فرنٹ کک اس کے سینے پر رسید کی وہ اڑتا ہوا سا ایک طرف جا گرا وہ بمشکل اٹھا ہی تھا کہ اندر جیت نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی، اندر جیت ماہر فائٹر تھا نوید چند ہی لمحوں میں زخموں سے چور چور نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ "اسے اٹھا کر اسی کمرے میں ڈال دو۔" اندر جیت اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

دو رائفل برداروں نے اس کے بغلوں میں ہاتھ ڈالا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے میں پھینک آئے۔ راہول اس کے قریب آیا اور سہارا دے کر اٹھایا۔ "لگتا ہے تمہارا یہ حال اندر جیت نے کیا ہے۔ وہ خبیث ایسا ہی ہے۔" راہول نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

نوید رات بھر کراہتا رہا اسے زخموں کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ صبح پانچ بجے کے قریب پے در پے فائروں اور انسانی چیخوں سے فضا گونج اٹھی، کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی، دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ان کا دروازہ کھلا اور تین چار نقاب پوش رائفلیں اٹھائے اندر داخل ہوئے، راہول انہیں دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا۔ "راہول جلدی سے باہر نکلو، ہم نے یہاں موجود پانچوں افراد کو مار دیا ہے یہ نہ ہو کہ اندر جیت تک خبر پہنچ جائے اور وہ پوری قوت اور نفری سے ہم پر حملہ کردے۔" ایک نقاب پوش بولا اور راہول نے نوید کو نکلنے کا اشارہ کیا۔ باہر بھی ان کے دو ساتھی موجود تھے وہ گھوڑوں پر آئے تھے نوید اور راہول بھی ایک گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ان کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

شام کے قریب وہ ایک جنگل میں داخل ہوئے یہ وہی جنگل تھا جہاں اس کی ملاقات تندنی سے ہوئی تھی لیکن راہول اور اس کے ساتھی رکے نہیں۔ کئی گھنٹوں بعد وہ جنگل پار کرکے ایک پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئے۔ پہاڑ کے اوپر کافی بلندی پر ایک کشادہ غار تھا۔ یہ سرنگ کی طرح کافی طویل بھی تھا۔ یہ غار ان کا ٹھکانہ تھا۔ راہول سمیت اس کے ساتھیوں کی تعداد تیس کے قریب تھی۔ راہول کے ساتھیوں نے روشنی کے لئے لکڑیاں جلائی تھیں اور چہروں سے نقاب ہٹا دیئے تھے۔ راہول نے نوید کو اپنے ساتھیوں سے متعارف کروایا۔ اور پھر نوید کے ہمراہ غار کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ "راہول پتہ نہیں ظالموں نے تندنی کا کیا حال کیا ہوگا؟" نوید فکرمند لہجے میں بولا۔

"گھبراؤ مت بھگوان بھلی کرے گا سوچنے اور فکرمند ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا اور ہمارے ساتھ مل کر ان ظالموں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

وہ رات انہوں نے اسی غار میں بسر کی۔ صبح راہول کے ساتھی غار سے نکلے جنگل سے شکار کر لائے۔ "نوید آج سے تمہاری ٹریننگ شروع۔" پیٹ پوجا کے دو گھنٹے بعد راہول نے کہا اور اپنے ساتھی گوند کے کان میں سرگوشی کی، کچھ دیر بعد گوند ایک مضبوط تھیلے میں ریت بھر لایا۔ اس تھیلے کو رسی کی مدد سے سینڈ بیگ کی طرح لٹکا دیا گیا۔

"ہاں تو نوید فرض کرو یہ سینڈ بیگ تمہارا دشمن ہے، لاتوں اور گھونسوں سے اس کا مقابلہ کرو، لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا۔ پنچ یا کک مارتے وقت جسم سے زیادہ اپنی ذہنی صلاحیت استعمال کرنی ہے۔" وہ اسے پنچ کے نت نئے طریقے سکھانے لگا، شروع شروع میں اسے دشواری ہوئی

لیکن اپنی ذہانت اور لگن سے وہ جلد ہی سیکھتا چلا گیا۔ ان دنوں وہ جنون میں مبتلا تھا۔ گھنٹوں سینڈ بیگ پر مصروف رہتا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے خون رسنے لگتا، مگر وہ اس وقت تک نہیں رکتا جب تک تھک نہیں جاتا۔ وہ کئی کئی میل دور پیدل ننگے پاؤں بھاگتا۔ راہول اسے سیلف ڈیفنس کے ساتھ ساتھ اسلحے کا استعمال بھی سکھاتا رہا۔ وہ مہینہ بھر اس غار میں روپوش رہے، پھر ایک روز راہول نے کہا۔ ''ہمیں شانتی نگر جانا چاہیے وہاں ہمارے دیگر ساتھی بھی ہیں۔''

وہ اسی روز روانہ ہوگئے، شانتی نگر پہاڑ کے دوسری طرف چند کوس دور تھا۔ ایک پرانی سی عمارت ان کا ٹھکانہ تھی یہاں بھی پندرہ بیس راہول کے ساتھی موجود تھے۔ شانتی نگر نچلی ذات کے ہندوؤں اور چند مسلمان گھرانوں پر مشتمل بستی تھی۔ یہاں بھی نوید کے معمولات وہی تھے، سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور بھاگنے کے علاوہ اسٹمنا ایکسائز کرتا۔ وہ اکثر راہول کے ساتھیوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ ان سے کہتا وہ اسے ماریں ان کے انکار پر ضد کرتا اور ان سے مار کھاتا رہتا، راہول بھی اس کا جنون دیکھ کر حیران ہو چکا تھا، وہ جو اس کا شاگرد تھا۔ اب اس سے دو ہاتھ آگے بڑھ چکا تھا۔ اب اسے درد چوٹ یا اذیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی جلد بدنما اور بھدی ہو چکی تھی۔ راہول اسے مذاق سے آئرن مین کہنے لگا تھا۔

جو کئی سالوں میں نہیں سیکھ سکا تھا وہ مہینوں میں سیکھ چکا تھا۔ اسے نندنی سے بچھڑے کافی عرصہ بیت چکا تھا وہ بعض اوقات سوچتا نندنی زندہ بھی ہے یا اسے کشوری لال نے مار ڈالا ہے۔ پھر اسے یاد آیا کشوری لال نے کہا تھا کہ اسے اماوس کی رات بلی چڑھائے گا، اس نے اماوس کی رات کے بارے میں راہول سے استفسار کیا جس نے اسے بتایا۔ ''اماوس کی رات میں تقریباً پندرہ دن رہتے ہیں۔''

وہ مضطرب ہوگیا گویا پندرہ دن بعد نندنی اپنی زندگی سے محروم ہو جائے گی۔ اس روز راہول اپنے ساتھیوں کے ساتھ شانتی نگر سے گیا ہوا تھا۔ عمارت میں راہول کے آٹھ نو ساتھی اور نوید موجود تھے۔ نوید معمول کے مطابق علی الصبح عمارت سے باہر نکلا اور ننگے پاؤں پتھریلی زمین پر بھاگتا رہا۔ گھنٹے بعد وہ واپس عمارت میں لوٹا۔ وہاں سکوت چھایا ہوا تھا۔ شاید راہول کے ساتھی اب تک سوئے ہوئے تھے۔

نوید کا کمرہ سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا ششدر رہ گیا۔ بیڈ پر مہاراج کشوری لال آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر ونود شرما ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ ''کیا ہوا بالک ہمیں دیکھ کر پریشان کیوں ہوگئے۔'' کشوری لال نے اسے سرخ آنکھوں سے گھورا۔

''تم دونوں یہاں کیسے پہنچے؟'' نوید نے پوچھا۔

''میرا نام کشوری لال ہے میرے لئے فاصلے دیواریں اور مقفل دروازے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، میں مہان ہوں، دنیا کے جس کونے میں چاہوں منٹوں میں پہنچ جاتا ہوں اور جسے چاہوں منٹوں میں ہزاروں میل دور لے جاسکتا ہوں، اماوس کی رات قریب ہے، میں نے سوچا تمہیں بھی کالی کے قدیم مندر میں لے چلوں تاکہ تم اپنی آنکھوں سے اپنی پریمیکا نندنی کا انت دیکھ سکو۔'' کشوری لال سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں پہلے والا نوید نہیں اب مجھے میری مرضی کے خلاف لے جانا تمہارے بس کی بات نہیں، باقی رہا نندنی کی زندگی کا سوال تو زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے، میں اسے اماوس کی رات سے پہلے تمہاری قید سے آزاد کروا کر اپنے ملک لے جاؤں گا۔'' نوید نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''سوچ لو بالک یہ تمہاری بھول ہے تم ہماری شکتی کے بارے میں نہیں جانتے۔'' کشوری لال ہنسا۔

''نہیں مہاراج اس جیسے معمولی انسان کے لئے آپ جیسی مہان ہستی کو کشٹ اٹھانے کی ضرورت نہیں اس کے لئے میں ہی کافی ہوں۔'' ونود شرما نے کہا اور برق سرعت سے اٹھ کر اس کے چہرے پر گھونسہ مارا، نوید نے داہنی کلائی سے بلاک کیا اور زوردار فرنٹ کک اس کے سینے پر رسید کی ونود شرما پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ نوید نے اچھل کر جمپ سائیڈ کک ماری۔ ونود شرما پشت پر موجود دیوار سے ٹکرایا اور اس تیزی سے واپس پلٹا جیسے اس کے جسم میں اسپرنگ فٹ ہوں۔ اس نے پلٹتے ہی کئی لاتیں

اور گھونسے نوید کے جسم پر برسائے۔ یہ آہنی ضربات تھیں جو نوید نے اپنے جسم پر سہیں اس کے جبڑے سے خون رسنے لگا تھا۔ لیکن اس پر ان ضربات کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، وہ دھاڑتا ہوا ونود شرما پر پل پڑا۔ اس کے جوڈو کراٹے زور کی پنچ سے ونود شرما کے ناک کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

ونود شرما نے جب دیکھا کہ وہ خالی ہاتھ نوید کو زیر نہیں کرسکتا تو اس نے ہولسٹر سے پسٹل نکال لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا نوید کے پاؤں کی اپرپام اس کے پسٹل والے ہاتھ سے ٹکرائی اور پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی دھما چوکڑی سے کمرے میں رکھی لکڑی کی کرسی سمیت کئی چیزیں ٹوٹ چکی تھیں، ان کے لڑائی جھگڑے اور شور وغل سے راہول کے ساتھی رائفلیں لے کر کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ نوید نے چیختے چنگھاڑتے ہوئے انہیں مداخلت سے روکا۔ ونود شرما نے مار کھا کر پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال لیا اور نوید پر پے در پے کئی وار کئے نوید پیچھے ہٹ کر خود کو بچاتا رہا اور نیچے پڑی ٹوٹی ہوئی کرسی اٹھالی اس نے ونود شرما کے کئی وار ٹوٹی ہوئی کرسی پر روکے اور ایک موقع پر ونود شرما کی ٹانگوں کے بیچ فرنٹ کک ماری ونود شرما کورع کے بل جھکا خنجر ہاتھ سے نکل گیا جسے نوید نے اٹھالیا اور سنبھل کر آگے بڑھتے نوید شرما کی طرف پھینکا، خنجر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا وہ چیختا ہوا گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

مہاراج کشوری لال یہ تو گیا کام سے اب تمہارا کیا ہوگا؟'' نوید نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''مورکھ تم نادان ہو، کشوری لال کی شکتی کو نہیں جانتے۔'' کشوری لال نے معنی خیز لہجے میں کہا اور کچھ پڑھ کر ایک طرف پھونکا۔

دوسرا ہی لمحہ ناقابل یقین تھا، درجنوں کی تعداد میں چھوٹے قد کی عجیب خلقت مخلوق سے کمرہ بھر گیا۔ یہ مخلوق ریچھ سے مشابہت رکھتی تھی۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن لمبے لمبے اور دانت ہونٹوں سے باہر تھے۔ وہ کریہہ انداز میں چیختے ہوئے راہول کے ساتھیوں پر پل پڑے۔ انہوں نے فائرنگ کی لیکن گولیاں اس خوفناک مخلوق پر بے اثر تھیں، کچھ نوید کی طرف لپکے جو اس صورت حال سے بوکھلا چکا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے عجیب مخلوق کے ہاتھوں راہول کے ساتھیوں کو لہولہان ہوتے دیکھ لیا تھا۔

نوید نے اپنے دفاع کے لئے بے اختیار مٹھیاں کھول کر ہاتھ چہرے پر رکھے کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا یہ مخلوق راہول کے ساتھیوں کے چہرے پر حملہ آور ہوئی تھی۔ ایسا کرنے سے انگوٹھی کے نگینے کا رخ اس مخلوق کی طرف ہوگیا۔ انگوٹھی کے نگینے سے شعاع نکلی اور اس مخلوق کے جسم پر پڑنے لگی۔ وہ شعاع جس جس مخلوق کے جسم پر پڑی اس کے جسم میں آگ لگ جاتی ان کی چیخیں بہت ہی خوفناک تھیں۔ یہ دیکھ کر نوید کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے انگوٹھی کے نگینے کا رخ بچ جانے والی اس عجیب وغریب مخلوق کی طرف کیا، چند ہی لمحوں میں اس تمام کریہہ مخلوق کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس معرکہ میں راہول کے پانچ ساتھی زندگی سے محروم ہو چکے تھے۔ ان کی خونچکاں لاشیں نیچے پڑی تھیں۔

کشوری لال کے چہرے پر حیرت کے اثرات تھے وہ اپنا وار ناکام ہوتے دیکھ کر لمحوں میں وہاں سے غائب ہوگیا۔

راہول کے زخمی ساتھیوں اور نوید نے کمرے سے اپنے ساتھیوں کی لاشیں ایک طرف کیں، شام کے قریب راہول اپنے دیگر ساتھیوں سمیت پہنچ چکا تھا، انہیں جہاں کشوری لال کے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کی موت کا دکھ تھا وہیں انہیں ونود شرما کی عبرتناک شکست اور موت کی خوشی بھی تھی، کشوری لال بھی نوید پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

جیسے جیسے اماوس کی رات قریب آتی جارہی تھی نوید کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ نندنی نامی اس معصوم لڑکی کی زندگی خطرے میں تھی۔ جسے نوید سچے دل سے چاہنے لگا تھا اسے راہول اور اس کے ساتھیوں سے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ نندنی کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے۔ جے چند علاقے کا طاقتور ترین حکمران تھا۔ افرادی قوت کے علاوہ اس کے پاس اسلحے کی بھی کمی نہ تھی۔

اماوس کی رات میں ابھی دو دن رہتے تھے، وہ نصف شب کے قریب راہول کے ٹھکانے سے باہر نکلا اور راہول

کے اصطبل سے ایک گھوڑا نکال کر روانہ ہوگیا۔ اس کا واحد ہتھیار راہول کا دیا ہوا پسٹل تھا جو اس کے نیفے میں اڑسا ہوا تھا اور پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر تھا۔

وہ آندھی اور طوفان کی طرح گھوڑا دوڑاتا رہا۔ وہ راستے میں چلتا رکتا سہ پہر کے وقت وہاں پہنچ گیا۔ راہول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ رہنے کے دوران وہ شیو کرنا ترک کرچکا تھا۔ اب بڑھی ہوئی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ اسے شناخت کرنا آسان نہ تھا۔ وہ شام تک مختلف گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا۔

شام کے قریب ایک مندر میں داخل ہوا، ایک طرف چند پجاری باتوں میں مصروف تھے ان کے قریب کچھ نوجوان بھی بیٹھے تھے، نوید بھی ان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے یا انہوں نے بھی اسے اس علاقے کا فرد سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا ایک پجاری پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ "آج کشوری لال مہاراج اس اپرادھی لڑکی کو بلی چڑھائیں گے، اس کا اپرادھ بہت بڑا ہے ہندو ہونے کے باوجود ایک مسلے سے پریم کررہی تھی۔ کشوری لال کا کہنا ہے کہ یہ لڑکی جنم جنم کی اپرادھی ہے۔ اگر زندہ رہی تو اس ریاست کے ہر فرد پر قہر ٹوٹ پڑے گا۔"

وہ کچھ دیر اسی قسم کی اشتعال انگیز گفتگو کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کشوری لال کا قریبی ساتھی ہے، کچھ دیر بعد وہ سب اٹھے اور اپنے چہروں پر بھبھوت ملنا شروع ہوگئے، نوید بھی ان میں شامل ہوگیا، چہرے پر بھبھوت ملنے سے وہ بھی ان میں سے ایک لگنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پیدل ہی ایک سمت چل دیئے۔ نوید بھی خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیا۔

کالی کے قدیم مندر تک پہنچتے پہنچتے یہ قافلہ تیس چالیس افراد تک پہنچ چکا تھا، ان میں کثیر تعداد پجاریوں کی تھی، یہ کافی بڑا مندر تھا۔ مندر کے ہال میں بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے، نوید ایک کونے میں خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔

اچانک ایک نوجوان تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ اس نے مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر بھبھوت مل رکھا تھا۔ "کیوں پریشان کھڑے ہو؟" وہ نوید کو غور سے دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"نہیں...... میں پریشان نہیں۔" نوید گھبرا گیا۔

"تم مجھے مسلمان دکھائی دیتے ہو، پرنتو کالی کے اس مندر میں کیا کررہے ہو؟" نوجوان کے آہستگی سے کہے گئے دوسرے جملے پر وہ حیرت سے اچھل پڑا اور سوچنے لگا۔ "کیا یہ مجھے پہچان چکا ہے اگر یہ درست تھا تو یہ بڑی خطرناک بات تھی۔" وہ نندنی کو بچانے آیا تھا اور خود بھی مارا جاتا۔

"کیا ہوا دوست اتنی جلدی بھول گئے۔" اس بار وہ اپنی اصل آواز میں بولا اور نوید ششدر رہ گیا یہ آواز سو فیصد زاہد آفریدی کی تھی، نوید نے اسے بغور دیکھا۔ اسے اس میں زاہد آفریدی کی مشابہت نظر آئی۔ "تت تم زاہد آفریدی تم زندہ ہو۔" نوید کا ذہن زلزلوں کی زد میں آچکا تھا۔

وہ اپنی آنکھوں سے زاہد آفریدی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوتے دیکھ چکا تھا پھر اس کی نظروں کے سامنے گاڑی کے پیٹرول ٹینک میں آگ لگی تھی اور گاڑی شعلوں کی زد میں آچکی تھی۔ "یہ وقت ان باتوں کا نہیں مختصر الفاظ میں بتاؤ تم پر کیا گزری کچھ میں یہاں کے لوگوں سے جان چکا ہوں۔" زاہد آفریدی بولا اور نوید نے اسے دھیمی آواز میں اپنی کتھا سنا ڈالی۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے سنتا رہا۔

"سنو ابھی بلی دینے میں کافی وقت ہے۔ میں معلومات حال کرچکا ہوں، بلی کی رسم نصف شب کے قریب ادا کی جائے گی، تم یہیں ٹھہرو، میں ضروری کام سے جارہا ہوں، اور ہاں میرے آنے سے پہلے کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ یہاں کشوری لال کے عقیدت مند درجنوں کی تعداد میں ہیں، اس کے علاوہ جے چند کے کارندے بھی ہیں۔ اگر انہیں تمہاری بھنک بھی پڑگئی تو تمہاری تکہ بوٹی کردی جائے گی۔" زاہد آفریدی نے اسے سمجھایا اور وہاں سے کھسک گیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا نوید کی تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

رات دس بجے کے قریب پجاریوں کا ایک گروپ مندر میں داخل ہوا، ان کی کلائیوں پر چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں

بندھی ہوئی تھیں اور وہ رقص کرتے ہوئے مندر میں داخل ہورہے تھے، جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا ان کے رقص میں تیزی آتی جارہی تھی، رات گیارہ بجے کے قریب کشوری لال اندر داخل ہوا۔ اندر جیت اس کے ساتھ سینہ تانے چل رہا تھا، ان کے پیچھے چند رائفل بردار تھے جنہوں نے نندنی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اسے کالی کے قد آور بت کے قریب لے جایا گیا۔

دو پجاریوں نے اسے کالی کے چرنوں میں لٹا دیا۔

ایک گرانڈیل پجاری تیز دھار خنجر لے کر نندنی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ کشوری لال نے بلند آواز سے اشلوک پڑھنا شروع کردیا۔ رقص کرنے والے پجاریوں کے رقص میں تیزی آچکی تھی۔ نوید کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "کشوری لال جیسا انتہا پسند پجاری نندنی کی جان کے درپے تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے سیٹھ ساجد اور کاشان نے اس کے ماں باپ کو قتل کردیا تھا اس موقع پر بھی وہ کچھ نہیں کرسکا تھا، کیا آج بھی نندنی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ان انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھتا رہے گا۔"

زاہد آفریدی اب تک غائب تھا۔ مندر میں کشوری لال جے چند اور اس کے درجنوں کارندے موجود تھے، وہ کوئی فلمی ہیرو نہیں تھا کہ اکیلا ہی تن تنہا درجنوں افراد کو مار کر نندنی کو بچا لیتا۔

نصف شب کے قریب کشوری لال نے با آواز بلند کہا۔ "بلی کی رسم ادا کی جائے۔"

گرانڈیل پجاری نے ایک ہاتھ سے نندنی کے سر کے بال پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

نوید کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ اس کے پسٹل میں چند گولیاں تھیں اس نے سوچا۔ "نندنی کو بے بسی سے مرتے دیکھنے سے بہتر ہے چند افراد کو مار کر خود بھی ان کے ہاتھوں مارا جائے۔" اس نے پسٹل نکالنے کے لئے اپنا ہاتھ نیفے میں ڈالا ہی تھا کہ ہال میں ایک تیز آواز گونجی۔ "کشوری لال اور جے چند تمہارا کھیل اب ختم ہوچکا ہے اب میری باری ہے اس لڑکی کو چھوڑ دو۔"

جے چند اندر جیت، راجیش اور کشوری لال سمیت سب نے مڑ کر ہال کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں زاہد آفریدی موجود تھا، اس نے ایک لڑکی کو جکڑ رکھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ لڑکی کی گردن پر تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں موجود پسٹل کی نال لڑکی کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر سخت خوف وہراس تھا۔ یہ لڑکی جے چند کی بیٹی لکشمی تھی۔

ایک رائفل بردار نے اپنی رائفل سیدھی کرنا چاہی۔ زاہد آفریدی نے برق سرعت سے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر دبادیا۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی، وہ بنا کوئی آواز نکالے مردہ چھپکلی کی طرح گرا، زاہد آفریدی کے پسٹل کی نال دوبارہ اس کی کنپٹی سے آلگی تھی۔ "تم لوگوں نے میرا نشانہ دیکھ لیا ہے اب کسی نے غلط حرکت کی تو دوسری گولی لکشمی کے سر میں چھید کردے گی۔"

"سب اپنے ہتھیار پھینک دو۔" جے چند کے اشارے پر اس کے کارندوں نے رائفلیں پھینک دیں۔

کشوری لال کا چہرہ فرط غم سے تاریک ہوچکا تھا، زاہد آفریدی۔ "بساط کا رخ پلٹ چکا تھا۔"

نوید نے نیچے پڑی ایک رائفل اٹھائی خنجر بردار پجاری کو دھکیل کر نندنی کو سنبھالا اور زاہد آفریدی کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"جے چند اور کشوری لال کان کھول کر سن لو۔ ہم لکشمی کو بطور ضامن ساتھ لے جارہے ہیں، کچھ دور جاکر اسے چھوڑ دیں گے لیکن اگر ہمارا پیچھا کیا گیا یا کوئی شرارت ہوئی تو ہم جان سے تو جائیں گے لیکن لکشمی بھی نہیں بچے گی۔"

لکشمی کو گن پوائنٹ پر لئے ہوئے وہ مندر سے باہر نکلے۔ زاہد آفریدی نے بڑے ٹائروں والی جیپ منتخب کی، وہ پچھلی نشست پر لکشمی اور نندنی سمیت بیٹھ گیا۔ جب کہ ڈرائیونگ سیٹ نوید نے سنبھال لی۔ اسی وقت ایک دراز قد نوجوان ہاتھوں میں رائفل لئے آگے بڑھا۔ "شرجیل پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ہمیں کور دو، زاہد آفریدی نے کہا اور شرجیل نامی نوجوان جیپ میں سوار ہوگیا۔

کچھ دیر بعد جیپ تیز رفتاری سے ریاست سے باہر جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ "جے چند کی بیٹی کو تم نے

کہاں سے گھیرا؟" نوید نے پوچھا۔
"یار صبر کرو، کوئی مناسب جگہ آنے دو سکون سے سب کچھ بتادوں گا۔" زاہد آفریدی نے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا اب تک اسے اپنے تعاقب میں کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ انہوں نے جنگل کے قریب لکشمی کو جیپ سے اتارا اور راہول کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ نوید نے زاہد آفریدی اور نندنی کا راہول اور اس کے ساتھیوں سے تعارف کروایا، وہ زاہد آفریدی کا کارنامہ سن کر اس سے متاثر ہوئے کیونکہ وہ شیر کی کچھار میں گھس کر نندنی کو بچالایا تھا۔

راہول خوش ہونے کے ساتھ ساتھ فکر مند بھی تھا اس کا کہنا تھا کہ لکشمی کو یرغمال بنانے پر جے چند اور کشوری لال سخت بپھرے ہوں گے، وہ غصے میں کچھ بھی کرسکتے ہیں۔

انہوں نے شانتی نگر کی یہ عمارت چھوڑ دی اور پہاڑ میں موجود اس وسیع عریض غار میں پہنچ گئے، یہ وہی غار تھا جہاں راہول اور نوید نے فرار ہوکر پناہ لی تھی۔

دوسرے روز ان کے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ جے چند کے کارندوں نے اندر جیت کی سربراہی میں شانتی نگر پر حملہ کردیا تھا۔ وہ قتل عام کے بعد مسلمانوں اور اچھوتوں کے گھروں سے درجنوں نوجوان لڑکیوں کو اغوا کرکے لے گئے تھے ان میں راہول کی بہن بھی تھی۔ اندر جیت وہاں سے جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ میلے سے پہلے راہول نے نندنی، نوید اور اس کے ساتھیوں کو ان کے حوالے نہیں کیا تو وہ سرعام رادھا کی عزت کو پامال کردے گا۔

راہول شانتی نگر والوں سے یہ اعلان سنتے ہی سخت پریشان ہوگیا تھا۔ اس کی بہن رادھا کی عزت خطرے میں تھی لیکن وہ اتنا بے ضمیر بھی نہیں تھا کہ اپنی بہن کو بچانے کے لئے نوید اور اس کے ساتھیوں کو ان کے حوالے کردیتا۔

اس روز آدھی رات کے وقت نوید اور زاہد آفریدی خاموشی سے دو گھوڑوں پر سوار ہوکر پہاڑی علاقے سے باہر نکلے اور تیز رفتاری سے ایک طرف گھوڑے دوڑا دیئے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ خود کو اندر جیت کے حوالے کرکے رادھا کی عزت اور زندگی بچائیں گے، ان کے اس ارادے کے بارے میں صرف شرجیل اور نندنی کو خبر تھی۔

انہوں نے جنگل میں کچھ گھنٹوں کے قیام کیا اور پھر آگے بڑھ گئے وہ علی الصبح کالی کے پرانے مندر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے مندر سے کچھ فاصلے پر گھوڑے روکے اور اندر داخل ہوگئے اندر جاتے ہی ان کا سامنا ایک موٹی توند والے پجاری سے ہوا جو حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"کشوری لال سے کہو زاہد آفریدی اور نوید اس سے ملنے آئے ہیں۔" نوید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

چند منٹ بعد وہ واپس لوٹا اور انہیں ساتھ لئے ہوئے مندر کے ایک کمرے میں لے گیا۔ کشوری لال اور راجیش قالین پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ نوید نے دیکھا راجیش کو دیکھ کر زاہد آفریدی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ راجیش بھی اسے دیکھ کر پراسرار انداز میں مسکرایا تھا۔

"خوب بہت خوب گویا تم دونوں خود ہی مرنے آگئے، خیر نہ بھی آتے تو میں اپنی شکتی سے تمہیں یہاں لے آتا۔" کشوری لال ہنسا۔

"کشوری لال جب تک یہ طلسمی انگوٹھی اور لاکٹ میرے پاس موجود ہے تم مجھ پر قابو نہیں پاسکتے اور میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں ملتے ہی تمہاری شکتی میں دگنا اضافہ ہوجائے گا۔ اور تم یہ مجھ سے زبردستی لے بھی نہیں سکتے کیا! یہ بہتر نہیں کہ تم مجھ سے ایک سودا کرلو۔" نوید نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کشوری لال کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کل یہاں میلہ ہوگا اس میلے میں، میں نے سنا ہے پہلوانی کے مقابلے ہوں گے جن میں اندر جیت بھی حصہ لے گا۔ میں نے سنا ہے یہ مقابلہ کسی ایک فریق کی موت تک جاری رہتا ہے۔ میں بھی اس مقابلے میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ مقابلہ جیت گیا تو رادھا کو باعزت میرے حوالے کردیا جائے، اور ہمیں سلامتی سے یہاں سے جانے دیا جائے، اور اگر ہار گیا تو موت میرا مقدر بنے گی۔" نوید بولا۔

"لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" کشوری لال نے پوچھا۔

"اب تم نے کام کی بات کی، میں تم سے وعدہ کرتا

ہوں، ہاروں یا جیتوں مقابلے کے اختتام پر انگوٹھی اور لاکٹ دونوں چیزیں تمہارے حوالے کردوں گا، ہم دونوں میں تحریری معاہدہ ہوگا لیکن شرط یہ ہوگی کہ جیت کی صورت میں تم ہمیں رادھا سمیت عافیت سے یہاں سے جانے دو گے۔" نوید نے کہا اور کشوری لال خوشی سے اچھل پڑا اور زاہد آفریدی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

یہاں آنے سے پہلے ان کے درمیان طے ہوا تھا کہ وہ خود کو اندر جیت کے حوالے کردیں گے جبکہ نوید نے کشوری لال سے کوئی اور ہی معاملہ طے کرلیا تھا۔

اندر جیت ایک طاقتور اور ماہر فائٹر تھا نوید کے لئے اس سے جیتنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اگر وہ جیت بھی جاتا تو وعدے کے مطابق اسے دونوں طلسماتی چیزیں کشوری لال کے حوالے کرنا پڑتیں جس سے کشوری لال کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا اور انہیں کہیں بھی جائے پناہ نہ ملتی۔

"ٹھیک ہے بالک اپنا وچن یاد رکھنا تم میری شکتی سے بخوبی واقف ہو۔" کشوری لال نے کہا۔

"مہاراج میری بات کا برا مت منانا لیکن سچ تو یہ ہے کہ تم ہندوستان کے بڑبولے ہو تمہارے بارے میں نوید مجھے تفصیل سے بتاچکا ہے لیکن تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے یہ لو ہلکا سا نمونہ دیکھو لو۔" زاہد آفریدی پراسرار انداز میں مسکرایا اور زیر لب کچھ بڑبڑایا۔

دوسرا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا، ان کے سامنے تین کفن پوش مردے موجود تھے۔ وہ دوبارہ بڑبڑایا کفن پوش مردے نگاہوں سے غائب ہوگئے۔ کشوری لال کے چہرے پر حیرت جبکہ راجیش کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ یہ بات نوید نے لمحہ میں نوٹ کرلی۔

"کشوری لال تم مہا پجاری ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت جنتر منتر بھی جانتے ہو، بہت سے گندے بیر بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔ اتنا تو تم جان ہی چکے ہوگے کہ یہ روحیں ہیں، جنہیں تم آتما کہتے ہو، ایسی بہت سی روحیں میری دوست ہیں، ان کی شکتی کے بارے میں بھی تمہیں علم ہوگا اور یہ اور بات ہے کہ میں اپنے دوستوں کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔ راجیش تو میرے بارے میں بہت کچھ جانتا

ہے۔ اس کا اور میرا برسوں کا ساتھ ہے۔" زاہد آفریدی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے تم دونوں مندر ہی کے ایک کمرے میں قیام کرو۔" کشوری لال نے کہا۔ اور انہیں مندر ہی کے کمرے میں ٹھہرادیا گیا۔

"یار تم خود کو میرا دوست کہتے ہو اور آج تک اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا کہ تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟ خاص کر روحوں والا معاملہ تو بہت ہی پراسرار ہے۔" نوید نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کروگے میرے بارے میں جان کر، بس اتنا یاد رکھو کہ تم میرے دوست ہو۔" زاہد آفریدی نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"نہیں تمہیں بتانا پڑے گا کہ تمہارا ماضی کیا ہے اور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں پاکستان سے دور اتر پردیش کی اس ریاست میں آن پھنسا ہوں۔ ویسے بھی کل میرا اندر جیت سے خونی مقابلہ ہے، ہوسکتا ہے میں اس سے ہار جاؤں، اور اس مقابلے میں ہار کا مطلب موت ہے اسے میری آخری خواہش سمجھو۔" نوید نے کہا۔

"دوست میں نے آج تک اپنی کہانی کسی کو نہیں سنائی اور میں اسے دہرانا بھی نہیں چاہتا، اسے دہرانے سے میرے دل کے زخم ہرے ہوجاتے ہیں۔ لیکن میں تمہاری خواہش نہیں ٹال سکتا۔" زاہد آفریدی اپنی کہانی سنانے لگا۔ اور نوید ہمہ تن گوش ہوکر سننے لگا۔

زاہد آفریدی کا تعلق پشاور کے ایک گاؤں سے تھا۔ وہ دو بہن بھائی تھے سولہ سالہ زاہد آفریدی اور بارہ سالہ رفعت آفریدی۔ اس کے والد کمال آفریدی محکمہ پولیس کے ایس پی رینک کے آفیسر تھے۔ زاہد آفریدی بچپن ہی سے ذہین تھا لیکن وہ نفسیاتی مسئلے کا شکار تھا۔ اسے نفسیاتی معالج کے علاوہ اسے علم روحانیات کے ماہر کو بھی دکھایا گیا۔ لیکن ان کی پریشانی کا کوئی حل نہیں نکلا۔ زاہد آفریدی کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے چند ماہ سے کفن پوش مردے خواب میں نظر آنے لگے تھے ان میں عورتیں بھی ہوتی تھیں اور مرد بھی ہوتے تھے وہ کافی خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ لیکن کچھ ماہ بعد وہ ان خوابوں کا عادی ہوگیا ویسے

بھی وہ صرف دکھائی دیتے تھے ڈراتے نہیں تھے۔

ایک رات وہ سویا ہوا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے اسے کوئی پکار رہا ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نائٹ بلب کی دھیمی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے بیڈ سے کچھ فاصلے پر ایک کفن پوش مردہ کھڑا ہے۔ یہ ان ہی میں سے ایک تھا جنہیں وہ خواب میں دیکھا کرتا تھا۔ ڈر اور خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی اور اس کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ خوف کی زیادتی سے بے ہوش ہو جاتا مردے کی آواز سنائی دی۔ ''ڈرو مت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' اس کا خوف اگرچہ کم نہیں ہوا لیکن اس کے الفاظ سے کچھ حوصلہ ملا۔

''تم کون ہو؟''

''میرا نام ارجن پانڈے ہے اور میں ایک آتما ہوں۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''مگر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور اتنے عرصے سے میرے خوابوں میں کیوں آرہے ہو؟'' زاہد آفریدی نے پوچھا۔ اب اس کا ڈر قدرے کم ہو چکا تھا۔

''دیکھو میرے چھوٹے دوست! ہم بہت سی آتمائیں ہیں اور بہت مشکل میں ہیں، ہمیں اس مشکل سے تم ہی نکال سکتے ہو۔'' ارجن کی آتما نے کہا۔

''میں بھلا تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟ میں نے تو سنا تھا آتمائیں بہت طاقتور ہوتی ہیں۔ میرے پاپا ایک مشہور ہارر ڈائجسٹ پڑھتے ہیں، میں بھی کبھی ان سے چھپ کر وہ ڈائجسٹ پڑھ لیتا ہوں۔ ان کہانیوں میں آتماؤں کو بہت طاقتور دکھایا گیا ہے۔'' زاہد آفریدی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

''یہ سچ ہے پر تم اماوس کی رات کے ایک خاص لمحے میں پیدا ہوئے ہو، تم لڑکپن کی حدود میں ہو۔ پابندی سے نماز بھی پڑھتے ہو، تم ہی ہماری مدد کرسکتے ہو۔'' ارجن کی آتما نے کہا۔

''پر تمہارا معاملہ کیا ہے اور میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' زاہد آفریدی نے حیرت سے پوچھا۔ ''بھارت میں ایک مجرمانہ ذہنیت کا شخص راجیش ہے۔ اس نے درجنوں آتماؤں کو اپنے قبضے میں کررکھا ہے۔ جن سے وہ ناجائز کام لیتا ہے اور اپنا حکم نہ ماننے پر ان کو جلا کر خاکستر کرڈالتا ہے۔ ہمیں تم ہی اس کی غلامی سے نجات دلا سکتے ہو۔'' آتما نے کہا۔

''مگر میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' زاہد آفریدی نے پوچھا۔

''بتا تو رہا ہوں، تم بیچ میں مت ٹوکو۔ ہندوستان کے فلاں مندر کے تہہ خانے میں ایک دیوی کی مورتی ہے جو کہ سینکڑوں سال پرانی ہے، اس مورتی کے گلے میں ایک لاکٹ ہے، تم نے وہ لاکٹ اس مورتی کے گلے سے اتار کر سمندر کے پانی میں پھینکنا ہے اس طلسماتی لاکٹ کو سمندر کے پانی میں پھینکتے ہی ہم آتمائیں اس کے قبضے سے آزاد ہو کر پرلوک سدھار جائیں گی اور پھر راجیش کسی بھی آتما کو اپنا غلام نہیں بنا سکے گا۔ اور اس مندر تک پہنچنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں، وہاں زبردست قسم کا طلسم کیا گیا ہے۔ عام انسان تو اس مورتی کو ہاتھ لگاتے ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ یہ کام صرف تم ہی کرسکتے ہو۔'' ارجن کی آتما نے کہا۔

''پر میں وہاں اکیلا کیسے جاؤں گا اور مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ مندر اور تہہ خانہ کہاں ہے؟'' زاہد آفریدی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں پلک جھپکتے میں وہاں پہنچا دوں گا۔ ہم آتمائیں منٹوں میں جہاں چاہیں جاسکتی ہیں۔'' آتما نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں کب چلنا ہے۔'' زاہد آفریدی نے حامی بھرلی۔

''آنے والی اماوس کی رات، میں تمہارے پاس آؤں گا اور ساتھ لے چلوں گا۔'' ارجن کی آتما نے کہا۔

''کیا تم مجھے ہندوستان کی سیر کروا سکتے ہو، مجھے وہاں کے تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' زاہد آفریدی نے پوچھا۔

''کیوں نہیں میں کل رات آؤں گا، میرا انتظار کرنا۔'' آتما نے کہا اور اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

زاہد آفریدی نے اپنے بدن پر چٹکی بھری کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن تکلیف کے احساس نے اسے

بتا دیا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس نے اس آتما کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا وہ جانتا تھا اس کی بات سن کر لوگ مذاق اڑائیں گے۔ یہ تھی بھی ناقابل یقین بات کہ کوئی روح مجسم وجود میں اس کے سامنے آتی تھی۔

وہ صبح ناشتہ کرکے اسکول پہنچا اور بے تابی سے چھٹی کا انتظار کرنے لگا۔ ان دنوں وہ میٹرک میں تھا۔ چھٹی ہوتے ہی گھر چلا گیا۔ شام کے قریب ٹیوشن پڑھنے کے بعد بے قراری سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ وہ رات کا کھانا کھا کر اور عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں داخل ہوا اور اندر سے دروازہ لاک کرکے آتما کا انتظار کرنے لگا۔ رات گیارہ بجے کے قریب ایک ہیولہ سا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے انسانی شکل اختیار کرلی یہ ارجن کی آتما تھی۔ ''میرا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کرلو اور جب تک میں نہ کہوں، آنکھیں مت کھولنا۔'' آتما نے کہا اور زاہد آفریدی نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ آتما کے ہاتھ کا لمس برف کی طرح سرد تھا۔ زاہد آفریدی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے وہ روئی کے گالے کی طرح ہوا میں اڑ رہا ہو، کچھ دیر بعد آتما کی آواز سنائی دی آنکھیں کھولو اور اس نے آنکھیں کھول دیں وہ ایک خوب صورت عمارت کے سامنے موجود تھے۔

زاہد آفریدی عمارت کی خوب صورتی دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ یہ تاج محل تھا جس کی تصویریں وہ رسالوں میں متعدد بار دیکھ چکا تھا۔ ''یہ ہندوستان کا تاج محل ہے۔'' آتما نے کہا، وہ اس کا ہاتھ پکڑے تاج محل کی سیر کرانے لگا۔ وہاں موجود سیکورٹی گارڈ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس نے اپنی اس حیرت کا اظہار آتما پر کیا۔ ''جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے کوئی بھی عام انسان نہ ہی تمہیں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی تمہاری آواز سن سکتا ہے۔'' آتما نے جواب دیا۔

تاج محل کی سیر کے بعد آتما نے اسے دوبارہ آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ وہ چند گھنٹوں میں ہندوستان کے بہت سے تاریخی مقامات کی سیر کرچکا تھا۔

''اب آنکھیں بند کرلو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔'' آتما نے کہا اور زاہد آفریدی نے آنکھیں بند کرلیں اس بار بھی اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ تیز ہواؤں کے جھونکے بڑا مزہ دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے پاؤں زمین پر لگے اور آتما نے اسے آنکھیں کھولنے کو کہا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ ''دوست تم کہاں رہتے ہو؟'' زاہد آفریدی نے پوچھا۔

''ہم جب تک راجیش کے قبضے میں ہیں زمین کی گہرائی میں موجود رہنے پر مجبور ہیں اور زیادہ تر رات کو ہی نکلتے ہیں۔'' آتما نے جواب دیا۔

''میں تمہارا ٹھکانہ دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہارے دوسرے ساتھیوں سے ملنا چاہتا ہوں۔'' زاہد آفریدی بولا اور آتما نے کہا۔ ''کل تک تم مجھ سے ڈرتے تھے اور اب میرے ساتھیوں سے بھی ملنا چاہتے ہو۔''

''اب مجھے تم سے ڈر نہیں لگتا تم میرے دوست جو ہو۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ٹھیک ہے کل میں دوبارہ آؤں گا۔'' ارجن کی آتما وعدہ کرکے غائب ہوگئی۔

ارجن کی آتما حسب وعدہ دوسرے روز گیارہ بجے رات کو آئی اور کہا۔ ''میرا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کرلو۔'' زاہد آفریدی نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کرلیں۔ اسے پہلے کی طرح ایک جھٹکا لگا اور پھر اس کا جسم ہوا میں اڑنے لگا، کچھ دیر بعد اس کے پاؤں زمین سے ٹکرائے اس بار اس نے آتما کے کہنے سے پہلے اپنی آنکھیں کھول دیں وہ ایک مرگھٹ میں موجود تھے۔ ''اب اپنی آنکھیں دوبارہ بند کرلو۔'' آتما نے کہا اور زاہد آفریدی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر وہ سیدھے پرواز کرتے رہے پھر اسے لگا کہ وہ سیدھے پستی میں اتر رہے ہوں ان کا یہ سفر کافی دیر جاری رہا۔ اس نے جب آتما کے کہنے پر آنکھیں کھولیں تو وہ خوفزدہ ہوگیا وہ ایک اندھیری غار نما جگہ تھی۔ جہاں سرنگوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد درجنوں کی تعداد میں آتمائیں موجود تھیں، ان میں لڑکیاں بھی تھیں مرد بھی تھے نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی چند آتمائیں اس قدر خوفناک تھیں کہ وہ انہیں دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ اور نظریں پھیر لیں۔ ایک خوب صورت لڑکی چلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ ''یہ لگتا ہے یہ بھی راجیش کی غلام ہے۔''

ارجن کی آتما نے لڑکی کا تعارف کروایا۔

وہ ان سے جلد ہی گھل مل گیا۔ آتمائیں اس بات پر بہت خوش تھیں کہ وہ انہیں راجیش کی غلامی سے نجات دلانے والا ہے۔ کچھ دیر بعد ارجن کی آتما اسے اس کے گھر چھوڑ آئی۔

پھر کچھ دنوں تک اس کے پاس کوئی آتما نہیں آئی۔

کچھ روز بعد وہ سویا ہوا تھا کہ کسی کے پکارنے پر اٹھا اس نے آنکھیں کھول دیں اس کے سامنے ارجن کی آتما کھڑی تھی، گنگا نامی خوب صورت لڑکی کی آتما بھی اس کے قریب موجود تھی۔ ”میرے دوست آج اماوس کی رات ہے چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ ارجن کی آتما نے کہا اور زاہد آفریدی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے کسی پرندے کی طرح خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں زمین سے لگ چکے ہیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں وہ مندر کے قریب موجود تھے۔ نصف شب کے قریب اس جگہ مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ بہت ہی قدیم مندر تھا۔ وہ اس جگہ آ تو گیا تھا لیکن اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ ”ڈرو مت تمہیں کچھ نہیں ہوگا، تمہیں اس قبر تک تنہا پہنچنا ہے۔“ ارجن کی آتما نے کہا اور وہ ان کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ زاہد آفریدی کے رہے سہے اوسان خطا ہونے لگے۔ ایسے میں اسے ارجن کے الفاظ نے حوصلہ دیا۔ جو کہہ رہا تھا۔ ”حوصلہ رکھو دوست یہ آخری مرحلہ ہے۔ لاکٹ مورتی کے گلے میں ہے۔“

ان کی قسمت اچھی تھی چاند پورا نکل چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں عجیب ساخت کا لاکٹ اس کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

”شاباش اب جلدی سے باہر آ جاؤ۔“ ارجن کی آتما نے کہا اور زاہد آفریدی مندر کے تہہ خانہ سے باہر آ گیا۔ ”اب میرا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کر لو۔“ ارجن کی آتما نے کہا اور زاہد آفریدی نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھیں موند لیں کچھ دیر بعد وہ ساحل سمندر پر کھڑے تھے۔ اس لاکٹ کو جلدی سے سمندر میں پھینک دو۔“ ارجن کی آتما نے کہا اور زاہد آفریدی نے آگے جا کر لاکٹ سمندر کے پانی میں پھینک دیا۔

ایک بار پھر پراسرار چیخیں بلند ہوئیں اور خاموشی چھا گئی۔ ”تمہارا شکریہ میرے دوست! تم نے ہم آتماؤں پر احسان کیا ہے۔ لیکن ہم بھی تمہیں نہیں بھلائیں گے، جب بھی کبھی کسی مشکل پھنس جاؤ تو صرف ہولے ہولے بڑبڑانا اور کہنا۔ ”میری دوست آتماؤں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ ہم فوراً پہنچ جائیں گے اور تمہاری ہر مشکل میں مدد کریں گے۔ ہاں البتہ ہم تمہیں موت سے نہیں بچا سکتے کیونکہ ہر انسان کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور کبھی بنا اشد ضرورت کے ہمیں مت بلانا کیونکہ پرلوک سے آتے وقت آتما کو بہت کشٹ اٹھانا پڑتا ہے۔“ ارجن کی آتما نے کہا اور پھر اسے اس کے گھر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

وقت کبھی ٹھہرتا نہیں۔ چلتا رہتا ہے، زاہد آفریدی اپنی محنت اور لگن سے تعلیمی میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتا چلا گیا۔ وہ ایک روز اپنے کمرے میں موجود تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیور اٹھایا اور بولا۔ ”تم کون ہو؟“ اور اس وقت فون کرنے کا مقصد؟“ زاہد آفریدی نے پوچھا۔

”کافی ذہین ہو رہا یہ سوال کہ میں کون ہوں تو تم پر کافی پرانا ایک قرض تھا جسے تم سے وصول کرتا تھا۔“ دوسری طرف سے معنی خیز لہجے میں کہا گیا۔

”کیسا قرض؟“ زاہد آفریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں راجیش ہوں یاد کرو تم نے مندر سے مورتی کے گلے سے راکٹ نکال کر سمندر میں پھینکا تھا جس کی وجہ سے میری غلام آتمائیں آزاد ہو گئیں اور میں ایک عام انسان بن کر رہ گیا۔ اب میں زندگی بھر کسی آتما کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔“

راجیش کی بات سے زاہد آفریدی کو اپنی دوست آتمائیں یاد آ گئیں اور وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”بڑے عرصے بعد میری یاد آئی۔ اس وقت میں اتنا طاقتور نہیں تھا۔ جتنا اب ہوں تمہیں اپنی بہن تو یاد ہوگی جو فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے وہ اس وقت میرے پاس ہے۔“ دوسری طرف سے راجیش نے کہا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ زاہد آفریدی چیخا اور گاڑی کو سائیڈ پر کر کے روک دیا۔

”یقین نہیں آیا لو اپنی بہن سے بات کر لو یہ اپنا نام رفعت آفریدی بتا رہی ہے۔“ راجیش نے کہا۔ کچھ لمحوں بعد

رفعت آفریدی کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”بھائی مجھے ان درندوں سے بچاؤ یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔“

”رفعت کہاں ہو تم؟ اور یہ کون لوگ ہیں؟“

”بھائی یہ بڑے ظالم لوگ ہیں یہاں ہر طرف ہجڑے ہی ہجڑے ہیں۔“ پھر رفعت کی چیخ اور تھپڑ کی آواز سنائی دی اور پھر راجیش کی آواز ابھری۔ ”سنو بالک! یہ کوئی معمولی ہجڑے نہیں، میرے تربیت یافتہ ہیں، میں نے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھا دی ہے کہ اگر یہ جوان لڑکیوں کی بلی دیتے رہے تو اگلے جنم میں ہجڑے نہیں ہوں گے مرد یا عورت کے روپ میں پیدا ہوں گے، آج تمہاری بہن کی بلی دی جائے گی۔“ راجیش نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

زاہد آفریدی نے کال بیک کی مگر نمبر آف ملا۔ اس نے فون پر کمال آفریدی کو رفعت کے اغوا کی اطلاع دی اور راجیش کا نمبر بتایا پولیس نے نمبر ٹریس کرنے کی کوشش کی مگر یہ نمبر رجسٹرڈ نہیں تھا نمبر آف ہونے کی وجہ سے وہ اس فون کا لوکیشن بھی چیک نہیں کروا سکتے تھے۔

دوسرے روز ایک ویران مقام سے رفعت آفریدی کی گلا کٹی لاش ملی۔ کمال آفریدی نے راجیش نامی شخص کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیئے۔ وہ تو نہیں ملا لیکن کچھ روز بعد جب کمال آفریدی اپنی گاڑی پر گھر آ رہے تھے۔ راستے میں دو موٹر سائیکل سواروں نے ان پر فائرنگ کی وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ ماں بیٹی کے بعد شوہر کا صدمہ سہہ نہ سکی اور ہارٹ اٹیک سے مر گئی۔ زاہد آفریدی کی دنیا اندھیر ہوئی وہ دن رات گھر پر پڑا رہتا۔ دن رات بستر پر بھوکا پیاسا پڑا رہنے سے اور ذہنی ٹینشن سے اسے بخار ہو گیا۔ پہلے تو وہ دم سادھے لیٹا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا بخار بڑھتا جا رہا ہے تو وہ اٹھا اور گھر سے باہر نکلا۔ گاڑی چلانے کی ہمت نہیں تھی، ڈر تھا کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔ وہ پیدل ہی ایک طرف چل پڑا، بخار اس قدر تیز تھا کہ اس سے چلا بھی نہ جا رہا تھا۔ اسے چکر آ رہے تھے۔ ایک جگہ وہ چکرا کر سڑک پر گرا۔ کچھ دیر بعد بمشکل اٹھا اور ایک طرف چلنے لگا۔ اچانک ایک گاڑی کے بریک چرچرائے اور ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”زاہد آفریدی رکو۔“ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے قریب نئے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سمیرا بیٹھی تھی۔ سمیرا اس کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ کالج میں اسے اسٹوڈنٹ مس ورلڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ناصر درانی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جو ملک کے مانے ہوئے بلڈرز تھے۔ اس کے علاوہ گارمنٹس فیکٹریز اور بہت سے دیگر کاروبار بھی ان کے تھے۔ انٹرنیشنل سرکل میں بھی ان کا ایک نام تھا۔ سمیرا اس قدر دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود سادہ لوح اور اچھی لڑکی تھی۔ اس نے دوران تعلیم کسی لڑکے کو بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اگر کوئی اس کی طرف بڑھنے کا سوچتا بھی تو اس کا رویہ ان کی حوصلہ شکنی کر دیتا۔

”آؤ بیٹھو۔“ سمیرا نے کہا اور زاہد آفریدی دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔

”تم ڈگمگاتے ہوئے چل رہے تھے خیریت تو ہے اور تمہاری آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔“ سمیرا نے گاڑی چلاتے ہوئے اس کی کلائی تھامی۔

”اوہ! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ میں تمہیں اسپتال لے چلتی ہوں۔“ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ غنودگی میں بولا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ وہ بخار کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا، قریب ہی سمیرا بیٹھی تھی، ایک اسمارٹ سا ڈاکٹر بھی قریب موجود تھا۔ ”کیسے ہو؟“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم پورے پانچ گھنٹے بعد ہوش میں آئے ہو، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مس سمیرا تمہیں فوراً یہاں لے آئیں۔“

شام کے قریب ڈاکٹرز نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ سمیرا نے اسے نہ صرف اس کے گھر چھوڑا بلکہ ایک ریسٹورنٹ سے اس کے لئے کھانا اور کافی بھی لے گئی۔ ”اپنا خیال رکھنا اور دوا ٹائم پر لینا۔ میں کل صبح تمہارا پتہ کرنے دوبارہ آؤں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

سمیرا صبح نو بجے ہی پہنچ گئی۔ وہ کسی ریسٹورنٹ سے اس کے لئے ناشتہ بھی لائی تھی۔ ”سمیرا تم بلاوجہ میرے لئے پریشان ہو رہی ہو۔“ زاہد آفریدی نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

”حالت دیکھی ہے اپنی، بڑھی ہوئی شیو، میلے کچیلے کپڑے چلو اٹھ کر نہاؤ اور کپڑے بدل لو بلکہ شیو بھی کر لینا۔“ اس نے ناشتہ کرنے کے بعد اسے باتھ روم کی طرف دھکیلا۔ وہ اس کی بے تکلفی پر حیران ہوتا ہوا باتھ روم سے کافی دیر بعد نکلا تو سمیرا اسے دیکھتی رہ گئی۔ ”اب تم پہلے سے بھی زیادہ ہینڈسم لگ رہے ہو۔“ سمیرا نے کہا اور پھر خود ہی شرما گئی۔

”تھینکس تم نے میری بہت ہیلپ اور کیئر کی۔“

”زاہد آفریدی دوستوں کا شکریہ نہیں ادا کیا جاتا لیکن تم اتنے پریشان کیوں ہو اور انکل آنٹی کہاں ہیں۔“

زاہد آفریدی نے اسے اپنی روداد سنا ڈالی۔

”اوہ ویری سیڈ!“ وہ اس سے اظہار افسوس کرنے لگی، وہ چند گھنٹے اس کے ساتھ رہی پھر گھر چلی گئی، پھر وہ روزانہ آنے لگی، زاہد آفریدی سمیرا کی خود میں دلچسپی بھانپ چکا تھا۔ وہ خود بھی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ لیکن وہ ڈرتا تھا کہ سمیرا کا تعلق ہائی سوسائٹی سے تھا جبکہ وہ خود متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ آخر ایک روز اس نے سمیرا سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے روز جب سمیرا حسب معمول آئی اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی تو وہ بولا۔ ”سمیرا تم جانتی ہو، میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے اور یہ بھی دیکھ چکا ہوں کہ شاید تم مجھے پسند کرنے لگی ہو، یہ نہ ہو کل تمہیں پچھتانا پڑے۔“

”زاہد میں تمہیں کالج کے زمانے سے پسند کرتی ہوں لیکن ان دنوں میں زیر تعلیم تھی۔ اس روز تمہیں سڑک پر ناگفتہ حالت میں دیکھ کر خود پر قابو نہ پا سکی مجھے دولت نہیں تمہارا ساتھ چاہئے۔“

زاہد آفریدی مسکرایا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں پر ڈرتا تھا کہ میں ایک متوسط گھرانے کا بے روزگار نوجوان ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگا۔

سمیرا نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ ”سمیرا آئی لو یو۔“ وہ اسے سینے سے لگا کر بولا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے سمیرا کے جذبات میں ہلچل سی مچ گئی، زاہد آفریدی اسے خود سے لپٹائے بیڈ کے قریب لے آیا اور نرمی سے بیڈ کے کنارے بیٹھا دیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ سمیرا کی پیشانی پر رکھے پھر اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں کو چوما پھر رخسار تک پہنچا، رخساروں کو چومنے کے بعد وہ اس کی لب جان تک آگیا۔ سمیرا تڑپی اور بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ تو اس نے اسے بانہوں میں جکڑا۔

”پلیز چھوڑ دو! مجھے کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔“ سمیرا اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے خمار آلود لہجے میں بولی۔

وہ دونوں یک جان دو قالب ہوئے کھڑے تھے۔ اسے سمیرا کے دل کی دھڑکن بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ وہ خود بھی بے قابو ہونے لگا تھا کہ بمشکل خود پر قابو پا کر سمیرا سے الگ ہو گیا۔ ”تم موسم کی طرح بدل تو نہ جاؤ گی اگر ایسا ہوا تو میں مر جاؤں گا۔“ اس نے کہا اور سمیرا نے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا جسے زاہد آفریدی نے چوم لیا۔

پھر ان کے درمیان ملاقاتیں ہوتی چلی گئیں۔ زاہد آفریدی زندگی کی طرف لوٹ چکا تھا۔ اس نے آرمی میں اپلائی کیا اور سلیکٹ ہو گیا، ٹریننگ پر جانے سے پہلے وہ سمیرا سے ملا۔ ”سمیرا انتظار کرنا آتے ہی تمہارے پاپا سے تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔“ اس نے کہا اور ٹریننگ پر چلا گیا۔

زاہد آفریدی ٹریننگ سے لوٹا تو آرمی کی وردی اس پر جچ رہی تھی۔ اس کی محبت کا علم ہوتے ہی سمیرا کے پاپا ناصر درانی نے ظالم سماج بننے کے بجائے ان کا رشتہ طے کر دیا۔ انہیں زاہد آفریدی اچھا لگا تھا۔ ان کی شادی طے کر دی گئی۔ اور سمیرا اس کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ شادی کے ایک ہفتے بعد اسے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ یہ ہفتہ پر لگا کر اڑ گیا اور وہ سمیرا سے رخصت ہو کر ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اسے ڈیوٹی پر گئے ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔ گھر پر ایک بوڑھے چوکیدار کے علاوہ ان کی گھریلو ملازمہ صفیہ تھیں۔

سہ پہر کے وقت ڈور بیل کی آواز سن کر چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک پینتیس سالہ شخص موجود تھا جس نے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک اٹھایا ہوا تھا۔ ”جی فرمایئے۔“ چوکیدار نے پوچھا۔

”میں زاہد آفریدی کا دوست ہوں۔ اس کی شادی کے وقت ملک سے باہر تھا آج ہی لوٹا ہوں۔ زاہد آفریدی کی شادی کا علم ہوتے ہی یہاں آ گیا۔“

”صاحب تو دو روز پہلے ڈیوٹی پر چلے گئے ہیں، بیگم صاحبہ البتہ گھر پر موجود ہیں۔“ چوکیدار نے مہذب لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ ویری سیڈ آپ یہ گفٹ بیگم صاحبہ تک پہنچا دیں اور کہیں کہ زاہد آفریدی کے دوست آر جے نے دیئے ہیں۔“ اس شخص نے کہا اور گفٹ پیک چوکیدار کے ہاتھ میں تھما کر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

چوکیدار نے دروازہ بند کیا اور گفٹ سمیرا تک پہنچایا۔ ”بیگم صاحبہ یہ گفٹ صاحب کے کسی دوست آر جے نے دیا ہے۔“ وہ اسے گفٹ دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سمیرا نے خوب صورت ڈبے میں پیک گفٹ کو ایک طرف رکھا اور صفیہ کو چائے بنانے کا کہہ کر کمرے میں واپس لوٹی۔ اس کی نظر ایک بار پھر گفٹ پیک پر پڑی اس نے سوچا۔ ”ذرا دیکھو تو زاہد آفریدی کے دوست نے کیا تحفہ دیا ہے۔“ اس نے جیسے ہی گفٹ کھولا ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا۔

زاہد آفریدی تک یہ خبر پہنچی تو اس کی دنیا اندھیر ہو گئی یہ بم اس قدر طاقتور تھا کہ اس کے گھر کے پرخچے اڑ گئے تھے سمیرا اور اس کی ملازمہ صفیہ اس حادثے میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئیں۔ ان کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ ادھیڑ عمر چوکیدار چونکہ گیٹ پر تھا اس لئے زندہ تو بچ گیا لیکن شدید زخمی ہو گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے گفٹ دینے والے شخص کا حلیہ بتاتے ہوئے اس کا نام آر جے بتایا۔

زاہد آفریدی اجڑے ہوئے دل سے چھٹی لے کر پہنچ چکا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ آر جے کون ہے اور اس نے سمیرا کو کیوں قتل کیا۔ دوسرے روز یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔ اس کے فون کی بیل بجی، اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو زاہد آفریدی پہچانا مجھے، میں راجیش بول رہا ہوں تمہاری محبت اور بیوی کا قاتل، میں تم سے منسوب ہر شخص کو برباد کر دوں گا۔“

راجیش میں تمہیں تڑپا تڑپا کر مار دوں گا۔“ زاہد آفریدی چلایا اور دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

زاہد آفریدی کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ ماں باپ بہن کے بعد راجیش نے اس کی محبت سمیرا کو بھی قتل کر دیا تھا اس نے راجیش کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دیئے بہادر اور دلیر تو وہ پہلے بھی تھا۔ لیکن اب وہ بلا خوف و خطر خطرے میں کود پڑتا اپنی بہادری اور دلیری سے وہ جلد ہی ترقی کر کے کرنل بن گیا۔

ملٹری انٹیلی جنس کا کرنل آفریدی ملک دشمنوں کے لئے قہر کا دوسرا نام تھا اسے راجیش کی تلاش تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ راجیش کہاں ہے پھر ایک روز اس نے اپنی دوست آتماؤں کو بلانے کا فیصلہ کیا، اس نے زیر لب کہا۔

”اے میری دوست آتماؤں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ فوراً ہی چند ہیولے نمودار ہوئے جنہوں نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ وہ پانچ تھے ارجن گیتا اور تین دوسرے، زاہد آفریدی نے انہیں تمام روداد بتائی اور کہا۔ ”میں راجیش کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

ارجن کی آتما بولی۔ ”راجیش نے ہیجڑوں پر مشتمل ایک گروہ بنا رکھا ہے اس گروہ میں بہت سے دوسرے جرائم پیشہ افراد بھی شامل ہیں۔“

وہ آتمائیں راجیش کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھیں ان کا کہنا تھا کہ ”کشوری لال نامی ایک شکتی شالی پجاری راجیش کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس لئے وہ راجیش کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔“ کچھ دیر بعد آتمائیں اس سے رخصت ہو گئیں۔

وہ آرمی کی نوکری کی وجہ سے مجبور تھا۔ ان دنوں ملک میں حالات خراب تھے جگہ جگہ بم بلاسٹ ہو رہے تھے۔ پولیس مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ناکام رہی تھی یہ کیس آرمی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک روز کرنل آفریدی نے خفیہ اطلاع ملنے پر ایک عمارت پر چھاپہ مارا۔ بہت سے جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کر لیا، ان میں چند خواجہ سرا

بھی تھے، عمارت سے بھاری مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا، اس میں مہلک بم بھی ملے تھے۔

ایک خواجہ سرا نے دوران تفتیش بتایا کہ ان کا تعلق راجیش کے گروہ سے ہے۔ ملک میں ہونے والی دہشت گردی میں راجیش کا ہاتھ تھا۔ ان ہی دنوں ملٹری انٹیلی جنس کو اطلاع ملی کہ ایک عمارت میں کچھ دہشت گرد موجود ہیں جن کا تعلق راجیش کے گروہ سے ہے۔ ہائی کمان کی طرف سے انہیں اس عمارت پر اٹیک کرنے کا حکم ملا تو کرنل آفریدی اور اس کی ٹیم کے آٹھ ساتھیوں نے اس عمارت کا گھیراؤ کرلیا۔ کرنل آفریدی نے دوربین سے عمارت کا جائزہ لیا۔ اسے احاطے میں چند بچے کھیلتے دکھائی دیئے۔ قریب ہی ایک عورت کرسی پر بیٹھی تھی، وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دہشت گرد عورت اور بچوں کو ساتھ نہیں رکھتے، وہ ایک حساس انسان تھا۔ عورت اور بچوں پر کیسے حملہ کرتا۔ وہ وہاں سے خاموشی سے لوٹ گئے لیکن یہ دہشت گردوں کی چال تھی۔ وہ بچے اور عورت کی آڑ میں عمارت میں چھپے ہوئے تھے۔

انٹیلی جنس کے جاتے ہی وہ وہاں سے فرار ہوگئے۔

ان ہی دنوں زاہد آفریدی کی ملاقات نوید سے ہوئی اس نے اسے خودکشی جیسے فعل سے روکا۔ پھر سیٹھ ساجد کا منشیات کا گودام تباہ کیا۔ نوید کے گھر کے سامنے اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جب گاڑی میں آگ بڑھک اٹھی تو اس نے اپنی دوست آتماؤں کو پکارا۔ جنہوں نے اسے لمحہ بھر میں غائب کردیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ کئی دن اسپتال میں رہا۔ صحت یاب ہوتے ہی اسے پتہ چلا کہ سیٹھ ساجد اور کاشان نے نوید کے والدین کو قتل کردیا ہے اور نوید لاپتہ ہے۔ اس نے نوید کے بہن بھائی کو ڈھونڈا اور محفوظ مقام پر منتقل کرکے اپنے ساتھیوں کو ان کی حفاظت کی تاکید کی۔

وہ اپنی دوست آتماؤں سے معلوم کرچکا تھا کہ نوید اترپردیش کی ایک ریاست میں موجود ہے۔ اسے معلوم ہوا کہ جے چند یہاں کا بااثر شخص ہے، جس نے کشوری لال سے مل کر یہاں کے اچھوتوں اور مسلمان گھرانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے اور اسے یہ بھی پتہ چلا کہ جے چند نے جنگل سے نوید اور نندنی نامی لڑکی کو پکڑا تھا۔ نوید ان کی قید سے بھاگ نکلا جبکہ نندنی کو اماوس کی رات بلی چڑھایا جائے گا۔

وہ انسانی ہمدردی کے تحت نندنی کی جان بچانے کالی کے مندر جا پہنچا جہاں اس کی ملاقات نوید سے ہوئی اسے معلوم تھا کہ درجنوں مسلح افراد کے گھیرے سے نندنی کو بچانا آسان نہیں۔ جے چند اپنے بیٹے اور کارندوں سمیت مندر میں تھا۔ اس کے گھر پر لکشمی اور اس کی بیوی تنہا تھیں۔ کرنل آفریدی لکشمی کو اغوا کرکے مندر جا پہنچا۔ اس طرح نندنی کی زندگی بچ گئی۔

کہانی کا اختتام ہوتے ہی کرنل آفریدی بولا۔

”رات بہت ہوچکی ہے اب سوجانا چاہیے تاکہ ہم صبح تازہ دم ہوں۔“

وہ صبح سویرے اٹھے اور مندر سے باہر آگئے اور کھلے میدان میں کافی دیر تک رننگ کرتے رہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ کرنل آفریدی کا مقصد نوید کا فائٹنگ اسپرٹ چیک کرنا تھا۔ نوید نے پے درپے کئی گھونسے اور پنچ کرنل آفریدی کو رسید کئے جنہیں اس نے کامیابی سے بلاک کرتے ہوئے نوید پر اٹیک کیا وہ ملٹری انٹیلی جنس کا کرنل رہ چکا تھا اور مارشل آرٹ کا ماسٹر بھی رہ چکا تھا۔ نوید اس کے مقابلے میں محض طفل مکتب تھا۔ اسے کرنل آفریدی کی کئی آہنی ضربات سہنا پڑیں۔ لیکن نوید کا اسٹمنا بھی غضب کا ہوچکا تھا اور وہ مار کھاتا رہا لیکن کرنل آفریدی کے مقابل میں ڈٹا رہا۔

بالآخر آزمائشی فائٹ کا اختتام ہوا۔ ”تمہیں ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ بہرحال تمہارا اسٹمنا قابل رشک ہے۔“ کرنل آفریدی نے کہا اور وہ دوبارہ مندر میں داخل ہوگئے۔

شام چار بجے کے قریب کشوری لال چند پجاریوں کے ساتھ انہیں میدان میں لے گیا یہاں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جمع تھے میدان کے عین وسط میں موٹی رسیوں کی مدد سے اکھاڑہ بنایا گیا تھا۔ اکھاڑے سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر شاہانہ طرز کی کرسیوں پر جے چند اور راجیش بیٹھے تھے چاروں اطراف درجنوں رائفل بردار چوکنے کھڑے تھے۔ نوید کو اکھاڑے میں لے جایا گیا اس اثنا میں اندر جیت بھی اکھاڑے میں داخل ہوچکا تھا، ان کے درمیان مقابلے کی شرائط دوبارہ دہرائی گئیں۔ ایک ریفری نما شخص نے آکر دونوں فائٹرز کی تلاشی لی اور اکھاڑے سے باہر نکل گیا، اس مقابلے کے کوئی قواعد وضوابط نہ تھے۔ ہر قسم کے داؤ پیچ جائز تھے۔ دونوں فائٹر ایک دوسرے کے سامنے سینہ تانے کھڑے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کے مالک اندر جیت کے سامنے درمیانی قد وقامت کا چھریرے بدن والا نوید، ہاتھی کے مقابلے میں چیونٹی محسوس ہورہا تھا۔

بہرحال مقابلے کا فاتح نوید تھا۔ میدان میں سکوت چھا چکا تھا۔ اندر جیت اس کے ہاتھوں مارا جاچکا تھا۔ جے چند بیٹے کو مرتا دیکھ کر غیض وغضب میں مبتلا ہوگیا۔ وہ کشوری لال کے کئے ہوئے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے چلایا۔ ”ان مسلوں کو جان سے مار ڈالو۔“ اس کے کارندوں نے رائفلیں تان لیں۔

اچانک پے درپے کئی فائر ہوئے اور تماشائیوں کے ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی جے چند کے کئی کارندے جسم پر گولیاں کھاکر چیختے ہوئے گرے، ان پر حملہ کرنے والے راہول اور اس کے ساتھی تھے جو نہ جانے کیسے اچانک وہاں پہنچ چکے تھے۔

لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس بھگدڑ کا فائدہ نوید اور کرنل آفریدی کو پہنچا وہ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہوگئے۔ اب ان پر گولی چلانا مشکل تھا۔ نوید، کرنل آفریدی فائر کرتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے راہول اور اس کے ساتھیوں تک پہنچ گئے۔ جے چند اور اس کے کارندے اچانک گھیرے میں آنے سے بوکھلا گئے تھے۔ وہ ان کی بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔ اس حملے میں جے چند کے کافی کارندے مارے گئے تھے۔ راہول اور اس کے ساتھی جانتے تھے کہ جے چند سے اس وقت فیصلہ کن مقابلہ ممکن نہیں وہ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور جدید اسلحے سے لیس تھے۔ ان کے سنبھلنے کے بعد انہیں فرار کا راستہ بھی نہ ملتا اس لئے وہ وہاں سے نکل گئے اور جنگل سے ہوتے ہوئے پہاڑی حدود میں داخل ہوگئے۔

نصف شب کے قریب وہ پہاڑ پر چڑھ چکے تھے۔ نندنی غار میں ہی موجود تھی۔ نوید کو زندہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”جے چند بیٹے کی موت سے پاگل ہوچکا ہوگا ہوسکتا ہے وہ بہت جلد پوری طاقت سے حملہ کردے وہ تعداد میں بھی ہم سے زیادہ اور جدید اسلحے سے لیس ہیں جبکہ ہم بمشکل پچاس کے قریب ہیں اور ہمارے پاس گولیاں بھی محدود ہیں۔“ راہول نے کہا۔

وہ بہت زیادہ فکرمند تھا مقابلے کے دوران جے چند کی وعدہ خلافی سے اس کی بہن اب تک جے چند کے قبضے میں تھی۔ ”راہول فکرمند ہونے سے کچھ نہیں ہوگا ہمیں چاہئے کہ ان کے آنے سے پہلے اپنے حفاظتی انتظامات پختہ کرلیں۔“ زاہد آفریدی نے کہا اور راہول کے ساتھیوں کو مختلف چٹانوں کے پیچھے پوزیشن سنبھالنے کی ہدایت کی۔

علی الصبح کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر وہ چونک پڑے۔ ”لگتا ہے جے چند کھوجی کتوں کی مدد سے ہم تک پہنچ چکا ہے۔“ راہول بولا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ راہول نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور ششدر رہ گیا۔ درجنوں کی تعداد میں بل ڈاگز کے پیچھے جیپوں اور گھوڑوں پر جے چند اور اس کے کارندے پہاڑ کے قریب پہنچنے والے تھے۔ ان کی تعداد کم ازکم بھی سو سے اوپر تھی۔ انہیں جے چند کے مقابلے میں سب سے بڑی برتری یہ حاصل تھی کہ وہ بلندی پر تھے۔ پھر وہ پہاڑ کے قریب پہنچ گئے اور مختلف مقامات سے اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔

راہول اور اس کے ساتھیوں نے فائر کھول دیا۔ ”رک جاؤ اپنی گولیاں ضائع مت کرو، تمہاری رائفلوں کی رینج محدود ہے جبکہ ان کے پاس ٹیلی اسکوپ گنیں بھی ہیں۔“ کرنل آفریدی نے چیخ کر کہا اور انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلانی بند کردیں۔

”اس طرح تو یہ پہاڑ پر چڑھ جائیں گے اور ہمارا خاتمہ یقینی ہوگا۔“ راہول بولا۔

”سب مل کر ان پر بڑے بڑے پتھر لڑھکادو۔“ کرنل آفریدی نے حکم دیا اور وہ سب بڑے بڑے پتھر لڑھکانے لگے، پتھر لڑھکتے ہوئے بلندی سے گرنے لگے اور اوپر چڑھنے والے جے چند کے کارندوں کو روندتے گئے۔

جے چند کے کافی کارندے ان بڑے بڑے پتھروں سے کچل کر مارے گئے، انہوں نے پیش قدمی روک دی۔

"راہول تم لوگ اسی طرح ان کا راستہ روکو، میں تمہارے کچھ ساتھیوں کو لے کر دوسری سمت سے پیچھے جاتا ہوں اس طرح یہ دونوں اطراف سے گھر جائیں گے۔" کرنل آفریدی نے کہا اور راہول کے پندرہ بیس ساتھیوں کو لے کر دوسری سمت سے پہاڑ سے اتر کر ان کے عقب میں پہنچ گیا۔ اب جے چند کے کارندے دونوں اطراف سے گھیرے میں آچکے تھے۔ اوپر سے پتھر برس رہے تھے اور عقب سے کرنل آفریدی اپنے ساتھیوں سمیت ان پر فائرنگ کررہا تھا۔ وہ ماہر نشانہ باز تھا اس کی کوئی بھی گولی ضائع نہیں جارہی تھی، راہول کے ساتھی بھی کم نہیں تھے۔

راہول اور نوید فائرنگ کرتے ہوئے پہاڑ سے اترنے لگے، جے چند اپنے کارندوں سمیت چکی کے دو پاٹوں میں پس چکا تھا۔ اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ یقینی شکست کو دیکھ کر انہوں نے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جے چند اپنی جیپ کی طرف بھگا۔ کرنل آفریدی اسے دیکھ چکا۔ اس نے فائر کیا گولی سیدھی اس کی پیشانی میں لگی اور وہ جہنم رسید ہوگیا۔ اس کے مرتے ہی اس کے کارندوں کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ کچھ ہی گھنٹوں میں چاروں طرف ان کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ راہول کے چند ساتھی اس محاذ آرائی میں مارے گئے تھے۔

کشوری لال اور راجیش غائب تھے، شاید وہ اس قافلے میں شریک ہی نہ تھے۔ جے چند کی حویلی پر راہول اور اس کے ساتھی قابض ہوگئے۔ راہول کی بہن کی لاش حویلی کے ایک کمرے سے ملی۔ وہاں کے لوگ جے چند جیسے سفاک شخص کے خاتمے سے خوش تھے۔

نوید اور کرنل آفریدی نے دو روز راہول کی مہمان نوازی میں گزارے اور تیسرے روز اس سے جانے کی اجازت طلب کی جو انہیں بڑی مشکل سے ملی۔ راہول اور اس کے چند ساتھیوں انہیں ریاست کی حدود سے باہر چھوڑ آئے۔ آگے کا سفر انہوں نے تنہا طے کرنا تھا۔ وہ چار افراد تھے نوید، کرنل آفریدی، شرجیل اور نندنی خوش قسمتی سے وہ بغیر کسی رکاوٹ کے مختلف بسوں کے ذریعے ایک سرحدی گاؤں میں پہنچے، وہاں ایک اسمگلر کی مدد سے انہوں نے انڈیا کی سرحد پار کی، یہی اسمگلر کرنل آفریدی اور شرجیل کو پاکستان سے انڈیا لایا تھا۔ وہ پاکستانی علاقے میں داخل ہوچکے تھے۔ لیکن سفر کوئی بھی ہو بالآخر اس کا اختتام ہو ہی جاتا ہے۔ وہ روشنیوں کے شہر میں پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

نندنی سب کو اچھی لگی تھی لیکن تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ ہندو تھی، کرنل آفریدی دو روز اپنی جگہ رہا جبکہ شرجیل اپنے ساتھیوں سے ملنے جاچکا تھا۔ کرنل آفریدی بھی تیسرے روز وہاں سے رخصت ہوگیا۔ وہ زندہ دل انسان تھا۔ سب جلد ہی اس سے مانوس ہوگئے تھے۔ نوید کی بہن فرزانہ کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ وہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتی تھی۔ اور نماز کے بعد ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھتی تھی۔

نندنی حیرت سے اس کے عبادت کے طریقہ کار کو دیکھتی تھی۔ وہ اکثر فرزانہ سے اسلام کے بارے میں سوالات کرتی۔ اور فرزانہ جس قدر جانتی تھی اس کے سوالات کے جواب دیتی۔ نندنی اکثر تلاوت قرآن پاک کے وقت اس کے قریب آجاتی اور اس سے تلاوت سنتی، قرآن پاک کی تلاوت اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ ایک روز اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو سب خوشی سے کھل اٹھے، اسے ایک عالم دین کے پاس لے جایا گیا، جہاں اسلام کے بارے میں مزید معلومات کے بعد نندنی نے اسلام قبول کرلیا۔ فرزانہ کی خواہش پر اس کا نام نادیہ رکھا گیا۔ نادیہ اور نوید کی شادی طے کردی گئی۔ فرزانہ کا ارادہ بھائی کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا تھا۔ تمام رسومات کے بعد بالآخر وہ دن بھی آگیا جب نادیہ اور نوید نے ایک ہونا تھا۔

کرنل آفریدی بھی اپنے آٹھ ساتھیوں سمیت ان کے گھر ڈیرا جمائے بیٹھا تھا۔

نادیہ کو سجنے سنورنے کے لئے شہر کے مشہور بیوٹی پارلر میں روانہ کیا گیا۔ فرزانہ نادیہ کے ساتھ تھی ان کے گھر میں شادی کی خوشی میں خوب چہل پہل تھی۔ دلہن کو بیوٹی پارلر

لے گئے۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے نوید، زاہد آفریدی سے خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ اس کے فون کی بیل بج اٹھی۔

"نوید نے کال ریسیو کی نوید غضب ہوگیا نادیہ کو کچھ لوگ گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے ہیں۔" فرزانہ نے دوسری طرف سے روتے ہوئے کہا تو نوید کا دل ڈوبنے لگا۔ "باجی یہ کیسے ہوا اور وہ کون لوگ تھے۔"

"ہم بیوٹی پارلر میں موجود تھے کہ ایک پجاری ٹائپ شخص اور تین دوسرے افراد زبردستی بیوٹی پارلر میں گھس گئے ان کے پاس خوفناک قسم کی گنیں تھیں۔ وہ نادیہ کو گن پوائنٹ پر بیوٹی پارلر سے لے گئے۔ پارلر والوں نے پولیس کو اطلاع کردی ہے۔" دوسری طرف سے فرزانہ نے کہا اور نوید نے رابطہ منقطع کردیا۔

"کیا ہوا؟" کرنل آفریدی نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ نوید نے اسے دکھی لہجے میں ساری بات بتادی۔"

تمہاری باجی کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ پجاری کشوری لال ہوگا۔ وہ منٹوں سیکنڈوں میں کہیں بھی پہنچ سکتا ہے اور وہ ویسے بھی تم دونوں کے ملاپ کا دشمن ہے، اسے جب پتہ چلا ہوگا کہ تم دونوں ایک ہونے والے ہو تو وہ نادیہ کو لے اڑا، اس کے لئے انڈیا سے پاکستان آنا اور نادیہ کو اغوا کرنا مشکل کام نہیں۔" کرنل آفریدی نے کہا۔

"لیکن جے چند سے لڑائی کے وقت وہ سامنے کیوں نہیں آیا۔" نوید نے پوچھا۔

"اس کی وجہ تمہارے پاس موجود طلسماتی انگوٹھی اور لاکٹ ہے اور یہاں بھی اسے معلوم تھا کہ جب تک تمہارے پاس یہ دونوں چیزیں ہیں وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس لئے اس نے بہتر یہی جانا کہ نادیہ کو اغوا کرلے۔" نوید گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"گھبراؤ مت اللہ بہتر کرے گا۔" کرنل آفریدی نے اسے تسلی دی۔

فرزانہ گھر آچکی تھی کرنل آفریدی، نوید اور اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ٹھکانے پر آچکا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا نوید کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کشوری لال نادیہ کا ازلی دشمن تھا۔ نادیہ کی زندگی خطرے میں تھی۔ اسی وقت کرنل آفریدی کے فون کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "کیسے ہو آفریدی، مجھے بھولے تو نہیں۔" دوسری طرف سے بولنے والے شخص کی آواز سن کر اس کی رگوں میں دوڑنے والے لہو کی گردش میں تیزی آگئی۔ "یہ کوئی اور نہیں اس کی جاہی و بربادی کا ذمہ دار راجیش تھا۔"

"کیوں لگا ناں جھٹکا لیکن اب دوسرا جھٹکا سہنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ نندنی ہمارے قبضے میں ہے اور ہم اس کی بلی چڑھانے والے ہیں بچا سکتے ہو تو بچالو۔ میں نے کہا تھا ناں کہ تم سے منسوب ہر فرد کا خاتمہ کردوں گا۔" راجیش نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

کشوری لال اور راجیش کا ٹھکانہ وہ لوگ نہیں جانتے تھے اور نادیہ کی زندگی بچانے کے لئے اسے جلد ڈھونڈنا ضروری تھا۔

"چلو نوید باہر چلتے ہیں ہوسکتا ہے اللہ کوئی راستہ نکال دے۔" کرنل آفریدی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے تئیں وہ سڑکوں پر گھومنے لگا۔

اچانک ایک جگہ کرنل آفریدی نے گاڑی فٹ پاتھ کے قریب روکی اور دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ نوید حیرت زدہ سا گاڑی میں بیٹھا رہا۔ کرنل نے بھاگ کر فٹ پاتھ پر چلنے والے ایک خواجہ سرا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف موڑا۔ کرنل کو دیکھتے ہی خواجہ سرا کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر کرنل نے مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔ "چھوڑ دو مجھے ورنہ میں شور مچادوں گی۔" خواجہ سرا نے اسے اپنے مخصوص لب ولہجے میں دھمکی دی۔

"تمہیں جتنا شور مچانا ہے مچالو۔" کرنل نے فٹ پاتھ سے گزرنے والے لوگوں کی پرواہ کئے بغیر اسے گھسیٹ کر اپنی گاڑی تک لایا اور اسے پچھلی نشست پر دھکیل کر خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"چلو نوید گاڑی چلاؤ۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور خواجہ سرا چیخنے چلانے لگا۔ فٹ پاتھ پر اردگرد موجود لوگ حیرت سے وہ منظر دیکھ رہے تھے، کرنل نے اپنے ہولسٹر سے پسٹل

نکال اور خواجہ سرا کی کنپٹی سے لگا دیا۔ "اب اگر آواز نکالی تو گولی چلا دوں گا۔" وہ غرایا اور خواجہ سرا سہم کر خاموش ہو گیا۔ اس اثنا میں نوید گاڑی چلا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کرنل کے ٹھکانے پر موجود تھے۔ اور خواجہ سرا زمین میں فکس لوہے کی کرسی پر بندھا ہوا تھا۔ "اس خواجہ سرا کو تم کیوں پکڑ لائے۔" نوید نے پوچھا۔

"یہ وہی ہے جس کے ذریعے راجیش نے مجھے اغوا کی خبر دی تھی۔" کرنل نے جواب دیا۔ "میرے پاس وقت بالکل نہیں اگر اپنی ہڈی پسلی نہیں تڑوانا چاہتے تو شرافت سے بتاؤ، راجیش اور کشوری لال کہاں ہیں اور انہوں نے نادیہ کو کہاں قید رکھا ہے۔" اس بار کرنل خواجہ سرا سے مخاطب تھا۔

"میں کسی کشوری لال اور راجیش کو نہیں جانتی، تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" خواجہ سرا نے جواب دیا۔ اور کرنل آفریدی بجلی کے بورڈ کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک پلگ لگا ہوا تھا۔ پلگ سے منسلک دوسرے سرے کی ننگی تاریں اس نے خواجہ سرا کی کلائی سے لپیٹ دیں۔

خواجہ سرا حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوئچ بورڈ پر لگا بٹن آن کر دیا تو خواجہ سرا کے بدن کو جھٹکا لگا اور وہ لرزنے لگا۔ کرنل نے فوراً بٹن آف کر دیا یہ عمل محض چند سیکنڈ کا تھا لیکن خواجہ سرا کی حالت خراب ہو گئی۔ کرنل نے اسے ایک بار پھر کرنٹ کا جھٹکا دیا۔ اس بار خواجہ سرا بے ہوش ہو گیا۔ کرنل نے اسے پے در پے کئی تھپڑ رسید کئے اور وہ ہوش میں آ گیا۔

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گی۔" خواجہ سرا روتے ہوئے بولا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مدھو۔"

"تمہارا راجیش سے کیا تعلق ہے؟ اور تم اس کے لئے کیا کام کرتے ہو؟"

"مہاراج راجیش کا کہنا ہے کہ اگر ہم کالی ماتا کے نام پر بلی دیتے رہیں تو اگلے جنم میں ہجڑے کے بجائے عورت یا مرد کے روپ میں جنم لیں گے۔"

"راجیش اس کے علاوہ تم سے کیا کام لیتا ہے؟"

"ہم اس کے حکم پر مختلف اہم مقامات پر دہشت گردی کرتے ہیں۔" مدھو نے جواب دیا۔

"انہوں نے ماضی کی نندنی اور آج کی نادیہ کو کہاں قید کر رکھا ہے۔ اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

"یہاں راجیش کا ایک پاکستانی ساتھی سیٹھ ساجد ہے اسی کی ایک عمارت میں نندنی کو قید رکھا گیا ہے جہاں آج رات اسے کالی کے چرنوں میں بلی دی جائے گی۔" مدھو نے جواب دیا تو کرنل آفریدی اور نوید چونک پڑے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سیٹھ ساجد اور راجیش کے بیچ لنکس ہو سکتے ہیں۔ اس نے تفصیل سے اس عمارت کا محل وقوع اور ایڈریس مدھو سے پوچھا اور پھر نوید کے ساتھ باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تیز رفتاری سے سیٹھ ساجد کے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے، گاڑی انہوں نے عمارت سے کافی فاصلے پر روکی اور ٹہلتے ہوئے عمارت سے چند گز دور پہنچے اور جائزہ لیا۔ یہ کافی وسیع و عریض عمارت تھی۔ مین گیٹ پر سیکورٹی گارڈز کی وردی میں ملبوس دو افراد رائفلیں لئے چوکنے کھڑے تھے، ایک دوسری عمارت اس عمارت سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر تھی، اتفاق سے یہ دونوں عمارتیں تین منزلہ تھیں۔ "آؤ ذرا ساتھ والی عمارت کا جائزہ لیں۔" وہ نوید کو لے کر دوسری عمارت کی طرف بڑھا، یہ رہائشی فلیٹ تھے، چھت پر پانی کی بڑی سی ٹینکی تھی۔ وہ فلیٹ کا جائزہ لے کر نیچے آ گئے۔ "کوئی فائدہ نہیں! فرض کرو ہم سیٹھ ساجد کی عمارت میں داخل ہو بھی جائیں تو کشوری لال پر قابو پانا ناممکن ہے وہ ایک ساحر ہے اپنے جادو سے نندنی سمیت وہاں سے غائب ہو جائے گا۔ اور ہم دیکھتے رہ جائیں گے۔" نوید مایوس لہجے میں بولا۔

کرنل بھی اس کی رائے سے متفق تھا۔ ان کے پاس وقت بہت کم تھا اور اس مشکل کا کوئی حل بھی ان کی سمجھ سے بالاتر تھا وہ خاموشی سے گاڑی میں آ بیٹھے۔ کرنل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شہر کی ایک مرکزی سڑک پر ان کی گاڑی جھٹکا کھا کر رک گئی۔ "یہ کیا ہوا گاڑی بھی نئی ہے اسے شوروم سے نکلے چند ہی ماہ ہوئے ہیں خرابی کا تو سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا اور فیول بھی فل ہے۔" کرنل نے حیرت سے کہا۔ وہ گاڑی سے اتر گئے پیچھے موجود گاڑیاں مسلسل ہارن بجا رہی تھیں وہ گاڑی کو دھکیل کر فٹ پاتھ کے قریب سائیڈ پر لے آئے اور کرنل بونٹ کھول کر جائزہ لینے لگا۔

فٹ پاتھ پر چادر بچھائے ایک مجذوب بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گیا۔ "کیوں پریشان ہو؟" اس نے کرنل آفریدی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا یہ نئی گاڑی ہے، اچانک نہ جانے کیا خرابی ہو گئی سمجھ سے باہر ہے۔" کرنل آفریدی نے جواب دیا۔

"گاڑی کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن انسان کے ضمیر میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہونا چاہئے تم نے انسانیت کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ جو اللہ کی رضا کے لئے کام کرتے ہیں۔ وہ بھی ان کے کام آتا ہے۔" مجذوب نے کہا اور سڑک پر پڑا ایک کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور چبا کر کرنل آفریدی کے ہاتھ میں دے دیا۔ "اسے تم اس پجاری کے گلے میں کسی طرح ڈال دینا۔ اس کی پراسرار طاقتیں ختم ہو جائیں گی اور وہ ایک عام انسان بن جائے گا۔" وہ دونوں مجذوب کی گفتگو سے سمجھ گئے کہ وہ کشوری لال کی بات کر رہا ہے۔

"مگر بابا یہ اس کے گلے میں ڈالیں گے کیسے؟" نوید نے پوچھا۔

مجذوب مسکرایا اور پلک جھپکتے میں اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ وہ ششدر کھڑے رہ گئے۔

اچانک گاڑی کے انجن کے چلنے کی آواز سن کر وہ چونک پڑے، کرنل آفریدی نے بونٹ بند کیا اور وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے وہ حیران تھے کہ گاڑی خود بخود کیسے اسٹارٹ ہو گئی۔

نوید بولا۔ "نئی گاڑی کا پراسرار طور پر یہاں خراب ہونے کا مقصد ہمیں اس مجذوب تک پہنچانا تھا۔"

اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی کرنل، نوید کو کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گیا اس کی واپسی نصف گھنٹے بعد ہوئی، اس کے ساتھ اس کا ایک خوب صورت ساتھی شاکر بھی تھا جوان سب میں کم عمر اور کلین شیو تھا۔

کرنل آفریدی نے کینوس کا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ وہ تینوں اس کمرے میں چلے گئے جہاں مدھو اب تک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ کرنل آفریدی نے بیگ ایک طرف رکھا زپ کھولی اور اندر سے ایک بیلٹ نکالا مدھو کی قمیض اوپر کر کے بیلٹ اس کے سینے سے باندھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" مدھو نے تھوک نگلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ ریموٹ کنٹرول بم ہے، جس کی رینج ایک کلومیٹر سے زائد ہے، تم ہمارا ایک معمولی سا کام کرو گے یہ میرا ساتھی شاکر ہے، ہم اسے خواجہ سرا کا روپ دیں گے، تم اسے اپنے ساتھ کشوری لال کے پاس لے جاؤ گے اور اسے اپنا نیا ساتھی ظاہر کر کے راجیش کے گروپ میں شامل کرنے کی درخواست کرو گے لیکن اتنا یاد رکھنا اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں اس ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دوں گا اور تمہارے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ہم وطن کے سپاہی ہیں، اس کی حفاظت کی خاطر اپنی جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے، یہ بات شاکر بھی جانتا ہے، شاکر کے گلے میں ایک لاکٹ ہے اس لاکٹ میں حساس ڈیوائس ہے یہاں جہاں بھی جائے گا ہم تک وہاں ہونے والی گفتگو پہنچتی رہے گی۔" کرنل آفریدی نے کہا اور ریموٹ اپنے کرتے کی سائیڈ کی جیب میں ڈال لیا۔

وہ شاکر کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا اس بار اس کی واپسی نصف گھنٹے بعد ہوئی، شاکر زنانہ کپڑے پہنے ہوئے خواجہ سرا کا روپ دھار چکا تھا۔ کرنل آفریدی کے ہاتھ میں گلاب کے تر و تازہ پھولوں کے دو ہار تھے جنہیں اس نے ایک شاپر میں ڈال دیا۔ کرنل آفریدی نے مجذوب کا دیا ہوا کاغذ، ہار کے ایک پھول میں سلوشن کی مدد سے اس طرح چپکا دیا تھا کہ اسے دیکھا جانا ناممکن تھا۔ یہ ہار دوسرے ہار کی نسبت قدرے چھوٹا تھا۔ "شاکر تم نے یہ چھوٹا ہار کسی طرح کشوری لال کو پہنانا ہے۔ کرنل آفریدی نے شاپر شاکر کو تھما دیا۔

کچھ دیر بعد وہ کار میں سیٹھ ساجد کی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ کار میں مدھو، شاکر، نوید اور کرنل آفریدی سمیت اس کے دیگر ساتھی بھی موجود تھے۔ عمارت سے کچھ فاصلے پر

کرنل آفریدی نے کار روک دی۔ شاکر اور مدھو کو کار سے اتار دیا گیا۔ اس وقت وہ دونوں ایک ہی برادری کے لگ رہے تھے۔

"مدھو اگر تم نے ہم سے تعاون کیا تو نہ صرف تم زندہ سلامت رہو گے بلکہ ہم تمہیں آزاد بھی کردیں گے۔" کرنل آفریدی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو مدھو نے اثبات میں سر ہلایا اور شاکر کا ہاتھ تھام لیا اور عمارت کے مرکزی دروازے پر پہنچ گئی۔

اس نے دروازے پر موجود گارڈز سے کچھ بات کی ایک گارڈ نے انٹر کام پر بات کرکے اجازت ملنے پر انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ کرنل آفریدی، نوید اور اس کے ساتھ بیگ لے کر برابر والے فلیٹ کی چھت پر پہنچ گئے۔

ادھر شاکر اور مدھو گیٹ سے احاطے میں داخل ہوچکے تھے۔ احاطے میں تین مسلح افراد موجود تھے۔ ان کی تلاشی لینے کے بعد انہیں اندر جانے دیا گیا۔ وہ کوریڈور میں جا پہنچے، وہاں بھی دو رائفل بردار تھے۔ جنہوں نے ان کی تلاشی لی اور آگے جانے کی اجازت دے دی۔ اب وہ ایک محرابی دروازے کے سامنے جا پہنچے، وہاں بھی ایک رائفل بردار کھڑا تھا۔ یہاں بھی ان کی تلاشی لی گئی۔ پھر رائفل بردار نے دروازہ کھول کر انہیں اندر جانے کے لئے کہا، یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ ہال میں چند کرسیاں رکھی تھیں جن پر راجیش، کشوری لال، سیٹھ ساجد اور کاشان بیٹھے تھے۔ ہال کی داہنی دیوار کے ساتھ کالی کا بت موجود تھا جس کے چرنوں میں نادیہ بندھی پڑی تھی، ایک طرف دو رائفل بردار افراد کھڑے تھے۔

ہال میں چھ سات خوب صورت خوابیدہ سرا بھی موجود تھے۔ "مدھو تم وقت پر پہنچی ہو، اس ناری کی بلی دی جانے والی ہے، بس کچھ سے باقی ہے۔ پرنتو یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟" راجیش نے پوچھا۔

"مہاراج میں اسے آپ کے چرنوں میں رہنے کے لئے لائی ہوں۔ یہ نئی ہے، میں نے سوچا کہیں غلط ہاتھوں میں نہ چلی جائے، اس لئے یہاں لے آئی۔" مدھو نے کہا۔

"ہے تو یہ کافی سندر تمہارا نام کیا ہے؟" راجیش نے شاکر سے پوچھا۔

"مالا۔" شاکر نے مختصر جواب دیا۔

"دیکھو مالا تمہیں مدھو نے تھوڑا بہت سمجھا تو دیا ہوگا یہ سیٹھ ساجد اور کاشان ہیں، ہمارے ساتھی ہیں اور یہ ہیں مہاراج کشوری لال، یہ بہت ہی مہان ہستی ہیں۔" راجیش نے کہا۔

اور شاکر نے کمال ہوشیاری سے آگے بڑھ کر کشوری لال کے چرن چھوئے۔ "مجھے مدھو نے آپ کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ میں آپ کے لئے پھول لائی ہوں، انہیں سویکار کرلیں۔" شاکر نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر شاپر سے پھولوں کا چھوٹا ہار نکالا اور کشوری لال کے گلے میں ڈال دیا۔

ہار گلے میں پڑتے ہی کشوری لال کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ وہ ایک دم کرسی سے اٹھا اور گلے سے پھولوں کا ہار نکالنے کی کوشش کی، اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا ہو۔ "یہ کیا ہے؟" وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

"کشوری لال تم اپنی پراسرار جادوئی صلاحیتوں سے محروم ہوچکے ہو۔" شاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

راجیش، سیٹھ ساجد اور کاشان خطرے کا احساس ہوتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے، کاشان نے اچانک اپنے ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور گولی چلادی جو شاکر کے سینے میں لگی تو وہ چیختا ہوا گر گیا۔

کاشان کا گولی چلانا شاکر کے لئے غیر متوقع تھا اس کے لئے وہ اپنا دفاع نہ کرسکا۔

ادھر وہ سب فلیٹ کی چھت پر موجود تھے۔ کرنل آفریدی کے کانوں میں ہینڈ فری جیسا آلہ لگا ہوا تھا۔ جس سے دوسری عمارت میں ہونے والی گفتگو سنی جارہی تھی، اسے معلوم ہوچکا تھا کہ شاکر اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا ہے۔

اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی پھر شاکر کی چیخ سن کر کرنل آفریدی مضطرب ہوگیا۔ اس نے برقی سرعت سے بیگ میں سے ڈول مشین جیسا آلہ نکالا اور اس کا رخ سیٹھ ساجد کی عمارت کی طرف کرکے سائیڈ پر لگا بٹن دبادیا سرر کی آواز کے ساتھ اس آلہ میں سے رسی نکالی اور رسی کے سرے پر موجود ہک سامنے والی عمارت کی دیوار میں پیوست

ہوگیا۔ کرنل آفریدی نے اس کا دوسرا سرا ایک طرف لگے پلر سے باندھ دیا۔ وہ ایک ایک کرکے دوسری عمارت کی چھت پر پہنچ گئے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود گنوں کو فائرنگ پوزیشن دے دی تھی۔

اسی وقت کرنل آفریدی نے راجیش کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا۔ "مدھو تم؟ تم غدار نکلی اب غداری کا انجام بھی دیکھ لو۔" پھر مدھو کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نہیں مہاراج میرے سینے پر ریموٹ کنٹرول بم موجود ہے۔" مدھو کی بات سنتے ہی ان کے اوسان خطا ہوگئے، وہ نادیہ اور مدھو کو بھول کر محرابی دروازے کی طرف بھاگے۔ ادھر نوید، کرنل آفریدی اور اس کے ساتھی تیزی سے سیڑھیوں سے اتر چکے تھے، سامنے سے دو مسلح افراد بھاگتے ہوئے آرہے تھے، کرنل آفریدی نے برسٹ مارا وہ دونوں گولیوں سے چھلنی ہوکر چیختے ہوئے گرے، وہ کوریڈور میں داخل ہوئے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک رائفل بردار تیزی سے باہر نکلا، شرجیل کی چلائی ہوئی گولی اس کی پیشانی میں لگی۔ "تم میں سے چار افراد احاطے میں جائیں اور وہاں موجود افراد کو قابو کریں۔" زاہد آفریدی نے کہا اور اس کے چار ساتھی مڑ کر احاطے کی طرف دوڑے، سامنے سے تین خوابیدہ سرا رائفلیں لے کر بھاگتے ہوئے آرہے تھے، نوید نے برسٹ مارا تو خوابیدہ سرا چیختے ہوئے گر گئے۔ اسی وقت دروازہ کھلا، محرابی دروازے سے کشوری لال، راجیش، سیٹھ ساجد اور کاشان نکل کر ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کررہے تھے۔ نوید نے ٹریگر دبادیا گولی کشوری لال کی ٹانگ میں لگی، وہ چیختا ہوا گر گیا جبکہ راجیش سیٹھ ساجد اور کاشان کمرے میں گھس کر دروازہ اندر سے مقفل کرچکے تھے۔

احاطے میں سے بھی فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ "کشوری لال تیرے جنم جنم کی کہانی کا اختتام ہونے والا ہے۔" نوید نے دانت بھینچتے ہوئے کہا اور اٹھتے ہوئے کشوری لال پر گولی چلادی جو کشوری لال کی پیشانی میں لگی، وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔

کرنل آفریدی اور اس کے ساتھیوں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے مقفل تھا۔ انہوں نے کندھوں سے ضربیں لگا کر دروازہ توڑ ڈالا۔ اس کام میں پندرہ منٹ کا وقت صرف ہوگیا۔ اس دوران نوید نادیہ کو آزاد کرکے لاچکا تھا۔

خوفزدہ مدھو بھی اس کے ساتھ تھی۔ کشوری لال کی لاش دیکھ کر نادیہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کے پیار کا جنموں جنموں کا دشمن اپنے انجام تک پہنچ چکا تھا۔

وہ دروازہ توڑ کر اندر پہنچے تو خالی کمرہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے یہاں کوئی خفیہ راستہ بھی موجود ہے۔ جس سے وہ لوگ نکل گئے ہیں۔" نوید نے کہا۔ مدھو نے خفیہ راستہ تلاش کرنے میں ان کی مدد کی، لکڑی کی الماری سرکانے سے کمرے کا فرش کھل گیا، نیچے سیڑھیاں جارہی تھیں پھر طویل راہداری تھی جس کا اختتام عمارت سے باہر عقبی سمت ہوا۔ وہ دوبارہ عمارت میں لوٹ آئے۔

اس معرکہ میں کشوری لال سمیت دس افراد مارے گئے تھے۔ عمارت کی تلاشی لینے پر ایک الماری سے حساس دستاویزات ملیں جن سے یہ انکشاف ہوا کہ سیٹھ ساجد، کاشان اور راجیش کا تعلق دہشت گرد گروہ سے ہے۔

فائرنگ کی آواز سے علاقہ پولیس پہنچ چکی تھی۔ کرنل آفریدی نے ملٹری انٹیلی جنس کے افسران کو بھی اطلاع کردی تھی۔ ان حساس دستاویزات کو دیکھتے ہی سیٹھ ساجد، کاشان اور راجیش کی زندہ یا مردہ گرفتاری کا حکم جاری کردیا گیا۔ کرنل آفریدی اور اس کے ساتھیوں کے کارنامے کو سراہا گیا۔

مجرموں کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے تھے۔ سیٹھ ساجد اور کاشان کے تمام بینک اکاؤنٹس سیل کردیئے گئے۔ ایئرپورٹ ریلوے اسٹیشن، بسوں کے اڈوں اور شہر سے باہر جانے والے راستوں پر بھاری نفری تعینات کردی گئی۔

نوید نادیہ کو لے کر گھر پہنچ چکا تھا۔ کرنل آفریدی اور اس کے ساتھی اپنے ٹھکانے پر جاچکے تھے۔

دوسرا روز ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ وسیم یونیورسٹی گیا ہوا تھا۔ نوید ناشتہ کررہا تھا کہ فرزانہ گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ "کیا ہوا خیریت تو ہے باجی!" نوید نے پوچھا۔ "ابھی

ابھی ٹی وی پر نیوز آئی ہے کہ شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں دہشت گردوں نے طلباو طالبات اور ٹیچرز کو یرغمال بنالیا ہے یہ وہی یونیورسٹی ہے جس میں وسیم زیر تعلیم ہے۔" فرزانہ روتے ہوئے بولی۔

نوید بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا اور کرنل آفریدی کا نمبر ملایا۔ "کیسے ہو نوید۔" دوسری طرف سے کرنل نے کہا۔

"یار دہشت گردوں نے شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں طلبا، طالبات اور ٹیچرز کو یرغمال بنالیا ہے اور اسی یونیورسٹی میں وسیم بھی ہے۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں یہ خبر سن چکا ہوں اور یونیورسٹی کی طرف ہی جارہا ہوں۔" کرنل آفریدی نے کہا۔

"میں بھی آرہا ہوں۔" نوید بولا۔

نوید یونیورسٹی پہنچا تو کرنل آفریدی اسے گیٹ پر ہی مل گیا۔ یونیورسٹی کے قریب پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد بھاری تعداد میں موجود تھے، انٹیلی جنس کے افسران بھی تھے۔

سیٹھ ساجد اور اس کے ساتھیوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں وہاں سے بہ حفاظت نکلنے کے لئے ایک تیز رفتار بلٹ پروف گاڑی دی جائے اور اس کے علاوہ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں پانچ کروڑ کی رقم بھی فراہم کی جائے، ان کا کہنا تھا کہ مطالبات منظور ہوتے ہی وہ صرف چند طلبا کو بطور ضامن یرغمال بنا کر لے جائیں گے اور محفوظ مقام پر چھوڑ دیں گے۔" انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر ان کا مطالبہ نہ مانا گیا تو وہ ہر آدھے گھنٹے بعد ایک اسٹوڈنٹ کو گولی ماردیں گے اور آدھے گھنٹے کا وقت پورا ہونے میں چند منٹ تھے۔

کمانڈوز آپریشن بھی ناممکن تھا، ایسا کرنے کی صورت میں دہشت گرد طلباو طالبات کا قتل عام شروع کردیتے، ان کی معلومات کے مطابق دہشت گرد کثیر تعداد میں اور جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے، کرنل آفریدی افسران اعلیٰ کے پاس گیا۔ جو ایک طرف فکرمند کھڑے تھے۔ "سر اگر آپ اجازت دے دیں تو میں یونیورسٹی میں گھس کر اسٹوڈنٹس کو بچانے کی کوشش کروں۔"

"آفریدی تمہارا دماغ تو درست ہے تمہارے مداخلت سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان پہنچے گا، ہم نے جائزہ لیا ہے کہ یونیورسٹی کے تمام داخلی راستوں پر دہشت گرد موجود ہیں۔" ایک افسر نے کہا اور آفریدی مایوس ہو کر اپنے ساتھیوں کے قریب لوٹ آیا۔

اسی وقت فائر کی آواز سنائی دی اور باہر موجود افراد میں بھگدڑ مچ گئی اسی وقت یونیورسٹی کی چھت سے ایک لاش پھینکی گئی، پولیس کمانڈوز آگے بڑھے یہ ایک ہینڈسم نوجوان تھا جو دہشت گردوں کا پہلا نشانہ تھا۔

اسی وقت میگا فون پر راجیش کی آواز ابھری۔ "ہم حکومت کو خبردار کرتے ہیں اگر آدھے گھنٹے تک ہمارے مطالبات نہ مانے گئے تو اس بار ہم دو اسٹوڈنٹس کو گولی مار دیں گے۔"

نوید کے چہرے کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ اس کا بھائی بھی دہشت گردوں کے نرغے میں تھا۔ "یار آفریدی میرے بھائی کو بچاؤ۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"گھبراؤ مت، انشاء اللہ اسے کچھ نہیں ہوگا اور یہاں تو سیکڑوں انسانی زندگیوں کا سوال ہے، اب ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔" کرنل آفریدی نے کہا۔

"مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟" اس کے ایک ساتھی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں اس یونیورسٹی میں پڑھ چکا ہوں اور اندر جانے کا ایک خفیہ راستہ جانتا ہوں، ایک متروک گٹر لائن ہے جو یونیورسٹی سے کچھ فاصلے پر ہے۔" کرنل آفریدی نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اس متروک گٹر لائن کے قریب کھڑے تھے یہ یونیورسٹی سے خاصے فاصلے پر جھاڑیوں کی آڑ میں تھی۔ کرنل آفریدی کا ایک ساتھی اس کی گاڑی سے بیگ اٹھا لایا تھا۔ وہ جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے اندر پہنچے، مین ہول کا ڈھکن غائب تھا۔ کرنل آفریدی نے جائزہ لیا، یہ کافی بڑے پائپ تھے جن میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ مین ہول میں اتر گئے، اور بیگ سے رائفلیں نکال کر ہاتھ میں لے لیں، اندر سخت بدبو اور سیلن تھی۔

کرنل آفریدی آگے چل رہا تھا کافی دیر بعد وہ بائیں سمت مڑا اور آگے بڑھنے لگا، ایک جگہ پہنچ کر کرنل رکا، یہاں مین ہول کا ڈھکن نظر آرہا تھا، ایک طرف لوہے کی سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں وہ اوپر چڑھا اور ہلکا سا ڈھکن اٹھایا ان سے کچھ فاصلے پر ایک رائفل بردار شخص کھڑا تھا ان کی طرف اس کی پشت تھی، کرنل نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا، ڈھکن آہستگی سے اٹھا کر باہر نکلا اور بلی کی سی چال چلتا ہوا رائفل بردار کی پشت پر جا پہنچا۔ چشم زدن میں اس کے منہ پر ایک ہاتھ جمایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی شہ رگ پر خنجر پھیر دیا۔ رائفل بردار تڑپا لیکن جب تک اس کا وجود ساکت نہ ہوگیا اس نے اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

نوید اور اس کے دوسرے ساتھی بھی مین ہول سے باہر آچکے تھے۔ انہوں نے لاش گٹر میں پھینکی اور دیوار کے ساتھ کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھے، ان سے کچھ فاصلے پر دو رائفل بردار آپس میں باتیں کررہے تھے۔ "کوئی بھی گولی نہیں چلائے گا۔" کرنل نے سرگوشی کی اور نوید کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرالنگ کرتے ہوئے مسلح افراد کے قریب پہنچے اور چیتے کی طرح اچھلے کرنل آفریدی کا خنجر ایک رائفل بردار کے عین دل کے مقام پر پیوست ہوگیا۔ جبکہ نوید دوسرے رائفل بردار کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے دوسرے ہاتھ سے مخصوص انداز سے جھٹکا دے کر اس کی گردن کی ہڈی توڑ چکا تھا۔

اچانک پے در پے دو فائر ہوئے، وہ سمجھ گئے دہشت گردوں کا دیا ہوا وقت ختم ہوچکا ہے۔ انہوں نے دو مزید اسٹوڈنٹ قتل کردیئے تھے۔ قدرے توقف کے بعد راجیش کی آواز سنائی دی۔ "اب بھی اگر ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو اس بار آدھے گھنٹے بعد ہم چار اسٹوڈنٹ کو گولی ماردیں گے۔"

کچھ دیر بعد پولیس کی طرف سے اعلان کیا گیا۔

"میں DIG پولیس بات کررہا ہوں حکومت نے سیکڑوں طالب علموں کی جان بچانے کے لئے تمہارے مطالبات ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہمیں کچھ وقت چاہیے۔"

"ہم تم لوگوں کو ایک گھنٹے کا وقت دیتے ہیں اس کے بعد مزید وقت نہیں دیا جائے گا۔" راجیش کی آواز گونجی اور خاموشی چھا گئی۔

کرنل اور دیگر لوگ احاطے میں کافی آگے آچکے تھے اب فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ "تم سب ادھر ادھر پوزیشن سنبھال لو، میں آگے جارہا ہوں، تم لوگ بیس پچیس منٹ بعد دھاوا بول دینا۔" کرنل نے ہدایت کی۔

"لیکن یار آفریدی یہ دہشت گرد تعداد میں زیادہ ہیں تمہارا اکیلا جانا خطرناک ثابت ہوگا۔" نوید نے اسے سمجھانا چاہا۔

"نوید اگر ہم سب ساتھ آگے بڑھے تو نظر میں آجائیں گے جبکہ میں اکیلا کسی نہ کسی طرح اندر پہنچ کر راجیش یا سیٹھ ساجد میں سے کسی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ہتھیار پھینکنے پر مجبور کردوں گا۔ اس کے علاوہ تم لوگ ایک بات سے واقف نہیں، میں نے لباس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہے۔" کرنل آفریدی نے کہا۔

"نہیں میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا، دوست مجھے تمہاری ضرورت ہے، اپنے بھائی کی زندگی بچانے کے لئے اپنے دوست کی قربانی نہیں دے سکتا۔" نوید ضدی لہجے میں بولا۔

"نوید وقت بہت کم ہے تمہیں میری دوستی کی قسم ضد مت کرو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے قدموں پر چلتا ہوا تمہارے ساتھ اس یونیورسٹی سے باہر جاؤں گا۔" کرنل نے کہا۔

نوید اس کی دی ہوئی قسم کے آگے مجبور ہوگیا۔ رہ گئے کرنل آفریدی کے ساتھی تو وہ اسے روکنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے وہ جانتے تھے کہ آرمی کے ڈسپلن میں کمانڈر کا حکم بلا چوں چرا مانا جاتا ہے۔ وہ ان کا کمانڈر تھا۔ جسے لوگ سپر ماسٹر کے نام سے پکارتے تھے۔ اور بہت سے اسے سپر ہیرو کا نام دیتے تھے، وہ سیکڑوں طالب علموں کی زندگی بچانے جارہا تھا اور اس کے پاس وقت کم تھا۔

وہ مختلف جگہوں پر مورچہ زن ہوگئے۔ جبکہ کرنل آفریدی کرالنگ کرتا ہوا ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگے، ادھر کرنل آفریدی کرالنگ کرتا ہوا یونیورسٹی کی عمارت تک پہنچ چکا تھا۔ اعصاب شکن مرحلہ آچکا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ راجیش کے دیئے ہوئے وقت میں سے صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ چند لمحے اپنی جگہ پر رکا رہا۔

عمارت کے داخلی دروازے پر دو رائفل بردار کھڑے تھے۔

اچانک ان میں سے ایک کی نظر کرنل آفریدی پر پڑی تو اس نے ٹریگر دبادیا۔ ایک گولی زناٹے کی آواز کے ساتھ کرنل آفریدی کے کان کے قریب سے گزری۔ کرنل آفریدی اپنی رائفل کو برسٹ موڈ پر کرچکا تھا اس نے چھلانگ لگائی اور رائفل کو نیم دائرے میں گھماتے ہوئے ٹریگر دبادیا تڑتڑاہٹ کی آوازوں کے ساتھ گولیوں کا برسٹ ان دونوں کو چھلنی کرگیا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کوریڈور میں دوڑنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ فائرنگ کی آواز دور دور تک سنی جاچکی ہوگی۔

راجیش سیٹھ ساجد اور ان کے کارندے چوکنے ہوچکے ہوں گے اب اس کے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اسی وقت ایک کلاس روم کا دروازہ کھلا اور دو رائفل بردار باہر نکلے، اس نے رائفل کو پہلے ہی سنگل موڈ پر کرلیا تھا۔ کرنل آفریدی نے پے درپے دو فائر کیے، اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ ایک گولی ایک رائفل بردار کی کنپٹی میں لگی اور دوسری گولی دوسرے کے سینے میں عین دل کے مقام میں پیوست ہوگئی۔ اس وقت ایک دوسرے کلاس روم کا دروازہ کھلا اور ایک رائفل بردار نے باہر آتے ہی فائر کردیا۔ گولی کرنل کے شانے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ کرنل اب کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اچانک اوپر سے اس پر فائر کی گئی، گولی کرنل کے قریب سے گزری اس نے جوابی فائر کیا اور اوپری سیڑھیوں پر کھڑا رائفل بردار لڑھکتا ہوا اس کے قدموں میں آگرا گولی اس کے پہلو میں لگی تھی۔

"راجیش نے اسٹوڈنٹ کو کہاں یرغمال بنا رکھا ہے؟" کرنل نے زخمی کی کنپٹی سے رائفل کی نال لگاتے ہوئے پوچھا۔

"انہوں نے سیکنڈ فلور کے ہال میں اسٹوڈنٹ کو یرغمال بنا رکھا ہے۔" زخمی نے سسکتے ہوئے جواب دیا اور کرنل نے گولی چلادی۔

اب کرنل وہ دوڑتا ہوا سیکنڈ فلور پر پہنچ چکا تھا۔ کرنل اس یونیورسٹی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ ہال کی طرف بڑھا، اچانک اس کی نظر ہال کے دروازے پر کھڑے رائفل بردار پر پڑی اس نے ٹریگر دبانا چاہا مگر رائفل بردار اس سے پہلے ہی گولی چلاچکا تھا جو کرنل کے سینے میں لگی وہ چیختا ہوا گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ رائفل بردار محتاط انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس کا جسم ساکت تھا، اور سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ رائفل بردار نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور ہال میں داخل ہوگیا۔

وسیع وعریض ہال میں طالب علم سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ راجیش سیٹھ ساجد اور کاشان ایک طرف کھڑے تھے جبکہ نصف درجن رائفل بردار رائفلیں اٹھائے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

"مہاراج یہ مرچکا ہے۔" رائفل بردار نے ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور راجیش کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا وہ دیکھ چکا تھا کہ رائفل بردار کے کندھے پر موجود ساکت وجود کرنل آفریدی کا ہے۔

"سپر ماسٹر، سپر ہیرو بیچارہ اپنے ہم وطنوں کو بچانے آیا تھا اور خود کیچوے کی طرح کچلا جاچکا ہے۔ اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دو۔" راجیش نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

رائفل بردار کرنل آفریدی کو کندھے پر اٹھائے بے فکری سے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود رائفل پر اس کی گرفت ڈھیلی تھی۔

اچانک ان کی نظروں کے سامنے بجلی سی چمکی اور کرنل آفریدی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اس نے برقی سرعت سے پیچھے گرتے ہوئے رائفل بردار سے رائفل چھین لی اور اس شخص کو سینے سے چپکائے ہوئے ٹریگر دبادیا، ریوالور کے ساتھ موجود رائفل بردار اس کی رائفل سے نکلنے والے برسٹ سے چھلنی ہوگئے۔

راجیش اور سیٹھ ساجد نے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر فائر کیا تو گولیاں اس کے سینے سے لگے شخص کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔

کرنل آفریدی کا دایاں بازو سانپ کی طرح اس شخص کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔ کرنل آفریدی نے اپنی ڈھال

بنے شخص کے مردہ ہوتے ہی اسے ایک طرف پھینکا اور راجیش، سیٹھ ساجد اور کاشان کی ٹانگوں پر پے درپے فائر کیے، بلاشبہ اس کا نشانہ بے مثال تھا وہ تینوں چیختے ہوئے گرے۔

لڑکیاں اس قتل عام اور گولیوں کی برسات سے خوفزدہ ہوکر چیخ رہی تھیں۔ جبکہ لڑکے اور ٹیچرز فرش پر لیٹے خوف سے لرز رہے تھے۔ راجیش ٹانگوں پر گولیاں لگنے کے باوجود بھی فائر کرچکا تھا۔ گولی کرنل آفریدی کے دائیں پہلو میں لگی، اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دہکتی ہوئی سلاخ اس کے جسم میں اتر گئی ہو۔ وہ واقعی آئرن مین تھا۔ فولادی اعصاب کا مالک، جسم پر دو گولیاں لگنے کے باوجود بنا چیخے چلائے اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اس نے پے درپے کئی فائر کیے، گولیاں راجیش کے سر اور جسم کے مختلف مقامات پر لگیں اور وہ جہنم رسید ہوگیا۔

"سیٹھ ساجد اور کاشان کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ تمہیں بھی راجیش کے پاس بھیج دوں گا۔" وہ سفاک لہجے میں بولا اور وہ دونوں باپ بیٹا کراہتے ہوئے ایک طرف پڑے رہے۔ وہ شاید ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کرچکے تھے۔

وسیم کرنل آفریدی کو دیکھ چکا تھا لیکن خوفزدہ ہونے کے باعث اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ "وسیم تم تمام اسٹوڈنٹ اور ٹیچرز کے ساتھ یہاں سے باہر نکلو۔" اس نے حکم دیا اور وہ سب ہال سے باہر نکلنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں ہال اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز سے خالی ہوچکا تھا۔ ادھر پے درپے فائرنگ کی آوازوں سے نوید اور کرنل آفریدی کے ساتھی بے چین تھے، انہوں نے پندرہ منٹ بعد ہی ایکشن میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنی جگہوں سے اٹھے اور دیوانوں کی طرح یونیورسٹی کی عمارت کی طرف بھاگنے لگے۔

اچانک ایک ستون کی آڑ سے ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ آگے بھاگنے والے کرنل آفریدی کے تین ساتھی گولیوں سے چھلنی ہوکر گرے، نوید اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے فائرنگ کی، ستون کی آڑ میں چھپے دونوں رائفل بردار گولیوں سے چھلنی ہوکر گرے پڑے۔

وہ کوریڈور میں داخل ہوچکے تھے، دہشت گردوں کی لاشوں کو پھلانگتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے ہی تھے کہ بہت سے افراد کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ وہ پوزیشن لے کر کھڑے ہوگئے مگر یہ یونیورسٹی کے طلبا وطالبات اور ٹیچرز تھے، ان میں وسیم بھی تھا۔ وہ نوید کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گیا۔ "بھائی کرنل آفریدی کو گولیاں لگی ہیں۔" وہ نم لہجے میں بولا تو نوید اور کرنل آفریدی کے ساتھی تڑپ اٹھے۔

"تم لوگ یونیورسٹی سے باہر نکلو۔" نوید نے کہا اور کرنل آفریدی کے زندہ بچ جانے والے چار ساتھیوں سمیت ہال میں پہنچا جہاں خون میں لت پت کرنل آفریدی تن کر کھڑا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی۔ جابجا راجیش اور اس کے ساتھیوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں پڑی تھیں۔ ایک طرف سیٹھ ساجد اور کاشان زخمی پڑے تھے۔ "تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کہ تمہارے جسم پر بلٹ پروف جیکٹ موجود ہے۔" نوید نے کہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

"اوہ! یار کیوں! بیوی کی طرح آنسو بہارہے ہو، تمہارا دوست سپر ماسٹر ہے یہ معمولی گولیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس سے پہلے کہ پولیس آکر ان دونوں باپ بیٹے کو گرفتار کرلے ان سے اپنا حساب صاف کرلو۔" کرنل آفریدی نے کہا۔

"لیکن تم شدید زخمی ہو اور تمہارا خون مسلسل بہہ رہا ہے۔" نوید تڑپ کر بولا۔

"میری فکر مت کرو، چند منٹ کی بات ہے پھر وعدے کے مطابق صحیح سلامت اپنی ٹانگوں پر چلتا ہوا یہاں سے باہر نکلوں گا۔" کرنل آفریدی بولا اور اس کے اشارے پر کرنل آفریدی کے ساتھی سیٹھ ساجد اور کاشان کو گھسیٹتے ہوئے اس عمارت کے فورتھ فلور پر لے گئے۔ "چلو سیٹھ ساجد اور کاشان چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلو ورنہ تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گا۔" نوید ہاتھ میں خنجر لئے ان کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ دونوں باپ بیٹے گھسٹتے ہوئے منڈیر تک پہنچے۔ نوید نے ان کے قریب پہنچ کر خنجر والا ہاتھ لہرایا۔ سیٹھ ساجد زخمی ہونے کے باوجود گھسیٹ کر منڈیر پر چڑھ چکا تھا۔ نوید نے دوبارہ خنجر والا ہاتھ اس کی طرف کرکے

لہرایا۔ وہ خوف زدہ ہو کر چیختا ہوا چار منزلہ عمارت سے نیچے کود گیا۔ ”اب تمہاری باری ہے کاشان۔“ نوید نے اسے منڈیر کی طرف دھکیلا وہ منڈیر سے ٹکرا کر گر پڑا، نوید نے اسے اٹھا کر بازوؤں پر بلند کیا، کاشان چیختے ہوئے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ نوید نے اسے سر سے بلند کر کے چار منزلہ عمارت سے نیچے پھینک دیا۔ پھر انہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا دونوں باپ بیٹے کی خونچکاں لاشیں دیدۂ عبرت بنی ہوئی تھیں۔

پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار اندر آچکے تھے، میڈیا کے افراد بھی موجود تھے۔ لائیو ٹیلی کاسٹ ملک بھر کے سیکڑوں ٹی وی چینل پر دکھایا جارہا تھا۔ کرنل آفریدی اپنے قدموں پر چلتا ہوا یونیورسٹی سے باہر نکلا، نوید نے اسے زبردستی اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں سوار کرادیا۔ شرجیل اور نوید پیچھے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

”سنو نوید تمام انسانوں کی زندگی کی کہانی اوپر والے نے لکھی ہے اور اس کہانی کا انجام ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا، مجھے کچھ ہو جائے تو اداس مت ہونا۔ میں ہر وقت ہر لحہ تمہارے پاس ہوں گا۔ مجھے گلاب کے پھولوں میں ڈھونڈنا، روشن چاند میں دیکھنا، میں وہاں بھی تمہیں نظر آؤں گا۔ میری ماں کہا کرتی تھی جب کوئی مر جاتا ہے تو وہ تارہ بن جاتا ہے، تم آسمان پر روشن ستاروں کو دیکھنا جو سب سے روشن ستارہ ہوگا۔ وہ میں ہوں گا۔“

وہ واقعی فولاد تھا نارمل لہجے میں بات کر رہا تھا حالاں کہ اس کے جسم سے اچھا خاصا خون بہہ چکا تھا۔

”اب اگر تم نے بکواس کی تو تمہارا منہ توڑ دوں گا۔“ نوید روتے ہوئے بولا اور کرنل آفریدی مسکرا دیا۔ اس کے ذہن پر اب دھند چھاتی جارہی تھی۔ ایمبولینس اسپتال پہنچ چکی تھی اسے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کردیا گیا۔ میڈیا بار بار کرنل آفریدی کے بارے میں بتا رہا تھا، اسے سپر ہیرو کا نام دیا جارہا تھا۔ جس نے سینکڑوں انسانی زندگیاں بچائی تھیں اسپتال کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ یہ یونیورسٹی کے وہ اسٹوڈنٹ تھے جن کی زندگیاں اس نے بچائی تھیں ان کے والدین، بہن بھائی تھے، ٹیچرز تھے، مختلف قوموں کے وہ لوگ تھے جن کے وہ کام آتا رہا تھا۔

نوید اور کرنل کے ساتھی آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آیا۔ ”آپ میں سے نوید کون ہے؟ اسے کرنل آفریدی بلا رہے ہیں، جلدی کریں، وقت کم ہے۔“ ڈاکٹر کے ساتھ نوید آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا، کرنل آفریدی نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ”دوست مم...... مجھے...... امی...... ابو...... بلا رہے ہیں...... وہ...... دیکھو میرے سامنے سیمرا...... کھڑی ہے۔“ اس نے اٹکتے ہوئے کہا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

نوید دھاڑیں مار کر اس سے لپٹا ہوا رو رہا تھا، اس کا دوست اس کا محسن، سپر ہیرو، سپر ماسٹر اسے چھوڑ کر جاچکا تھا۔ اس کے جنازے میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ موجود تھے۔ جو رو رہے تھے۔ نوید نے اس کا آخری دیدار کیا تو اسے ایسا لگا جیسے کرنل آفریدی سو رہا ہو۔ اسے لحد میں اتارتے وقت وہ شدت غم سے بے ہوش ہوگیا۔

بعد میں نادیہ اور نوید کی شادی سادگی سے ہوئی، شادی کے کچھ روز بعد نوید گھر کے لان میں اداس کھڑا تھا کہ نادیہ اس کے قریب آئی۔ ”کیوں اداس ہو؟ کرنل آفریدی کی یاد آرہی ہے ناں، وہ دیکھو سامنے گلاب کے پھولوں کے پاس تمہارا دوست موجود ہے۔“

نوید نے بے اختیار اس طرف دیکھا تو واقعی وہاں کرنل آفریدی کھڑا تھا، اس کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے ایک خوب صورت لڑکی بھی تھی، کرنل آفریدی اور لڑکی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور غائب ہوگئے۔

نوید نے ایک سرد آہ بھری، اس کا دوست مرنے کے بعد وعدے کے مطابق اس سے ملنے آیا تھا، پھر نوید نے آسمان کی طرف دیکھا، اسے آسمان پر ایک روشن چمکتا ستارہ دکھائی دیا تو نوید کو ایسا لگا کہ جیسے واقعی وہاں کرنل آفریدی موجود ہے۔